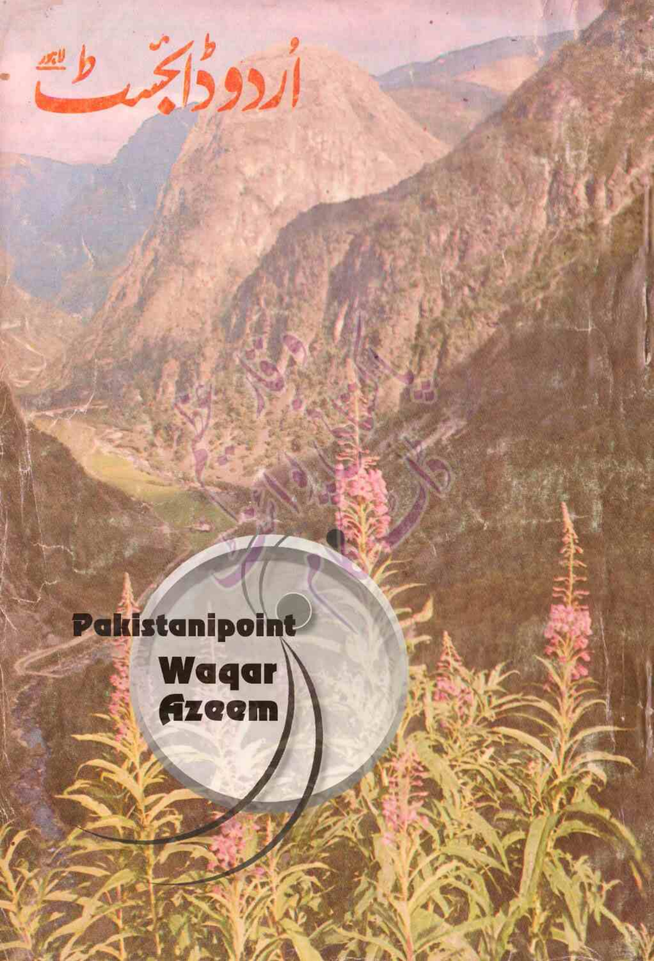

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

اُردو کا سب سے پہلا، ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ

اُردو ڈائجسٹ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ——— مدیر انتظامی

الطاف حسن قریشی ——— مدیر مسئول

ظفر اللہ خاں ——— مدیر

قیمت ۱۰ روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: ۱۱۰ روپے

بدلِ اشتراک کا ڈرافٹ اُردو ڈائجسٹ کے نام لاہور کے کسی بنک کی معرفت ہونا چاہیے۔

■ کراچی آفس

۲/۱۳۲/۵ ماڈل کالونی کراچی۔ فون ۴۰۲۱۳۵

■ راولپنڈی اسلام آباد

۱۳۰۔ بی سیٹلائٹ ٹاؤن مری روڈ راولپنڈی۔ فون ۸۴۵۰۷۷

جلد ۲۵ ——— شمارہ ۶

رمضان المبارک/شوال ۱۴۰۵ھ ——— جون ۱۹۸۵ء

کچھ اپنی زبان میں
○ مارشل لا اُٹھنے سے پہلے ______ الطاف حسن قریشی ۱۵

ہم کہاں کھڑے ہیں
○ بجٹ کی لوڈ شیڈنگ ___ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ
کی اصل کہانی کیا ہے اور اس کے مُجرم کون ہیں ___ الطاف حسن قریشی ۱۷

اِسلامی زندگی
○ فرقانِ عظیم ______ ۱۲
○ فرمانِ رسُول صلے اللہ علیہ وسلم ______ ۱۳
روزے کے رُوح پرور اثرات ______ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۴۵

مُہرہ جو پِٹ گیا

چھوٹی حقیقتوں کا ایک بڑا زندہ افسانہ جس میں ہمارے معاشرے کی ٹوٹتی
اور اُبھرتی قدروں کا ایک سحر چھایا ہُوا ہے ______ الطاف فاطمہ ۸۱

بزرگانِ دین
○ خواجہ گیسُو درازؒ ___ سندھ سے ہردوار اور شمالی ہند سے دکن تک قرآن
وسُنّت کا نُور پھیلانے والی صاحبِ دل شخصیت ______ رحمان مُذنب ۱۹۳

تاریخی ناول
○ مُعظّم علی ___ جناب نسیم حجازی کا ایک عظیم اسلامی ناول جو ایک طرح سے بنگال،
اَوَدھ اور میسُور کی تاریخ ہے ______ تلخیص: ڈاکٹر حسن اختر ۳۴

طبّ وصحت
○ جوڑوں کا درد ___ سائنٹیفک معلومات، سائنٹیفک ہدایات ___ طبّ
کی دُنیا میں تہلکہ بپا کر دینے والی کتاب کی تلخیص ___ قسط ۲ ___ مُحسن فارانی ۵۵

آپ بیتی
○ بھُولی بسری یادیں ___ گورے فوجیوں اور فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس
منڈلانے والے پُرمزاح اور پُراسرار واقعات ___ غلام الثّقلین نقوی ۱۱۲

عالمِ اسلام کی لہریں

مراکش کا انتہائی خوبصورت سفرنامہ جس میں ایک اسلامی کانفرنس کی رُوداد
بھی ہے اور دُنیائے اسلام جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہے،
اُن کا احاطہ بھی ______ مولانا وحید الدین خاں ۱۵۱

سائنسی انکشافات
○ خلائی عجائبات ___ انسان کے مستقبل کا دارو مدار اب خلا میں ہونے
والے حیرت انگیز تجربات پر ہے ______ تنویر قیصر شاہد ۱۶۸

خدا کا کرشمہ

ایک باہمت آسٹریلوی خاتون کے ناقابلِ شکست جذبے کی سچّی کہانی جو
موت کے خُونیں سایوں میں تخلیق ہُوئی ___ جونی ایرکسن / ترجمہ: س م سلیمان ۹۷

تاریخ کے دریچے سے
○ برکت والی دَونی ___ تاریخِ مُغلیہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ___ اُمِ اعزاز ۱۴۳

نفسیات
○ بچّوں کی صحت مند نشوونما ______ خلیق تبسم ۱۸۸

عظیم کہانی
○ سخی ناتھن ___ اطالوی زبان کا ایک شاہکار ادب پارہ جو ہمیشہ زندہ
رہے گا ______ گیوانی بوکیشیو / ترجمہ: ستار طاہر ۴۹

ہمارے مشاہیر
○ سر سیّد کی اَن کہی داستان ___ شیخ عبداللہ علیگ کے انتہائی دلچسپ ذاتی مشاہدات
______ تلخیص: عبدالمجید قریشی ۱۷۷

تازہ افسانہ
○ بگولا ـ معاشرتی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والی ایک دلگداز چیخ ـ طاہر نقوی ۱۶۱

عظیم سرگزشت
○ یاسر عرفات کی سچّی کہانی ___ ایلن ہارٹ کی شہرۂ آفاق کتاب "عرفات ـ اے
پیس میکر آر ٹیررسٹ ؟" کی تلخیص ___ قسط ۵ ______ ۶۹

جیتا جاگتا کردار
○ چاچا سلطان ___ سادگی اور قناعت میں اللہ سے لَو لگانے والا سچّا
کردار ______ محمّد اکرم رانجھا ۱۳۱

رُوسی افواج میں مُسلمانوں کی بڑھتی ہُوئی طاقت

مُستند اعداد و شمار اور سوویت یونین کی سرکاری دستاویزات سے اخذ
شُدہ پروفیسر ولیم فائر مین کے حیرت انگیز انکشافات ______ ۲۲۵

دُوسری جنگِ عظیم
○ ایک خطرناک فوجی مشن ___ ایک برطانوی افسر کے ساتھ پیش آنے والا
ناقابلِ فراموش واقعہ ______ ڈی ڈبلیو ڈیوڈ / ترجمہ: مقبول ایچ خان ۱۴۷

سُراغ رسانی
○ میٹاریز سرکل ___ رابرٹ لُڈلم کی ہر لمحہ نئی ڈرامائی کیفیت سے گزرنے
والی سلسلے وار پُراسرار کہانی ______ تلخیص: غ ث ن ۲۰۶

حیرت انگیز
○ ایک بدویہ کی غیر معمولی ذہانت ______ عبدالرزّاق کوثر ۱۹۱

تعارفِ کُتب
○ جینٹلمین بسم اللہ، جینٹلمین الحمدللہ ______ ڈاکٹر اقتدار احسن ۱۳۸

قارئین کے خطوط
○ چمنِ خیال ___ فکر و اظہار کا گلدستہ ______ ۸

Pakistanipoint Waqar Azeem

ایڈیٹر کا مُراسلہ نگار کی رائے سے مُتفق ہونا ضروری نہیں۔

جہانِ حال

آج کے نازک ترین مسائل

اُردو ڈائجسٹ کے تازہ شمارے میں پاکستان کی صورتِ حال پر مضمون بڑی توجہ سے پڑھا جو بصیرت افروز اور حقیقت پسندانہ تجزیے کا حامل ہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم اشخاص، بشمول قومی پریس کو جو نصیحتیں کی ہیں اور جس طرح قوم کو موجودہ اور آنے والے خطرات سے خبردار کیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ کاش! ہمارے چار بڑے قومی اخباران مفید مشوروں پر عمل پیرا ہوں۔ آدھی 'بیماری' تو اسی نسخے کے استعمال سے دُور ہو جائے گی! خدا جانے کتنے سیاستدانوں اور قومی اور صوبائی ایوانوں کے اراکین تک آپ کی آواز پہنچتی ہے۔

(خواجہ غفور احمد۔ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

شمارہ مئی ۸۵ء میں الطاف حسن قریشی کا تجزیہ 'آج کے نازک ترین مسائل' پڑھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ اس میں لگی لپٹی رکھے بغیر نازک حالاتِ حاضرہ کا فکر انگیز تجزیہ کیا گیا ہے۔

آئندہ سگریٹ کا اشتہار نہ شائع کرنے کا جو احسن قدم آپ نے اُٹھایا ہے اُس پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اُمید ہے اُن اشتہارات کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیں گے جن میں عورتوں کی اخلاق سوز تصویریں شائع ہوتی ہیں۔

(عبدالغفور ہزاروی۔ واہ چھاؤنی)

گلگت و بلتستان کا جہاد

کرنل مرزا حسن (مرحوم) فاتحِ گلگت کی سلسلہ وار سرگزشت پڑھ کر ہم اپنے مجاہدوں کو خراجِ عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چترال سکاؤٹس اور چترالی باڈی گارڈ کے بے سروسامان مجاہد اپنے زنگ آلود ہتھیاروں کے ذریعے چترال سے وادیٔ نیلم تک پیدل ہی جہاد کرتے رہے اور اُنہوں نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کر کے اسکردو فتح کیا۔ یہ سرگزشت نئی نسل کے لیے ولولہ انگیز معلومات فراہم کرتی ہے۔ فاتح اسکردو جناب شہزادہ متاع الملک، مہدویت کے دعویدار شہزادہ برہان الدین حال سینیٹر، جناب شہزادہ محی الدین ریٹائرڈ میجر حال ڈائریکٹر بلدیات ایبٹ آباد ڈویژن، مہتر جوانور الملک ریٹائرڈ ڈی ایس پی اور لیفٹیننٹ باڈی گارڈ سردار آمان شاہ جیسے مجاہد بفضلِ خدا بقیدِ حیات اور اس معرکے کے چشم دید گواہ ہیں۔

یہ پہلا موقع ہے کہ اُردو ڈائجسٹ جیسے باوقار جریدے میں چترالی برادری کی قربانیوں کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ مرزا حسن خان کے مکمل سوانحِ حیات کتابی شکل میں بھی شائع کیے جائیں۔ (اقبال نگین۔ مستوج، چترال)

دوست کی تلاش

بنگلہ دیش بننے کے بعد تباہیوں نے ایسا گھیرا کہ اور کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ اب ادھر کچھ مُدت سے اُردو ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان دنوں اپنے عزیز ترین ساتھی عبدالرؤف تاج الدین کی تلاش ہے۔ یہ کبھی رحمت اللہ ہائی اسکول ڈھاکہ میں طالب علم تھے۔ پھر کنسٹرکشن کمپنی میں انجینئر ہُوئے اور کراچی سے کسی خلیجی ملک گئے۔ اُردو ڈائجسٹ کے پُرانے پڑھاکو ہیں، یہ سطور پڑھ کر شاید وہ ہم سے رابطہ قائم کر سکیں۔

(یوسف ریاض۔ بلاستیک الوطنیہ ص ب ۵۵۴۰۔ الریاض ۱۱۴۴۳)

طلبہ کی مذموم حرکات

یکم اپریل کی رات دو بجے کا عمل تھا۔ مَیں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ لیاقت پور جانے کے لیے خان پور ریلوے اسٹیشن پر تیز رو کا انتظار کر رہا تھا جو اُس روز غیر معمولی تاخیر کا شکار ہو گئی تھی۔ اسی اثنا میں لاہور کی طرف سے ایک میل گاڑی ریلوے اسٹیشن پر آ کر رُکی۔ ایک بوگی سے جس پر مطالعاتی دورہ طلبہ ایم کام ہیلی کالج آف کامرس لاہور' کا بینر لگا تھا، دس بارہ نوجوان برآمد ہُوئے اور اُنہوں نے پلیٹ فارم پر ایک گھیرا باندھا اور مٹک مٹک کر تالیاں بجاتے ہُوئے ایک رُومانی گیت گانا شروع کر دیا۔ اُونگھتے ہُوئے مسافر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ریل کے ڈبوں کی کھڑکیوں سے خواتین جھانک رہی تھیں جنہیں دیکھ کر طلبہ کے مطالعاتی 'دورے' میں اور شدت آ گئی۔ خانپور جنکشن پر بیسیوں لوگ موجود تھے جو پڑھے لکھے لوگوں کی ادب و تہذیب سے عاری حرکات کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

کاش! تعلیمی اداروں کے مسلمان اور پاکستانی طلبہ کچھ اپنے منصب کی بھی لاج رکھّیں۔

(محمد اسلم۔ لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج، لیاقت پور)

ایک مہربان ڈاکٹر

۳ رمئی ۸۵ء کو سکوٹر سوار میرے حقیقی بھائی اور خالہ زاد بھائی ایک ویگن کی ٹکر سے شدید زخمی ہُوئے۔ ویگن ڈرائیور نے بس اتنی مہربانی کی کہ اُنہیں سروسز ہسپتال لے گیا۔ مَیں بعد میں ہسپتال پہنچا تو دونوں زخمی بیڈ پر نیم بے ہوش پڑے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ مضروبین کی چوٹیں معمولی ہیں ــــ ایک ایک انجیکشن لگا دیا ہے۔ آپ اُنہیں لے جا سکتے ہیں۔

مَیں نے خود ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ میرے حقیقی بھائی کی بائیں پنڈلی کی دونوں ہڈّیاں ٹُوٹ چکی ہیں اور خالہ زاد بھائی کے شانے کا جوڑ اُکھڑ گیا ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ صُورتِ حال بتائی تو اُنہوں نے بڑی رعونت سے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ زخمیوں کو میرے پاس لائیں۔ وہ زخمیوں کے بیڈ سے محض بیس فٹ پرے بیٹھے تھے مگر اُنہوں نے اُٹھ کر اُنہیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

مضروبین کو اسٹریچر پر ڈال کر قریب لایا گیا۔ سرسری دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایکسرے لینے کا حکم صادر کیا۔ تب اس پر طوعاً کرہاً عمل ہُوا لیکن اُن کی مرہم پٹی کا ہنوز کوئی بندوبست نہ کیا گیا۔ اس وقت زخمیوں کو ہسپتال آئے ہُوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ ناچار مَیں نے اُنہیں گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ لکھ کر دیں مَیں اپنی خوشی سے اُنہیں لے جا رہا ہُوں۔ مَیں نے دُکھ کے ساتھ لکھ دیا کہ ہسپتال کے عملے نے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ مَیں سوچتا ہُوں کہ اس تساہل آمیز رویّے کا جواز کیا ہے اور کتنے ہی میرے اہلِ وطن اس کا شکار ہوتے ہوں گے۔

(عبدالحمید صدّیقی خوشنویس، اُردو ڈائجسٹ، لاہور)

ٹی وی پر لچر پروگرام

۲۵ر اپریل رات پونے دس بجے 'رنگ ترنگ' میں قومی نشریاتی رابطے پر جو خرافات پیش کی گئیں، وہ اسلامی معاشرت کا مُنہ چڑانے کی مذموم حرکت تھی۔ بظاہر ایک ثقہ بزرگ کے گھر پاکستانی فلموں کے انداز میں شادی کی محفل کے مناظر دکھائے گئے۔ ایک طرف بال پھیلائے اور چہروں پر مفت کا سُرخی پوڈر جمائے گانے والیاں اپنے جسموں کو بے ہنگم انداز میں مٹکا رہی تھیں اور دوسری طرف اسی قبیل کے بگڑے نوجوان ڈسکو لُڈی اور ٹوسٹ کی بھونڈی نقلیں اُتار رہے تھے۔ حد یہ کہ سفید ریش سربراہِ خانہ

کو مجنونانہ انداز میں تالیاں پیٹتے دکھا کر اسلامی شعائر کا مذاق اُڑایا گیا۔ پروگرام کے دوسرے رُومانی دوگانے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پاکستانی فلموں کے لچرپن کی رہی سہی کسر اب ٹیلی ویژن پُوری کر رہا ہے۔

یہ امر بھی فوری توجّہ کا مستحق ہے کہ ملک میں توانائی کے شدید بحران کے پیشِ نظر ٹیلی ویژن نشریات کے اوقات میں نمایاں کمی کی جائے۔ بھلا وہ لوگ جو رات بارہ بجے تک ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے رہیں گے، صُبح سویرے اُٹھ کر اپنے روزانہ معمولات پُوری تندہی کے ساتھ کس طرح انجام دے سکیں گے؟ ـــــ اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ نوجوان نسل کو طویل نشریاتی تفریح کی افیون کا عادی بنا کر رکھ دیا جائے۔ ہماری تجویز ہے کہ ٹیلی ویژن نشریات رات دس بجے تک لازماً بند ہو جانی چاہییں اور ان کے روزانہ اوقات چار گھنٹے سے زیادہ نہ ہوں۔

(ریاض احمد، سیالکوٹ)

ایسا بھی ہوتا ہے

ہمارے کفیل کے پاس ایک غریب آدمی آیا جو آنکھوں سے محروم تھا۔ شاید وہ اُس کے جاننے والوں میں سے تھا۔ اُس نے ہمارے کفیل سے گاڑی اور ڈرائیور مانگا کیونکہ اُسے رُوئی (دارالحکومت) جانا تھا؛ چنانچہ میں اُس کے ساتھ گاڑی لے کر چلا گیا۔ راستے میں اُس نے کہا کہ وزارتِ صحت میں وزیر کے پاس جانا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ آدمی وزیر کے پاس کیسے پہنچ سکے گا۔ بہرحال انہی سوچوں میں وزارتِ صحت کے دفاتر پہنچ گئے۔ گاڑی پارک کی تو وہ بولا کہ میرا ہاتھ پکڑ لو اور مجھے وزیر کے دفتر میں لے چلو۔

میں نے کہا: "بابا! میں باہر کا آدمی ہُوں۔ مجھے کون جانے دے گا؟" اُس نے کہا کہ تم چلو، میں تمہارے ساتھ ہُوں۔ خیر میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے وزیر کے دفتر لے گیا اور اُس سے کہا: "سامنے وزیر کا کمرہ ہے تم چلے جاؤ، میں یہاں کھڑا ہوتا ہُوں۔ ہماری بات چیت سُن کر وزیر کا شاید سیکرٹری باہر آیا۔ اُس نے بابا سے بات چیت کی اور کہا کہ جو بھی مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ۔ بابا نے کہا کہ نہیں، میں وزیر ہی سے بات کروں گا۔ یہ باتیں وزیر صاحب کے کمرے کے سامنے ہو رہی تھیں اور شاید وزیر نے بھی سُن لیں۔ اُس نے اپنے قاصد سے کہا کہ اُسے اندر لے آؤ۔

معمولی سی تلاشی لینے کے بعد بابا کو اندر بھیج دیا گیا۔ میں باہر کھڑا تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد قاصد دوبارہ باہر آیا اور مجھے بھی اندر لے گیا۔ وہاں جا کر میں نے چائے پی اور بابا اور وزیر کی باتیں سُننے لگا۔

بابا کہہ رہا تھا: "میری آنکھیں نہیں ہیں۔ میں تین بار اسپتال گیا ہُوں اور ڈاکٹر سے کہا ہے کہ میرا علاج کرو لیکن اُس نے کوئی دوائی دے کر مجھے ٹرخا دیا ہے۔ کیا میری آنکھوں کا آپریشن نہیں ہو سکتا؟ کیا میں یہاں کا شہری نہیں ہُوں؟ کیا محض غریبی کی وجہ سے تم لوگ میرا علاج نہیں کرتے؟"

وزیر نے اسپتال کی رسیدیں دیکھیں اور بابا کو ایک رقعہ دیا اور کہا کل صبح بڑے ڈاکٹر کو جا کر دینا۔ رقعے میں اُس نے آپریشن کی ہدایت کی تھی اور پہلے واقعے کی انکوائری کے لیے بھی لکھا تھا۔

میں حیران تھا کہ یہاں وزیر سے ملنا کتنا آسان ہے!

(نصر اللہ خاں چیمہ، برکاء، مسقط)

انصاری کمیشن رپورٹ

ملک میں صوبوں کی تقسیمِ نو کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے انصاری کمیشن رپورٹ پر عمل درآمد نہایت ضروری ہے۔ اگر اسے مرکزی اسمبلی کی حمایت حاصل ہو گئی تو علحدگی پسند قوتوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اِس ضمن میں اُن سفارشات سے بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے جو آپ نے صوبوں کی تقسیمِ نو کے متعلق ۱۹۸۴ء کے ایک شمارے میں پیش کی تھیں۔ (محمود خاں، سعودی عرب)

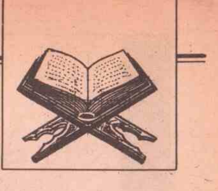

فُرقانِ عظیم

- اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصّہ بیان کرو بے شک وہ راستی باز انسان اور ایک نبی تھا۔
- (انہیں ذرا اُس موقع کی یاد دلاؤ) جبکہ اُس نے اپنے باپ سے کہا: "ابّا جان! آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ کوئی آپ کا کام بنا سکتی ہیں؟
- "ابّا جان! میرے پاس ایک ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں۔ مَیں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔
- "ابّا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں۔ شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔
- "ابّا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مُبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"
- باپ نے کہا: "ابراہیمؑ! کیا تُو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تُو باز نہ آیا تو مَیں تجھے سنگسار کر دُوں گا۔ بس تُو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔"
- ابراہیمؑ نے کہا: "سلام ہو آپ کو۔ مَیں اپنے رب سے دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔
- "مَیں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خُدا کو چھوڑ کر پُکارا کرتے ہیں۔ مَیں تو اپنے رب ہی کو پُکاروں گا۔ اُمّید ہے کہ مَیں اپنے رب کو پُکار کر نامُراد نہ رہوں گا۔"
- پس جب وہ اُن لوگوں سے اور اُن کے معبودانِ غیر اللہ سے جُدا ہو گیا تو ہم نے اُس کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور اُن کو اپنی رحمت سے نوازا اور اُن کو سچّی نام وری عطا کی۔

(سورۂ مریم: آیات ۴۱ تا ۴۹)

فرمانِ رسولؐ

- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ مَیں نے ابُوالقاسم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو فرماتے ہُوئے سُنا: "تم میں سے اسلام میں بہتر وہ ہے جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں جبکہ وہ (دین میں) سمجھ رکھتے ہیں۔" (الادب المفرد)
- حضرت ابو سعید انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت (صفیں سیدھی کرنے کے لیے) ہمارے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے: "برابر ہو جاؤ (صف بندی میں) انتشار و اختلاف نہ پیدا کرو، ورنہ تمہارے دلوں میں بھی پھُوٹ پڑ جائے گی۔ تم میں سے جو عقل و فہم والے ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں، پھر جو اُن سے قریب ہیں، پھر جو اُن سے قریب ہیں۔" (صیح مُسلم۔ مشکوٰۃ)
- حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ اور دوسری تمام نیکیوں کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا: "انسان یہ سب کچھ کرتا ہے مگر قیامت کے دن عقل و فہم کے مطابق ہی اُسے بدلہ ملے گا۔" (جس قدر شعُور اور عقل و فہم کے ساتھ وہ نیکیاں کرے گا، روزِ قیامت اُسی قدر اُن کے فوائد سے فیضیاب ہو گا۔) (مشکوٰۃ)
- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مَیں نے آپؐ کو فرماتے ہُوئے سُنا: "کھانا سامنے آگیا ہو تو پھر نماز نہیں ہے اور نہ اس حال میں کہ جب آدمی کو پیشاب پاخانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔" (مسلم۔ مشکوٰۃ)
- ابو سعید خُدریؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "صاحبِ حلم (بُردبار) وہی ہے جسے لغزشوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اور حکیم و دانا وہی ہے جو تجربہ بھی رکھتا ہو۔" (مشکوٰۃ)
- ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "طہارت و پاکیزگی ایمان کا نصف حصّہ ہے۔" (مُسلم۔ مشکوٰۃ)
- "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دایاں ہاتھ وضو اور کھانے پینے کے لیے استعمال فرماتے اور بائیں ہاتھ سے استنجا جیسے کاموں کو انجام دیتے۔" (مشکوٰۃ)
- حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہُوئے دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا: "عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔" اس کے بعد مَیں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا۔ (الترمذی۔ مشکوٰۃ)

مارشل لا اُٹھنے سے پہلے

اِس بارے میں اب شاید ہی دو رائیں پائی جاتی ہوں کہ نمائندہ سیاسی اِدارے اور سوِیلین حکومتوں کے قیام کے بعد مارشل لا کی بساط جلد سے جلد لپیٹ جانی چاہیے۔ اہلِ نظر یہی سمجھتے ہیں کہ مارشل لا کو طُول دینے سے قومی زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی چلی جائیں گی اور اُن قوّتوں کو تقویت ملے گی جو اس اِشو کو جذباتی رنگ دے کر عوام کے نمائندوں کو مارشل لا حکّام سے لڑا دینا چاہتے ہیں۔

مارشل لا کے آٹھ سال ختم ہونے کو ہیں۔ اُس کا دائرۂ اثر محدود ہوتا جا رہا ہے۔ سوِل اِدارے پہلے کے مقابلے ہیں، استحکام حاصل کر رہے ہیں۔ مارشل لا کے خاتمے کا ایک فطری عمل تیزی سے جاری ہے — مگر حالات کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھے بغیر، بے صبری، جلد بازی اور قوّت آزمانے کے مظاہرے فطری عمل میں رُکاوٹ بن سکتے ہیں۔ دانشمندی کا تقاضا یہ ہوگا کہ سارا زور مارشل لا کی بیخ کنی پر صرف کرنے کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ مارشل لا کا خاتمہ پُرامن طریقے سے کیونکر ممکن ہے اور اس کے ہٹ جانے کے بعد سوِیلین حکومتوں کو حقیقی استحکام کیسے مُیسّر آ سکے گا۔

جلد بازی میں بعض اوقات اچھے کام بھی خراب ہوجاتے ہیں۔ وہ قوم جو آٹھ سال مارشل لا کا بار اُٹھائے رہی، اپنے مفاد میں کچھ دیر اور اسے برداشت کر سکتی ہے۔ قومی سطح پر ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ جائزہ لیا جائے کہ آٹھ سال کی مارشل لا حکومت میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوچکی ہیں، اُنہیں ختم کرنے کا قانونی راستہ کیا ہوگا۔ اس ضمن میں قومی اسمبلی کو ایک

بل پاس کرنا ہوگا جس کی تیاری میں بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ عُجلت میں ایک ایسا بل بھی پاس ہوسکتا ہے جو آئندہ شہریوں کے لیے تہ در تہ مسائل پیدا کرنے کا باعث بن جائے۔

اسی طرح یہ پہلو بھی نہایت سنجیدہ غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے کہ مارشل لا کی طاقت ہٹنے سے ایک خلا پیدا ہوگا۔ اُسے، قومی تقاضوں کے مطابق، پُر کرنے کے لیے ایک معقول سبیل نکالنا ہوگی ورنہ سویلین حکومتوں پر قانون شکن عناصر کا دباؤ یک لخت شدید ہوجائے گا اور چوتھے مارشل لا کا جواز پیدا کرنے کی سر توڑ کوشش کی جائے گی جو وطنِ عزیز کو اپنی تاریخ کے سب سے ہولناک بُحران سے دوچار کردے گی۔

اور اہم ترین بات یہ ہے کہ مارشل لا کے رُخصت ہونے سے پہلے مستقل حکومتی اور سیاسی نظام تشکیل دینا ہوگا جو سیاسی جماعتوں کے صحت مند وجود کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اعلیٰ سیاسی اداروں میں ڈسپلن، اعلیٰ اقدار کے ساتھ وابستگی اور قومی سوچ کے فطری بہاؤ کے راستے مُنظّم اور مُستحکم سیاسی جماعتیں ہی ہموار کرتی ہیں۔

ہماری رائے میں قومی اسمبلی کو تمام چھوٹے بڑے مسائل سے ہٹ کر سب سے پہلے سیاسی شیرازہ بندی کے اُصول اور طریقِ کار طے کرلینے چاہییں۔ منتخب سیاسی اداروں میں بے مقصد اور مُنتشر جمعیّت قومی مفادات کو مارشل لا سے زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پانی کا مسئلہ، کراچی میں کرفیو کے گہرے سائے، سیاسی خلا میں مُعلق وفاقی بجٹ اور علاقائی وفاداریوں کے زہرناک تذکرے ایک خوفناک سیاسی بُحران کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کوئی اُلجھا ہُوا یا طویل راستہ اختیار کرنے کے بجائے جُرأت مندی اور بالغ نظری کے ساتھ، اُسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا جانا چاہیے جو فطری ہو، ہمارے تاریخی شعور سے ہم آہنگ ہو اور ہماری سیاسی زندگی میں استحکام پیدا کرنے والا ہو۔

اس فیصلے میں تاخیر جمہوری عمل کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے جو ناقابلِ تلافی بھی ہوگا اور ناقابلِ معافی بھی۔

الطاف حسن قریشی

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ

بجٹ کی لوڈشیڈنگ

- بجٹ پر چڑھی ہوئی چربی
- لوڈشیڈنگ کے اصل مُجرم
- پانی کی تقسیم کے حیرت انگیز گوشے

الطاف حسن قریشی کی ایکسرے رپورٹ

ڈاکٹر محبوب الحق، جو پہلی بار وزیرِ خزانہ بنے، ایک نئے انداز سے اقتصادی اُفق پر نمودار ہُوئے ہیں۔ اُنھوں نے بجٹ آنے سے ایک دو ماہ پہلے ہی ایک بُحران کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔ کبھی معاشی بدحالی کی ایک ایسی تصویر کھینچتے کہ برونائی میں جا بسنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ کبھی کاروں اور ایئرکنڈیشنروں کا اس درد اور سوز کے ساتھ مرثیہ پڑھتے کہ سانس کی آمد و رفت مدھم اور نڈھال ہونے لگتی۔ پھر اُنھوں نے دیہات اور شہروں کے الگ الگ راگ ایجاد فرمائے اور بجٹ کے اعتبار سے قوم کو سات آٹھ طبقات میں تقسیم کردیا اور مژدہ سُنایا کہ اس بار زندگی کی تمام آسائشیں شکنجے میں کس دی جائیں گی ـــ اقتصادی جہاد کا وقت آپہنچا ہے۔

خیر سے بجٹ آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پونے دو گھنٹے سہل زبان اور کسی قدر ادبی لہجے میں بجٹ تقریر فرمائی۔

اُن کی باتوں میں ایک ماہر طبیب کی سی پختگی اور ہمدردی تھی۔ کچھ کرنے کا عزم بھی ٹپکتا تھا۔ امراض کی تشخیص بہت اچھی تھی مگر جو نسخہ اُنھوں نے تجویز فرمایا، وہ فریبِ نظر بھی ہے اور خارِ نگاہ بھی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں سیاسی نظام ہنوز تشنۂ تکمیل ہو، وہاں اقتصادی مُہم جُوئی کے اچھے نتائج نکلنے کی بہت زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ جناب وزیرِ خزانہ نے بجٹ تجاویز کے لیے جو بیس فراہم کیا ہے، وہ بادی النظر میں بڑا کمزور اور غیر یقینی سا نظر آتا ہے ـــ اور اس وقت یہی حال سیاسی بیس کا ہے جسے مضبوط بنانے کے لیے وزیرِ اعظم شب و روز کام کر رہے ہیں۔ ڈر یہ ہے کہ بیک وقت دو بڑے تجربات اُن بنیادوں کو متزلزل ہی نہ کر ڈالیں جن پر معمولات کا ایک ڈھانچہ قائم ہے۔

نئے سال کا بجٹ اپنے دامن میں عوام کے لیے بہت کچھ لیے ہُوئے ہے۔ تعلیم اور صحّت کی بات اس بار ذرا زور سے ہُوئی ہے اور ان مدوں میں رقوم گزشتہ برس کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہیں۔ دیہات کی حالت بہتر بنانے کی تجاویز بجٹ میں شامل ہیں۔ اس پہلو پر بھی خاص طور سے زور دیا گیا ہے کہ حکومت کا کام اقتصادی اور معاشرتی سروس اور ڈھانچہ فراہم کرنا اور زندگی کی بُنیادی ضروریں عوام تک پہنچانا ہے۔ قلیل اور محدود آمدنی رکھنے والے سرکاری اور صنعتی ملازمین کو اچھّی خاصی مراعات دی گئی ہیں۔ ایک ایسا سسٹم وضع کر لیا گیا ہے جس کے مطابق مہنگائی کے تناسب سے تنخواہوں میں از خود اضافہ ہوتا رہے گا۔ پنشن کے ڈھانچے میں نہایت عمدہ اصلاحات نافذ کی گئی ہیں۔ بیواؤں کے لیے پنشن کی سہولتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ زکوٰۃ فنڈ سے معذوروں کی کفالت اور بے سہارا خاندانوں کی بحالی کے معقول انتظامات فراہم کیے گئے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹیکسوں کے موجودہ ڈھانچے میں جو تبدیلیاں تجویز کی گئی ہیں، اُن سے شہریوں کی تکالیف میں خاصی کمی واقع ہو جائے گی اور صنعت و تجارت میں ایمانداری سے ٹیکس ادا کرنے کا رجحان تقویت پائے گا۔ انکم ٹیکس جو بہت سے لوگوں کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں تھا، اُسے معقول اور آسان بنا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس کے افسر شہریوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں سے بھی روک دیے گئے ہیں۔ کارپوریٹ ٹیکس میں کمی آجانے سے یہ اُمّید کی جا سکتی ہے کہ پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کا نظام بڑی حد تک مستحکم ہو جائے گا۔

حکومت کا یہ فیصلہ بھی مستحسن ہے کہ صنعت اور تجارت کو غیر ضروری سرکاری ضابطوں اور کنٹرول سے آزاد کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا ہے جو چھ ماہ کے اندر اندر اپنی سفارشات پیش کرے گا۔ اگر سفارشات انقلابی جذبے سے کی گئیں اور وزیرِ خزانہ اُن پر عمل بھی کرا سکے تو ہماری قومی معیشت پر خوشگوار اثرات مرتّب ہوں گے اور فی الواقع ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے گا۔

اس امر میں شک و شُبے کی گنجائش بہت ہے کہ بیوروکریسی اپنے اختیارات سے دستبردار ہونے کے لیے آسانی سے آمادہ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر محبوب الحق اچھّی طرح جانتے ہیں کہ ضابطوں کا شکنجہ کس قدر سخت اور مضبوط ہے اور اسے توڑنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہو گا۔ سیاسی سطح پر کیے ہُوئے بڑے بڑے فیصلے جب سرکاری مشینری میں سے گزرتے ہیں تو اپنی آب و تاب کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے اور نافذ ہونے تک اُنہیں پہچان لینا دُشوار ہو جاتا ہے۔ اب ڈر یہی ہے کہ وزیرِ خزانہ پھیل بہت گئے ہیں اور محاذ اَن گنت کھُل گئے ہیں۔ ایسے میں بیوروکریسی اُنہیں خاصا پریشان کر سکتی ہے اور آزاد معیشت کے جو سُہانے خواب اُنہوں نے ایک عالم کو دکھائے ہیں وہ کہیں چکنا چُور نہ ہو جائیں۔

دراصل وہ اس اعتبار سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے حکومت کی خامیوں کا احاطہ کرنے میں کسی بُخل یا تاویل سے کام نہیں لیا۔ برملا کہا کہ ہمارا ٹیکس جمع کرنے کا نظام ناقص چلا آ رہا ہے جس کے نتیجے میں رشوت عام ہے اور پہلے درپردہ اور آجکل بے پردہ معاہدے ہو رہے ہیں، رقوم سرکاری اہل کاروں کی جیبوں میں جا رہی ہیں۔ اُنہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ شہری سرکاری اداروں کے معیار پر اعتماد نہیں کرتے۔ یہ بھی کہا کہ حکومت نے عوام کی خدمت کرنے کے بجائے تجارتی اور صنعتی کاروبار میں اپنی توانائیاں اور وسائل صرف کر دیے ہیں جبکہ یہ کام اُس کا ہے ہی نہیں۔ یہ اعتراف بھی سرکاری سطح پر پہلی بار ہُوا ہے کہ ہمارے ہاں ٹیکسوں کا نظام جابرانہ اور غیر منصفانہ رہا ہے جس نے ٹیکس چوری کرنے کا رُجحان عام کیا ہے۔ اس حقیقت

کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ سرکاری ضابطے جس قدر زیادہ ہوں گے، اسی قدر کرپشن میں اضافہ ہو گا۔

یہ تمام باتیں بیوروکریسی کے اختیارات کم یا ختم کرنے پر منتج ہوں گی، اس لیے ڈاکٹر محبوب الحق پر اُس کی طرف سے دباؤ بڑھتا جائے گا۔ اگرچہ اُنہوں نے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کر کے اُنہیں خوش کرنا چاہا ہے مگر اصل مسئلہ اختیارات اور اتھارٹی کا ہے جس سے دولت پیدا ہوتی ہے اور جس کے آگے بڑے بڑے اقتصادی آمر اور شہزادے جھک جاتے ہیں۔

ایک طبقۂ فکر نے ڈاکٹر محبوب الحق کے اس پہلے بجٹ کو عام آدمی کا بجٹ کہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بجٹ تقریر میں عوام کی بہبود کے حوالے ایک سے زیادہ بار آئے ہیں اور ترقّیاتی پروگرام میں عام آدمی کو بُنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بڑی رقمیں مختص کی گئی ہیں لیکن گراؤنڈ پر حقائق کی جلوہ آرائی کچھ اور ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں کا سارا بوجھ عام آدمی کی طرف منتقل ہو گا اور ہونے لگا ہے۔ پٹرول اور گیس کی قیمتیں بڑھ جانے اور ریلوے کے کرایوں میں یک لخت ۲۳ فی صد اضافہ ہو جانے سے اشیائے صرف کی قیمتوں کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گرانی میں اضافہ ۲۵ اور ۳۰ فی صد کے درمیان ہو گا۔ اور لوڈ شیڈنگ کے منفی اثرات اس کے علاوہ ہیں۔ درآمدات پر ۵ فی صد ڈیوٹی کا اضافہ اس کے سوا ہو گا۔ وہ بھاری رقوم جو سب سڈیز میں خرچ ہوں گی، اُن کا بار بھی عام شہری ہی کو برداشت کرنا ہو گا۔ ری رولنگ اسٹیل کا مسئلہ تو ایک ہفتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سینکڑوں کی تعداد میں فیکٹریاں احتجاجاً بند کر دی گئی ہیں۔ اس افراتفری اور اقتصادی بدنظمی کے منفی اثرات بالآخر عوام ہی کی طرف منتقل ہوں گے۔

مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ بظاہر ایک اچھّا قدم ہے مگر وہ بجٹ میں دی ہُوئی مراعات سے خوش نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف اُن کی اُجرتوں میں ۵ء۱۳ فی صد اضافے سے پیداواری لاگت میں اضافہ ہو گا اور نتیجتہً مصنوعات اور سروسز کے دام بڑھ جائیں گے اور ہماری مصنوعات کی بین الاقوامی منڈیوں میں فروخت پہلے کے مقابلے میں دشوار ہو جائے گی۔

ویسے بھی تنخواہوں اور گرانی کے مابین رشتہ قائم کرنے کا تجربہ اُن ملکوں میں زیادہ کامیاب رہا ہے جہاں پیداواری صلاحیّت کا ایک اعلیٰ معیار قائم ہو چکا ہے۔ کئی ملک جن کی معیشت میں پیداواریت کا عنصر غیر یقینی یا غیر معیاری رہا، وہاں یہ تجربہ بہت سے مسائل پیدا کرنے کا باعث بنا ہے اور ناکام تصوّر ہُوا ہے۔ جاپان میں انڈیکیشن کا نظام خوبی سے چل رہا ہے۔ وہ اس لیے کہ مزدور پیداوار میں اضافے کا پابند ہے۔

زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافے کو پیداواری یونٹ میں اضافے کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا یعنی ایک مزدور پیداوار میں جس تناسب سے اضافہ کرے گا، اُسی تناسب سے اُس کی اُجرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یُوں قومی پیداوار بھی بڑھے گی اور مزدور کا معیارِ زندگی بھی بلند ہوتا جائے گا اور پیداواری لاگت کچھ اور کم ہو جائے گی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قومی اسمبلی کو یہ اہم نُکتہ زیرِ بحث لانا چاہیے۔

نئے سال کے بجٹ میں وسائل اور اخراجات کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ وزیرِ خزانہ نے حقیقی نوعیّت کے انقلابی اقدامات کے بجائے اپنے لیے ایک نسبتاً آرام دہ اور قوم کے لیے انتہائی مضرّت رساں راستہ اختیار کیا ہے۔ مشکل راستہ یہ تھا کہ اخراجات کا حجم کم کر دیا جاتا اور وسائل کی فراہمی کے لیے سادگی اور کفایت شعاری کی ایک جیتی جاگتی مُہم چلائی جاتی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر شاہانہ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ

اُردو ڈائجسٹ

کے

25 سال

مکمل ہونے کو آئے ہیں

نومبر ۱۹۸۵ء

ایک نئے دَور کا آغاز

سِلور جوبلی نمبر

اِس نئے دَور کی ایک زندہ علامت ہوگا۔

سلور جوبلی نمبر انشاءَاللہ ایک بڑے سنگِ میل کی حیثیت سے اُبھرے گا۔

سلور جوبلی نمبر دو نسلوں کے سنگم کا ایک خوبصورت کنایہ ہوگا۔ **تحریریں** ـــ وہ جو ضمیر کو تازگی بخشیں، دل کو حُسن عطا کریں۔ **تحریریں** ـــ جو زندگی کے تمام ذائقے فراہم کریں۔ **تحریریں** ـــ جو وقت کی رگوں کو خوشبوؤں میں تبدیل کر دیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مُشتہرین حضرات تاریخی اہمیّت کے اِس سلور جوبلی نمبر میں فراخدلی سے اشتہارات دیں گے۔ سلور جوبلی نمبر دُنیا کے گوشے گوشے تک پہنچے گا۔

جنرل مینجر اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور۔ فون ۴۱۳۸۰۹

زندگی کو تج کر ایک عام آدمی کی سطح پر آجاتے اور قوم کا ایک ایک پیسہ بچاتے۔ عوام کے نمائندے اور وُزرا کفایت شعاری کی رَوش اختیار کرتے اور یُوں عوام کے اندر ایثار کی رُوح پھُونک دیتے۔ وزیرِ خزانہ جونیجو صاحب جنوں میں یہ مُژدے سُناتے رہے کہ ایئر کنڈیشنروں اور بڑی کاروں کی درآمد مکمل طور پر بند کر دی جائے گی مگر بجٹ میں ان باتوں کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں۔ بڑی بڑی ایئرکنڈیشنڈ گاڑیوں اور وسیع و عریض کوٹھیوں میں رہنے والے وُزرا اور سرکاری افسر زیبِ داستاں کے لیے عوام کا راگ تو الاپ سکتے ہیں، اُن کی سطح پر نہیں آسکتے۔ اسی بجٹ میں اسلام آباد کے اندر ایک سے ۱۹ گریڈ کے سرکاری ملازمین کے لیے پانچ ہزار مکانات کی تعمیر کے لیے آٹھ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں جبکہ ۲۰ سے ۲۲ گریڈ کے سرکاری افسروں کے لیے دو سو رہائش گاہوں کی تعمیر پر چار کروڑ روپے خرچ آئیں گے۔

اس نوع کے تفاوت کی موجودگی میں ہماری اقتصادی زندگی کسی انقلاب سے کیونکر ہم کنار ہو سکتی ہے؟ ہم یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ چھوٹے ملازموں کے بیوی بچوں کی صحت مند نشوونما کے لیے اُتنے ہی ہوادار اور کھُلے مکانات کی ضرورت ہے جتنے ہوادار مکانات بڑے افسروں کے لیے درکار ہیں۔ قومی وسائل کا تقاضا تو یہ ہے کہ سبھی سرکاری ملازمین ایک ہی طرز کی باکفایت رہائش گاہوں میں رہنے کی عادت ڈالیں اور چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں۔ اس طرف آنے کی جرأت کوئی بھی نہیں کرتا۔ ہر شخص اپنے آرام اور اپنی آسائش کی حفاظت میں لگا ہُوا ہے اور باتیں انقلابی معیشت کی ہو رہی ہیں۔

ہماری اقتصادی حالت اگر پہلے کے مقابلے میں بہتر نہیں اور اس پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے تو دانش مندی کا اقتضا یہ تھا کہ ہم غیر پیداواری اخراجات میں خاصی کمی کرتے اور پیداواری اخراجات کو بھی ایک حد سے بڑھنے نہ دیتے اور چار پانچ سال کے لیے اپنی روزمرّہ کی ضرورتوں میں اعتدال پیدا کر لیتے۔ جناب ڈاکٹر محبوب الحق نے اقتصادی منشور اس کے برعکس ترتیب دیا ہے۔ نئے سال کے بجٹ میں غیر پیداواری اخراجات کا کُل تخمینہ ۸۲،۶۴ بلین ہے جو گزشتہ سال کے مقابلے میں ۲۸،۵ فیصد زیادہ ہے۔ ترقیاتی اخراجات ۴۰،۸ بلین تجویز ہُوئے ہیں جو گزشتہ سال کے نظرثانی شُدہ تخمینے کے مقابلے میں ۲۰،۶ فیصد زیادہ ہیں۔ ان اخراجات کو پُورا کرنے کے لیے قوم پر قرضوں کا اضافی بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ بیرونی قرضے ۲۶،۵۶ بلین اور اندرونی قرضے ۹،۵۷ بلین روپے مالیّت کے ہوں گے۔ یہ کُل بجٹ کا ۲۸،۵ فیصد بنتے ہیں۔ اندرونی قرضوں کی واپسی ایک سال، دو سال اور تین سال بعد شروع ہو جائے گی اور عوام کو ان کا سُود بھی بھاری شرح سے ادا کرنا ہوگا۔

وہ ملک جو پہلے ہی قرضوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے اور جسے ہر سال اپنے زرِمبادلہ کا پچیس فیصد سے زائد سُود کی ادائیگی پر خرچ کرنا پڑتا ہے، اُس پر قرضوں کا مزید بوجھ لاد دینا کسی طور سمجھ میں نہیں آتا جبکہ نعرہ یہ ہو کہ ہم اپنے وسائل پر انحصار کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کیے ہُوئے ہیں۔ یہ عجب تضاد ہے جو سالہا سال سے چلا آ رہا ہے اور ہر آنے والا اس میں کچھ اور اضافہ کر دیتا ہے۔ مانگے تانگے کے پیسوں پر اللّے تللّے آخر کار رنگ لا کر رہیں گے۔ وہ افراد جو ہماری قسمت کے مالک بنے ہُوئے ہیں، بُرے وقت میں ایک طرف کو ہو جائیں گے اور اہلِ وطن کو خوفناک نتائج کی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑ دیں گے۔

قرضوں کی یہ بھرمار ایک طرح سے نعمت بھی ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ انہیں صحیح طور پر استعمال میں لانے کی صلاحیّت اور ایک مضبوط بُنیادی ڈھانچہ موجود ہو۔ ہم ان دونوں خوبیوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں یا کر دیے گئے

ہیں۔ ہماری سرکاری مشینری انتہائی خود غرض، بے رحم اور کاہل ہے۔ ہمارا بنیادی اقتصادی ڈھانچہ بہت اچھا ہو سکتا تھا مگر اس وقت بڑا ہی کمزور اور فرسودہ ہے۔ مواصلات کے ذرائع اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر ہوئے ہیں مگر قرضوں کو سُرعت کے ساتھ جذب کرنے کی بہت زیادہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ انتظامی اور مالیاتی ادارے بیوروکریسی کے قبضے میں ہیں جو ٹیکنوکریٹس کو فعال کردار ادا کرنے نہیں دیتی۔ ہمارا تعلیمی نظام اچھے ہنرمند، اچھے سائنس دان، اچھے ریاضی دان اور اچھے منصوبہ ساز تیار کرنے سے قاصر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں قرضوں کی فراوانی اَن گنت مسائل پیدا کرے گی۔ قوم پہلے سے زیادہ آرام طلب اور سہل پسند ہو جائے گی اور اُونچے طبقے کی عیش پسندی اور نُدرتِ خیالی' ہماری اقتصادی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔

ہمارے بیشتر مسائل ہمارے منصوبہ سازوں نے پیدا کیے ہیں۔ اُن میں یا تو کوئی اُپج نہیں یا پھر دوسروں کی نقّالی کو منزلِ مراد سمجھ بیٹھے ہیں۔ جب سے پاکستان کے تعلقات امریکہ سے قائم ہوئے، اُس وقت سے ہماری منصوبہ بندی میں ایک خلل واقع ہو گیا۔ وہ یہ کہ ہم اپنے وسائل اور اپنے ماحول کے مطابق ترقیاتی کام سرانجام دینے کے بجائے، بڑے بڑے اور بھاری بھرکم ترقیاتی منصوبوں کے خواب دیکھنے لگے۔ بڑے منصوبوں کا ایک ایسا سحر ہمارے ذہنوں پر چھا گیا کہ چھوٹے پیمانے پر ترقی ہماری نگاہ میں جچتی ہی نہ تھی۔ اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں بتدریج زنگ آلود ہوتی چلی گئیں۔ امریکہ نے امداد کی لذت سے آشنا کر کے ہمارے سیاسی اور اقتصادی زُعما کو خود سوچنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت سے محروم کر دیا، چنانچہ یہ ہوا کہ امریکہ میں نہایت گھٹیا درجے کے ٹیکنیشن پاکستان میں عظیم کنسلٹنٹ کی حیثیت سے براجمان ہوئے۔ انہوں نے بڑی بڑی تنخواہیں وصول کیں، ہمارے ٹیلنٹ کو پیچھے دھکیلا اور ایسے ایسے منصوبے تیار کیے جن کے اخراجات بے پناہ اور جن کا پھیلاؤ بے حساب تھا۔ وہی منصوبے اگر ہمارے انجینئر تیار کرتے اور انہیں عملی جامہ پہناتے تو اُن پر لاگت بھی کم آتی، اُن میں اعتماد بھی پیدا ہوتا اور مقامی لوگ بھی اُن کا ایک فطری حصّہ بن جاتے مگر ہم دُنیا کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر کرنے کے شوق میں غیروں کے ممنونِ احسان ہوتے چلے گئے۔

پاکستان کو مضبوط اقتصادی ڈھانچہ فراہم کرنے کا سب سے مناسب راستہ یہ ہو گا کہ ہمارے منصوبہ ساز چھوٹے چھوٹے منصوبوں کو اوّلیت کا درجہ دیں۔ ہر ترقیاتی پروجیکٹ میں مقامی وسائل اور مقامی آبادی کو بروئے کار لانے کی خاطر سائنٹیفک نقشہ تیار کیا جائے۔ ہم بارانی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے بند باندھ کر آبپاشی کا ایک اپنا اور سستا نظام وضع کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے انجینئر توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے پاکستان کے قدرتی وسائل ایک نئے انداز سے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ نئی تکنیک اختیار کر کے ہم اپنے سالانہ ترقیاتی پروگرام کا حجم بڑی آسانی سے کم کر سکتے ہیں۔

دوسروں کی فہم اور دوسروں کی امداد پر انحصار کرنے سے پاکستان کے اندر توانائی کا شدید ترین بحران پیدا ہوا ہے۔ اس بحران کے جو لوگ ذمے دار ہیں، وہ اعلیٰ مناصب کی بلندیوں، مسرّتوں اور سرشاریوں سے ہم آغوش ہیں اور قوم ایک عذاب کے اندر مبتلا ہے۔ وہ محفوظ کمین گاہوں سے ارشاد فرماتے رہتے ہیں کہ عوام کو سخت حالات کا صبر و شکر کے ساتھ سامنا کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اُن کے گرد تحفّظات کا ایک حصار کھنچا ہوا ہے ورنہ عوام اُن کی بوٹیاں نوچ کر کھا جاتے۔ انہیں ایک دن جواب دینا ہو گا کہ انہوں نے آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت پہلے سے منصوبہ بندی کیوں نہیں کی تھی۔

وہ خرابیٔ موسم کی چادر سے اپنی بداعمالیوں کی پردہ پوشی نہیں کرسکتے۔ لوگوں میں شعور بیدار ہوتا جارہا ہے۔ وہ ان ہاتھوں کا محاسبہ کرنا چاہتے ہیں جو صرف اپنے اپنے مفادات کی جیبیں بھرتے رہے اور ملک کے مستقبل کو تاریک بناتے رہے۔ کیا وہ اندھے تھے کہ اُنھیں مستقبل کی ضرورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں؟ کیا اُن کے دماغ میں بھُس بھرا ہُوا تھا کہ اُنھوں نے ایک ڈگر سے ہٹ کر ذرا سوچنے کی زحمت ہی نہیں فرمائی؟ اور کیا وہ پاکستان سے محبت کرنے کے ہر اعزاز سے محروم تھے؟

یہ خاردار سوال ہر شہری کے ذہن میں اُبھر رہے ہیں۔ وہ ان سوالوں کے جواب کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کا گریبان پکڑ لینا چاہتا ہے جو اندھے مفادات کا سحر جگائے بیٹھے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ بیوروکریٹس اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں اور کسی کی چلنے ہی نہیں دیتے۔ علم، فن، سائنس اور ٹیکنالوجی سے انھیں ایک طرح کا بیر ہے۔ جہاں جہاں اُن کے سائے گہرے پڑے ہیں، وہاں وہاں زمین اور ذہن بنجر ہو گئے ہیں۔ اُنھیں آگے دیکھنے سے کوئی غرض ہے نہ ضرورت۔ مکھی پر مکھی مارنا اور آرام سے وقت گزارنا اُن کی بہترین پالیسی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور بیوروکریسی کے چند بڑے بڑے ستون حکومت کی پالیسی بنانے اور چلانے کی کُنجیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے دوسروں کے لیے دروازے اور اپنے لیے ذہن کے تمام دریچے بند کر لیے تھے۔ اہلِ نظر کہتے رہے کہ توانائی کا بُحران پیدا ہونے والا ہے۔ وہ چیختے رہے کہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے توانائی کے مسائل بخوبی حل ہو سکتے ہیں۔ یہ تجویز بار بار دہرائی گئی کہ ہمیں شمسی توانائی حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ بائیوگیس بہت معمولی خرچ سے تیار کی جاسکتی ہے جو دیہات میں توانائی کا ایک نظام اُستوار کر دے گی۔ مگر ہمارے غریب ملک کے امیر شہزادے دوسروں کی بخشش کا انتظار ہی کرتے رہے۔

کیا اُنھیں اس غفلت، اس بے حسی اور اس بےعملی کی سزا نہیں ملنی چاہیے؟ عام آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ سرِعام کوڑوں کی سزا کے اصل مستحق تو یہ لوگ ہیں۔

* * *

پھر واپڈا کے احوال بھی تفتیش طلب ہیں۔ اس ادارے نے پانی اور بجلی کے وسائل بروئے کار لانے میں بلاشُبہ ایک عظیم کردار ادا کیا ہے مگر تقسیم کا نظام بے حد ناقص ہونے کی وجہ سے توانائی کا ضیاع بہت ہُوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ پھیل کر ایک ایمپائر کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کا بجٹ کئی صُوبوں کے مشترکہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہے۔ افسروں کی اتنی بڑی فوج ہے کہ اُن کی کارکردگی پر نگاہ رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ کام اتنے وسیع اور بڑے ہیں کہ اُن پر ملنے والے کمیشن کروڑوں تک جا پہنچتے ہیں۔

بدقسمتی سے واپڈا میں بھی اختیارات کی عنان اُن لوگوں کے ہاتھ میں نہیں جو انجینئرنگ کے پروفیشن میں اعلیٰ مقام رکھتے ہوں۔ اس امر کا بیان شاید کچھ کے لیے ناگوار سا ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ واپڈا کے چیئرمین پندرہ سال سے فوجی چلے آرہے ہیں۔ اُن کی کارکردگی قوم کے سامنے ہے کہ پانی کی بھی قلت ہے اور بجلی کی بھی۔ پھر واپڈا ہاؤس میں چلے جائیے تو بے شمار فوجی افسروں کے ناموں کی تختیاں نظر آئیں گی۔ اس پہلو کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ فوجی حضرات کے آنے سے واپڈا کے معاملات میں خُوبی پیدا ہُوئی ہے یا بگاڑ پھیلا ہُوا ہے۔ ممکن ہے فوج میں اُن کی پرفارمنس اچھی رہی ہو لیکن بجلی اور پانی کے وسائل اپنی ترقی کے لیے ایک دُوسرے ہی مزاج کا تقاضا کرتے ہیں۔ کچھ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ واپڈا میں انجینئر اور سائنس دان پیچھے چلے گئے ہیں اور منصوبہ بندی اور ایڈمنسٹریشن اُن لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو نظر اور تجربے کی وہ گہرائی اور وُسعت نہیں رکھتے جو مستقبل میں جھانکنے کے لیے درکار ہیں۔

یہ امر دلچسپ بھی ہے اور دلخراش بھی کہ واپڈا کی اصل کارکردگی جُوں جُوں خراب ہو رہی ہے، چیئرمین کے مناصب اُونچے ہوتے جارہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گزشتہ پندرہ برسوں کے چیئرمینوں کے کارناموں پر کھُلی بحث ہونی چاہیے۔

* * *

سب سے بڑا ستم یہ ہوتا آیا ہے کہ واپڈا کا بجٹ کسی بھی سطح پر قوم کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور اب جبکہ قومی اسمبلی وجود میں آچکی ہے، تب بھی واپڈا کا بجٹ اور اُس کا ترقیاتی پروگرام زیرِ بحث نہ آسکے گا۔ اس طریقِ کار کا نقصان یہ ہُوا کہ قوم کے باخبر حلقوں کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مستقبل کے لیے کیا منصوبہ بندی ہو رہی ہے، ترجیحات کا نقشہ کیا ہے، توانائی کے اور کون کون سے وسائل بروئے کار لائے جارہے ہیں اور آئندہ کی اسٹراٹیجی کیا ہے۔ ممکن ہے کہ پورا نقشہ سامنے آنے سے اخبارات و جرائد میں بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور ایک بہتر حکمتِ عملی پر اتفاقِ رائے ہو جاتا اور قوم ایک خوفناک بُحران کے مُنہ میں جانے سے بچ جاتی۔

اب تمام پالیسی اُمور واپڈا اتھارٹی طے کرتی ہے جس کے دو ممبر ہوتے ہیں اور ایک چیئرمین — ہر چیز صیغۂ راز میں رہتی ہے۔ خُدا کے فضل سے پاکستان میں بڑے بڑے قابل انجینئر موجُود ہیں۔ تین چار انجینئرنگ یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ انجینئرنگ کونسل اور انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ بھی اپنا وجُود رکھتے ہیں مگر واپڈا کے اربابِ بست و کشاد اُن کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے اور اُنھیں منصوبہ بندی میں شامل کرنے کے مُوڈ ہی میں نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا نظام وضع کرنے کی ضرورت ہی محسُوس نہیں کی گئی جس کے ذریعے ان تمام اداروں کے مابین ایک باقاعدہ رابطے کی شکل پیدا ہو جائے۔

واپڈا اپنی جسامت کے لحاظ سے منصُوبے تیار کرتا ہے اور سفید ہاتھی کا بوجھ اُن پر ڈال دیتا ہے۔ اس اِدارے کی اتھارٹی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ کوئی اُس کے غلط فیصلوں کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ اُس میں بڑے بڑے مفادات کے عالی شان محل تعمیر ہو چکے ہیں قرضوں پر دادِ عیش دی جارہی ہے۔ اُسے جھنجھوڑنے اور اُس کی چربی پگھلانے کی اشد ضرورت ہے۔

* * *

توانائی کی صُورتِ حال بہتر بنانے کے لیے بہت سی تجویزیں دی جاتی رہی ہیں، ہم یہاں اُن میں سے چند کا اعادہ اس موڑ پر بہت اہم خیال کرتے ہیں:

(۱) بجلی کا نظامِ تقسیم کسی اور ادارے کے حوالے کیا جائے۔ بجلی میں ضیاع کی شرح ۳۰ سے ۳۵ فیصد ہے، یہ نااہلی کی بہت نچلی سطح ہے۔ کرپشن اس کے علاوہ ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر یقینی طور پر تقسیم کا نظام بہتر بنا لے گا۔

(۲) دیہات میں بجلی پہنچانے کی حکمتِ عملی بہت خوب ہے۔ اور یہ اعزاز فوجی حکومت کو جاتا ہے کہ اس نے گزشتہ سات آٹھ سال میں گاؤں اور قصبوں میں بجلی پہنچائی ہے مگر جو طریقِ کار اختیار کیا گیا اُس نے توانائی کے وسائل پر شدید دباؤ ڈالا ہے۔ اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی جاتی رہی ہے کہ دیہات میں مقامی وسائل کے ذریعے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چین میں نہروں کے ایک ایک چپّے سے بجلی پیدا کرنے کی حکمتِ عملی پر عمل ہُوا اور وہاں سستے داموں توانائی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ بائیوگیس کی تیّاری کچھ بھی مشکل نہیں۔ انجینئر اس امکان کو حقیقت کا رنگ دینے کی پیشکش کر رہے ہیں کہ شہروں کے بول و براز کو جلا کر اتنی بجلی پیدا کی جاسکتی ہے جو مقامی ضرورت کو پورا کر دے گی۔ واپڈا جب روایتی انداز میں دیہات کو بجلی فراہم کرے گا تو اخراجات بے پناہ ہوں گے۔ کھمبوں اور تاروں کی

اُردو ڈائجسٹ کا ایک نیا جیتا جاگتا سِلسلہ

خواتین کو اظہارِ خیال کی دعوت

۲۰ جون تک جوابات ارسال فرما دیجیے!

کارکُن خواتین کِن حالات، مشکلات اور مسائل سے دوچار ہیں اور اُن کا مداوا کیسے ممکن ہے؟

جوابات دیتے وقت مندرجہ ذیل نکات بھی دیکھ لیجیے اور واقعات کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیجیے:

① آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟
② آپ نے ملازمت کسی مجبوری کے تحت اختیار کی ہے یا شوق سے؟
③ ملازمت کی نوعیّت کیا ہے؟
④ ملازمت کرتے ہُوئے آپ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا محسوس کرتی ہیں؟
⑤ کیا آپ کسی مسئلے سے دوچار ہُوئیں اور اس کی نوعیت کیا تھی؟
⑥ ملازمت آپ کے گھریلو ماحول پر اثر انداز تو نہیں ہُوئی؟
⑦ آپ کے ساتھیوں کے رویّے کس کس طرح کے ہیں؟
⑧ کیا آپ مردوں سے بہتر فرائض انجام دے لیتی ہیں؟

جوابات انچارج جیتا جاگتا سلسلہ کے نام ارسال کیجیے

اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

تنصیب پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک غیر معمولی انتظامات اور اخراجات درکار ہوں گے جبکہ مقامی طور پر بجلی پیدا کرنے سے تقسیم کا نظام بہت ارزاں رہے گا۔ یہ کام بھی نجی شعبے کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح دیہات بجلی بھی حاصل کرلیں گے اور گرِڈ اسٹیشنوں پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔

③ پانی ذخیرہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بند تعمیر کیے جائیں۔

④ پانی کی تقسیم اور ضیاع کے بارے میں محکمۂ آبپاشی کا تصور یہ تھا کہ ۱۰ تا ۱۵ فیصد پانی کھیتوں تک پہنچتے پہنچتے ضائع ہوجاتا ہے۔ جب ایک عالمی ادارے کی طرف سے پانی کے ضیاع پر ایک رپورٹ تیار ہوئی تو معلوم ہُوا کہ ضیاع کی شرح ۴۰ اور ۵۰ فیصد کے درمیان ہے۔ اس خوفناک انکشاف کے بعد واٹر مینجمنٹ پر کچھ توجہ دی گئی۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ پانی کا ایک ایک قطرہ ضائع ہونے سے بچایا جائے اور واٹر مینجمنٹ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

⑤۔ بڑے بڑے شہروں میں پانی فراہم کرنے کے انتظامات سائنٹیفک بُنیادوں پر کیے جائیں۔ کراچی اور لاہور میں پانی کی قلت کا مسئلہ روز بروز شدّت اختیار کرتا جارہا ہے۔ وہ ادارے جو پانی فراہم کرنے کے ذمّے دار ہیں انہیں غیر معمولی اہمیت دی جائے۔ ترقیاتی اخراجات میں اُن کا حصّہ معقول ہو اور تربیت یافتہ، باصلاحیت اور دیانت دار افسروں کو معاملات کا ذمّے دار بنایا جائے۔

⑥ توانائی کے قدرتی وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے ٹیکنالوجی کو غیر معمولی اہمیت دینا ہوگی۔ جاپان ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر توانائی کا مسئلہ حل کر چکا ہے جبکہ تیل پیدا کرنے والے بیشتر عرب ممالک ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے رہ جانے کی وجہ سے اپنے قدرتی وسائل سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ پاکستان میں تیل کے ذخائر دریافت ہوچکے ہیں، اُنہیں استعمال کے قابل بنانے کے لیے جدید مشینری اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہوگی۔

⑦ تیل کی درآمد میں کمی کرنے کے لیے ہمیں اپنے ٹرانسپورٹ کے نظام میں تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ شاہراہوں پر ہر پچاس میل کے فاصلے پر الیکٹرک بیٹری چارجنگ اسٹیشن قائم کردیے جائیں۔ باہر کی دُنیا میں بیشتر گاڑیوں میں الیکٹرک بیٹری کا سسٹم نصب کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ کینیڈا میں ڈیزل انجن ہائیڈروجن پاور میں تبدیل کرلیے گئے ہیں۔ ہم بھی اس تجربے سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ٹرانسپورٹ پر خام تیل کا ۵۰ سے ۶۰ فیصد حصّہ استعمال ہوجاتا ہے۔

⑧ الیکٹرک بیٹری چارجرز کی تیاری میں پرائیویٹ سیکٹر ایک اہم کردار ادا سکتا ہے۔

⑨ ایک ہزار میگاواٹ کا ایٹمی توانائی پلانٹ لگانے پر خصوصی اور فوری توجہ دی جائے۔

⑩ شمسی توانائی کے وسائل بروئے کار لانے سے توانائی کی قلت پر کسی حد تک قابُو پایا جاسکتا ہے۔

ابھی تک توانائی کی پالیسی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس بار سالانہ ترقیاتی پروگرام میں توانائی کی پیداوار کے لیے کثیر رقوم مختص کی گئی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہمارے متعلقہ ادارے اسی غفلت اور غیر ذمّے داری کا شکار رہتے ہیں تو اخراجات بڑھا دینے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ پالیسی اور منصوبہ بندی میں بھی بے انداز خرابی تھی اور مینجمنٹ میں بڑے بڑے گھپلے ہُوئے اور آج بھی معاملات انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو سالہا سال سے ذمّے دار چلے آرہے ہیں۔ ان حالات میں اصلاح اور ترقی کے امکانات کچھ زیادہ روشن اور تابناک نہیں بلکہ مستقبل اور بھی تاریک نظر آتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے وزیرِ خزانہ اپنی بجٹ تقریر میں

اہلِ دیہات کو مژدہ سُناتے ہیں کہ نئے سال میں ۳ ہزار گاؤں تک بجلی پہنچا دی جائے گی اور پانچ سال کے اندر اندر تمام دیہی علاقہ بجلی سے جگمگا رہا ہو گا۔ ادھر واپڈا کے چیئرمین ارشاد فرماتے ہیں کہ بجلی مزید علاقوں میں فراہم نہیں کی جائے گی۔ یہ تضاد ایک پُراسرار کہانی کا عنوان معلوم ہوتا ہے۔

توانائی کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لینا ضروری ہے۔ ہماری عادت یہ ہے کہ ضیاع کو ہم نے اپنے افتخار اور انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ بلا مقصد پانی بہتا رہے، گیس جلتی رہے اور بجلی کے بلب روشن رہیں تو یہ ہماری دریادلی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی صاحب آپ کو فاضل بلب بجھا دینے کا مشورہ دیتے ہیں تو آپ اُن پر کنجوسی کا لیبل لگا دیں گے۔ ہمیں اسکولوں یا گھروں میں یہ تربیت دی ہی نہیں جاتی کہ ضرورت پڑے تو بتی روشن کرلو اور جب کمرے یا غسل خانے سے باہر آؤ تو اسے بجھا دو۔ بے فکری اور تساہل پسندی کے یہی رویّے ہماری توانائی کے وسائل کو چاٹتے چلے جاتے ہیں۔

پھر خوشی کے موقع پر ہم روشنیوں کا قریہ آباد کرنے کے خُوگر ہیں۔ یہ ہماری دولت مندی کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے۔ ایک ایک شادی پر تین تین چار چار دن چراغاں رہتا ہے۔ ایک ایک گھر میں دو دو چار چار، اور بعض اوقات دس دس ایئرکنڈیشنر لگے ہُوئے ہیں۔ یہ بھی ہماری امارت کا پتہ دیتے ہیں۔ سرکاری دفتروں، اُونچے ایوانوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہزاروں واٹ پاور کے فانوس روشن ہیں۔

ان معاشرتی رویّوں کی اصلاح کے لیے قومی سطح پر ایک تحریک اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اُوپر سے نیچے تک بچت اور کفایت شعاری کا مظاہرہ عام ہو۔ ہم سب مل کر ایک طرف مجرموں کا محاسبہ کریں اور دوسری طرف اپنی عادات و خصائل کو ایک نظم کا پابند بھی بنائیں۔ اس طرح قوم کے اندر سے ایک نئی قوت اُبھرے گی۔

نئے سال کے بجٹ میں توانائی کا مسئلہ پہلی بار سنجیدگی سے اُٹھایا گیا ہے؛ چنانچہ اُمید بندھتی ہے کہ تناؤ میں کچھ تو کمی آئے گی۔

ہم اس مرحلے پر اس حقیقت کا بیان ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری قوم کو بحیثیتِ مجموعی سادگی اور کفایت شعاری کا اصول اپنا لینا چاہیے۔ ہمارے مسائل کی جڑ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی خُو ہے جس نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ مسلمان کی شان کا غالباً یہ تصور ہے کہ جو آئے خرچ بھی ڈالے اور دوستوں سے کچھ قرض بھی لے۔ اس طرزِ زندگی میں بچت کا مرحلہ آتا ہی نہیں۔

ہماری شاہ خرچیوں کا یہ حال ہے کہ جناب وزیرِ خزانہ نے ۴۰.۰۰ بلین روپے کا ترقیاتی پروگرام ترتیب دیا۔ ہم اپنی بچتوں سے صرف ایک فی صد وسائل مہیا کریں گے۔ باقی تمام فنڈ بیرونی قرضوں یا اندرونی قرضوں سے حاصل کیے جائیں گے۔ یہ بڑی تشویش ناک صُورتِ حال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی بچتوں کا نظام غیر مؤثر ہوتا جا رہا ہے اور پاکستان بچتوں کے حوالے سے عالمی برادری میں بہت پیچھے دکھائی دیتا ہے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ بچتوں ہی سے قومی سرمائے کی تشکیل ہوتی ہے جو آگے چل کر قومی پیداوار میں کام آتا ہے۔ اگر ہم اپنا سرمایہ تشکیل ہی نہیں کرتے تو ہماری معیشت کی باگ ڈور اُن طاقتوں کے ہاتھ میں رہے گی جو ہمیں قرض یا امداد فراہم کریں گی۔ ہم اگر حقیقی طور پر اقتصادی استحکام اور آزادی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اخراجات میں بڑے پیمانے پر تخفیف کر کے قومی بچتوں کی سطح بہت بلند کرنا ہو گی۔

ہم بجٹ کے حوالے سے ایک اور اہم نکتہ زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ عام رُجحان جنرل ایڈمنسٹریشن کے

اخراجات کم کرنے کا ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ غیر پیداواری اخراجات پر قابو رکھنا ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے مگر اس حقیقت کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ عام آدمی کا واسطہ اُن اداروں سے پڑتا ہے جو غیر پیداواری مدوں میں چل رہے ہوتے ہیں۔ ترقیاتی پروگرام کے اثرات کئی سال بعد مرتّب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ڈیم تعمیر ہو رہا ہے۔ اس ترقیاتی پروگرام سے عام شہری کو بہت کم واسطہ پڑے گا۔ اس کے مقابلے میں وہ ہسپتال، بجلی کے دفتر، ضلع کچہری یا پوسٹ آفس بار بار جاتا ہے۔ جب ان دفتروں یا اداروں کے اخراجات منجمد یا کم کر دیے جاتے ہیں تو اُن کے اثرات فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں اور عام شہری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ بجٹ میں فرض کیجیے، ہسپتال کو دی جانے والی رقوم کٹوتی کی زد میں آگئیں۔ نتیجے میں کچھ قاصد، کچھ خاکروب اور کچھ دوسرے ملازم کم ہو گئے۔ اُن کے ساتھ ساتھ دواؤں کی سپلائی پہلے کے مقابلے میں گھٹ گئی۔ ان تمام چیزوں کا اثر یہ ہو گا کہ صفائی کا معیار گر جائے گا۔ وارڈوں میں بُو پھیل جائے گی۔ بلیاں اور کتّے اندر گھس آئیں گے۔ مکھیاں بھنبھنائیں گی اور مریض کو بروقت کوئی دوا نہیں ملے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ اس نوع کی تخفیف ایک شہری کے لیے تکلیف کا باعث قرار پائے گی۔ اسی تناظر میں آپ تھانوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اکثر اس بات پر بہت لے دے ہوتی ہے کہ لا اینڈ آرڈر کے اخراجات میں اضافہ کیوں کر دیا گیا ہے مگر کوئی اس مسئلے کی گہرائی میں جانے کے لیے تیار نہیں کہ ان مدوں میں اگر اضافہ نہیں ہو گا تو پولیس اسٹیشنوں کی حالت کیسے سُدھرے گی، وہاں کا ماحول، وہاں کا فرنیچر، وہاں کی سٹیشنری، پس ماندگی کا عجب احساس دلاتے ہیں۔ بجٹ میں تھانوں کی مرمّت کرانے کی گنجائش رکھی ہی نہیں جاتی۔ سٹیشنری کے اخراجات شاید آج سے ساٹھ ستر سال پہلے دو روپے مقرر ہوئے تھے، آج تک وہی چلے آرہے ہیں۔ یبوست زدہ عمارت میں جا کر آپ کو خوشی اور تحفظ کا خاک احساس ہو گا؟

آپ ٹیلی فون کے دفتر جاتے ہیں۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے جتنے اخراجات کی ضرورت ہے، وہ فراہم نہیں کیے جاتے، چنانچہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک ٹوٹی کرسی آپ کا انتظار کر رہی ہو گی۔ دیواروں سے وہ کمرہ کسی پرانے جیلخانے کا ایک سیل نظر آئے گا۔ دروازے میلے، الماریاں ٹوٹی ہوئیں، فرش اُکھڑے ہوئے۔ اسی لحاظ سے کلرک آپ سے اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں گفتگو شروع کر دے گا اور آپ بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے واپس آنے ہی میں اپنی عافیت خیال کریں گے۔

ہمیں اپنے اس تصور میں اصلاح کر لینی چاہیے کہ غیر پیداواری اخراجات کی حیثیت شجرِ ممنوعہ کی سی ہے۔ انہیں سلیقے سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ دفتروں، ہسپتالوں اور اسکولوں کی ظاہری حالت اتنی اچھی ہونی چاہیے کہ اُن میں کام کرنے والا اپنے فرائض خوش خلقی اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے اور وہاں آنے والے شہری کسی کوفت، دشواری یا دل شکستگی سے دوچار نہ ہوں۔

یہاں اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دفتروں میں صفائی ستھرائی سے ہماری مُراد یہ نہیں کہ اہلکار اپنے کمروں میں دبیز قالین اور قیمتی پردے ڈال کر بیٹھ جائیں اور کسی کو اندر آنے ہی نہ دیں یا پھر دربان ہر آنے والے کی کھال کھینچنے لگے۔ دفتروں کے دروازے شہریوں پر کھلے ہونے چاہییں۔

اس بجٹ میں دیہی ترقی کا بہت چرچا ہے۔ بجٹ تقریر سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ جناب وزیر خزانہ نے دیہی اور شہری زندگی میں تقسیم کی ایک لکیر کھینچ دینا چاہی ہے۔ اس میں کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ ہماری دیہی آبادی بڑی پسماندہ ہے اور اُس پر خصوصی توجہ دینے کی بے حد ضرورت

ہے مگر دیہی ترقی کی جو رقوم اور منصوبے سامنے آرہے ہیں، اُن پر گفتگو کی خاصی گنجائش موجود ہے۔

سالانہ ترقیاتی پروگرام میں صوبوں میں دیہی ترقی کے لیے ۵۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ یہ رقم آج کی مہنگائی کے حوالے سے کچھ زیادہ نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیہی ترقی کے بیشتر پروگرام شہروں میں بنتے ہیں اور اُن اداروں کے مرکزی دفاتر بھی بالعموم بڑے شہروں ہی میں موجود ہیں جو دیہی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر ساری منصوبہ بندی وہ سرکاری افسر کرتے ہیں جن کا دیہات سے تعلق کبھی کا ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ڈپٹی کمشنر اس بات کا پابند ہوتا تھا کہ وہ مہینے میں کم از کم دس دن دیہات میں گزارے۔ اب اسسٹنٹ کمشنر بھی دیہات کا رُخ نہیں کرتے ہیں۔ مختلف محکموں کے افسر سارا وقت شہروں ہی میں گزارتے ہیں۔

وہ لوگ جو دیہات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اُن کے ذریعے دیہی ترقی کا کام ٹھیک طور پر سرانجام نہیں پا سکے گا۔ بلدیاتی ادارے اس ضمن میں حقیقی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مقامی نمائندوں کو سرکاری اہلکاروں اور افسروں کے محاسبے کا حق ملنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ترقی کے منصوبے وہ خود تیار کریں۔ اس طرح پیسہ ضائع بھی کم ہو گا اور علاقے کی ترقی فطری انداز میں ہو گی۔

نئے سال کا بجٹ بھاری بھر کم ہونے کے باوجود کئی اعتبار سے خوشگوار تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔ سمتوں کا صحیح تعین ہوا ہے۔ مقاصد اور ترجیحات بھی واضح اور درست معلوم ہوتی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہو گی کہ بہت زیادہ مین میخ نکالے بغیر اِن مدوں میں تعاون کیا جائے جو ترقی اور استحکام کی طرف لے جاتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس نئے تجربے کو آگے بڑھانے اور اس کے نقائص دُور کرنے کے لیے ایک مثبت حکمتِ عملی

الریاض پنکھے

تیار کی جانی چاہیے۔ اس حکمتِ عملی کے مندرجہ ذیل خط و خال ہو سکتے ہیں:

(۱) انکم ٹیکس کا جو نظام قائم ہُوا ہے اُس کا احترام کیا جائے اور اسے ہر قیمت پر مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ بہت عرصے بعد دیانت دار لوگوں کو ایک سُنہری موقع ملا ہے۔ اب رزقِ حلال کمانا پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہو گیا ہے۔

(۲) ٹیکسوں کے نظام میں اصلاح کے لیے ایک کمیشن تجویز ہُوا ہے۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں اس کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ کمیشن ایوب خاں کے زمانے میں کام کرتا تھا، مگر نئی حکومتوں نے ختم کر دیا۔ وہ لوگ جو وطنِ عزیز کو ٹیکسوں کے جابرانہ اور غیر منصفانہ نظام سے نجات دلانا چاہتے ہیں، وہ اس کمیشن کو اپنی تجاویز ضرور ارسال فرمائیں۔ یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہو گی۔

(۳) نجی شعبے کو آگے بڑھ کر وہ حصص خرید لینے چاہییں جو قومیائی ہُوئی صنعتوں کے فروخت ہونے والے ہیں۔ حکومت کو نقد روپے کی شدید ضرورت ہے۔ ایک طرف اس ضرورت کو پُورا کر دینے سے ترقیاتی پروگرام کے لیے وسائل میسّر آئیں گے، دوسری طرف صنعتوں کو ایک معیار اور ایک بہتر مینجمنٹ میسّر آ جائیں گے جو قومی پیداوار میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

(۴) ڈی ریگولیشن کمیشن کے ساتھ بھی بھرپُور تعاون کیا جائے تاکہ معیشت سرکاری جکڑ بندیوں سے آزاد ہو سکے۔ اس ضمن میں اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہو گی۔

(۵) بچت کی نئی اسکیمیں حکومت جاری کر رہی ہے، اُن میں فراخ دلی سے حصّہ لینا چاہیے۔ نئے بجٹ کی تمام تر کامیابی کا انحصار اس بات پر ہو گا کہ لوگ کتنا کالا دھن باہر نکالتے ہیں، کتنا زرِ مبادلہ باہر سے ملک میں لاتے ہیں اور بچتوں کا بیس کتنا مضبوط بناتے ہیں۔

(۶) ڈی انوسٹمنٹ کمیٹی کے ہاتھ مضبوط کرنے سے حکومت کی کارکردگی بہتر ہو جائے گی۔ حکومت قومیائی ہُوئی صنعتیں فروخت کر دیتی ہے تو اُسے ایک طرف سرمایہ میسّر آئے گا، دوسری طرف وہ اپنی تمام تر توجہ اقتصادی اور سوشل ڈھانچے کو مضبوط بنانے پر مرکوز کر سکے گی۔

(۷) زراعت کے شعبے میں جن مراعات کا اعلان ہُوا ہے، اُن سے ہر ممکن فائدہ اُٹھانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ خوردنی تیل کی کاشت پر خصوصی توجہ دینے سے زرِ مبادلہ میں بہت بڑی کفایت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ڈیری فارم بڑی تعداد میں قائم ہونے چاہییں۔ اس ضمن میں ہماری تجویز یہ ہے کہ دیہات کو آپس میں ملانے والی سڑکوں کے بڑے بڑے موڑوں پر دُودھ نکالنے اور اُسے جراثیم سے پاک رکھنے والی مشینیں لگا دی جائیں۔ دیہاتی گائے بھینس وہاں لے آئیں اور اُن کا دودھ مشینوں کے ذریعے نکال لیا جائے اور پیسوں کی ادائیگی بروقت کر دی جائے۔ اس طرح ہر گاؤں میں چھوٹے چھوٹے ڈیری فارم وجود میں آ جائیں گے۔ یُوں دُودھ کی فراوانی ہو گی اور ہمیں باہر سے درآمد کرنا نہیں پڑے گا۔ ہر گھر میں گائے اور بھینس پالنے کے لیے چھوٹے چھوٹے قرضے بھی دیے جا سکتے ہیں۔

(۸) جناب ڈاکٹر محبوب الحق کی ایک خُوبی جس نے ایک دُنیا کو اُن کا گرویدہ بنا دیا ہے، وہ اُن کی حق گوئی اور حق نیوشی ہے۔ وہ ہر اچھی تجویز کا خیر مقدم کریں گے اور کسی معاملے کو انا کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ یہ خوشگوار صُورتِ حال شاید پہلی بار ہم پر سایہ فگن ہُوئی ہے۔ سنجیدہ ذہنوں کو پیچ و تاب کھانے اور مایوس ہونے کے بجائے تعمیر کی راہیں کھولنی چاہییں۔

ہم آخر میں صرف ایک ہی عرض وزیرِ خزانہ کی خدمت میں کرنا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے ریل کے کرایوں میں اضافہ کر کے اپنے ضمیر پر ایک بھاری بوجھ ڈال لیا ہے۔ اُسے جھٹک دیجیے کہ بجٹ کی لوڈشیڈنگ ان دنوں بہت خوشگوار محسوس ہو گی۔

معظم علی

جناب نسیم حجازی تاریخی ناول نگاری میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے ناولوں نے برِصغیر کے نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا اور اُن میں اسلامی تاریخ کے ساتھ گہری محبت پیدا کی اور ان کے سینوں میں اپنے اسلاف کے عظیم کارنامے زندہ کرنے کی چنگاری روشن کی۔

معظم علی، جناب نسیم حجازی کا مشہور ناول ہے جو اُنہوں نے ۱۹۵۷ء میں مکمل کیا۔ یہ ناول بقول مصنف "اور تلوار ٹوٹ گئی" کا پس منظر ہے اور اس میں سلطان ٹیپو کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے بنگال، اَوَدھ اور میسور کی تاریخ ہے۔ اس ناول کا ایک اقتباس انٹرمیڈیٹ کے اُردو نصاب میں بھی شامل ہے۔ معظم علی ۵۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک تاریخی ناول

تلخیص: ڈاکٹر حسن اختر

معظم علی مُرشد آباد کے قید خانے کی کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ سراجُ الدولہ کی پلاسی کے میدان میں شکست سے اُس کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا اور زندگی کے دامن میں اُس کے لیے مہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ پہلے بھی مُرشد آباد سے کوسوں دُور قید رہ چکا تھا مگر اس وقت مُرشد آباد کا تصوّر اُس کا حوصلہ بندھاتا رہتا تھا۔ اب یہ رنگین تصوّر اُس سے چھن چکا تھا۔ اُس کی کوٹھڑی میں جو دوسرے قیدی آئے اُنھوں نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی گرفتاری کے اگلے دن ہی فرحت اور اُس کے والدین مُرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔ اب وہ تصوّر کی آنکھ سے فرحت کو اَن دیکھے صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا۔

معظّم علی نے اُس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لیڈروں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ محمود علی علی وردی خاں کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مُرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلّے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حُسین بیگ کا قلعہ نما محل تھا۔ حُسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ مُعظّم علی سے دو سال بڑا تھا اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا مُعظّم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔ معظّم نے اُن دونوں کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور وہ اُن کے ساتھ کھیل کر بڑا ہُوا تھا۔ وہ حُسین بیگ کے کُتب خانے سے کتابیں لے کر پڑھا کرتا اور یہیں اُس نے حُسین بیگ کی حسین اور جمیل بیٹی فرحت کی ایک جھلک پہلی بار دیکھی تھی۔ حُسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف اور افضل اور مُعظّم علی کا بڑا بھائی فوج میں بھرتی ہو گئے مگر مُعظّم اپنے علم کی پیاس بُجھاتا رہا۔ پھر اچانک یہ خبر مشہور ہو گئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھوجی بھونسلہ کی چالیس ہزار فوج مُرشد آباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علی وردی خاں اپنی فوج کے ہمراہ مرہٹوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہُوا۔ اس فوج میں محمود علی، یوسف علی، آصف بیگ اور افضل بیگ بھی شامل تھے۔ مُرشد آباد میں فوج بہت کم تھی۔ مگر مُعظّم علی نے حُسین بیگ کی حویلی کو قلعہ بنا دیا اور محلّے کے لوگوں کو تربیت دے کر سپاہی تیار کر لیے۔ مرہٹوں نے علی وردی خاں سے زک اُٹھانے کے بعد مُرشد آباد پر اچانک حملہ کر دیا۔ مگر حُسین بیگ کی حویلی میں دو سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ علی وردی خاں کا سپہ سالار میر مدن مُعظّم علی کی بہادری اور تدبّر سے بے حد متاثر ہُوا اور اُسے پانچ سو سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔ برسات کی شدّت کم ہوتے ہی علی وردی خاں نے مرہٹوں پر حملہ کر دیا اور اُنہیں شکستِ فاش دے کر بھگا دیا۔ اس لڑائی میں مُعظّم علی نے بے مثال بہادری کا ثبوت دیا؛ چنانچہ اُسے سرحدی قلعے کا محافظ مقرر کر دیا گیا۔

اس دوران میں میر جعفر نے علی وردی خاں کی خوشنودی حاصل کر لی جس نے اُسے اُڑیسہ کا نائب امیر مقرر کر دیا۔

میر جعفر کی بے تدبیریوں سے سرحدی قلعہ پھر مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا اور مُعظّم علی فرار ہو کر مُرشد آباد آ گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہُوا کہ آصف بیگ میر جعفر کی سرکردگی میں روانہ کر دیا گیا ہے۔

میر مدن کے کہنے پر مُعظّم علی ایک بار پھر اُڑیسہ کی طرف روانہ ہُوا مگر اُس کے پہنچنے سے قبل میر جعفر ایک لڑائی میں آصف بیگ کو چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ مُعظّم علی نے اپنی فراست اور تدبّر سے مرہٹوں پر فتح حاصل کر لی مگر وہ آصف بیگ کو نہ بچا سکا۔ آصف بیگ نے مرنے سے قبل مُعظّم علی کو بتایا کہ میری بہن فرحت تمہیں چاہتی ہے اور مَیں زندہ رہتا تو اُس کی شادی تم سے ضرور کروا دیتا۔ مُعظّم علی نے ایک بار پھر سرحدی قلعے پر قبضہ کر لیا مگر صوبیدار عطاء اللہ خاں اور میر جعفر سے بددل ہو کر واپس مُرشد آباد آ گیا۔ یہاں بھی عطاء اللہ خاں اور میر جعفر کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ مُعظّم علی کو اُڑیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت سے سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ عطاء اللہ خاں اور میر جعفر پر نظر رکھ سکے مگر جب وہ اُڑیسہ سے سرحدی اضلاع کی طرف روانہ ہُوا تو میر جعفر اور عطاء اللہ خاں کی سازش کا شکار ہو کر میر حبیب کی قید میں پہنچ گیا جو مرہٹوں کا حلیف تھا۔ میر حبیب حُسین بیگ کی حویلی کے دفاع کی وجہ سے مُعظّم کی بہادری کا قائل تھا۔ اُسے اپنے ساتھ ملانے کے لیے کہا:

"ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو زیادہ محسوس نہ کرو۔ مَیں بہادروں کی عزّت کرتا ہُوں۔"

مُعظّم علی نے جواب میں کہا: "اگر آپ میر حبیب ہیں تو مَیں بنگال سے آپ کی دُشمنی کے اسباب پُوچھنا چاہتا ہُوں۔"

میر حبیب نے جواب دیا: "مَیں کسی کا دوست ہُوں نہ دُشمن۔ میری دلچسپی صرف بنگال کے حکمران اور اُمرا کی دولت سے ہے۔"

مُعظّم علی نے برجستہ کہا: "لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں۔"

"مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ تم کسی دولت مند کے بیٹے نہیں۔ اگر تم کسی دولت مند آدمی کا پتہ بتا سکو تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

مُعظّم علی نے غصّے سے ہونٹ کاٹتے ہُوئے جواب دیا: "مَیں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہُوں اور وہ مُرشد آباد کا قید خانہ ہے۔"

میر حبیب نے کہا: "اِنسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ مَیں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہُوں اور اب تم جا سکتے ہو۔"

مُعظّم علی کو ایک خستہ و شکستہ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ میر حبیب کی قید میں کئی ماہ رہنے کے بعد ایک دن مُعظّم علی وہاں کے ایک اور قیدی اکبر خاں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں میر جعفر نے شکایت کر کے عطاء اللہ خاں کو معزول کروا دیا تھا مگر خود علی وردی خان کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔

یہ حالات دیکھ کر مُعظّم علی گھر بیٹھ گیا اور اُس نے فوج کی نوکری چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا مگر سراجُ الدّولہ کی شفقت نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کچھ عرصہ مرہٹوں کے ساتھ چھوٹی موٹی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ ابھی مُرشد آباد سے باہر ہی تھا کہ اُسے علی وردی خاں کی موت اور سراجُ الدّولہ کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی۔ پھر جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ پلاسی کی جنگ میر جعفر کی غدّاری کی وجہ سے ہاری جا چکی ہے اور اُس کا والد، بھائی اور افضل بیگ وفاداری کی قیمت اپنی جان دے کر ادا کر چکے ہیں تو وہ مُرشد آباد کی طرف روانہ ہُوا جہاں اُس کی والدہ موت و حیات کی کشمکش میں مُبتلا تھی۔

مُرشد آباد آ کر معلوم ہُوا کہ سراجُ الدّولہ شہید ہو چکا ہے اور میر جعفر نے مسندِ اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اُس کی ماں نے مرنے سے پہلے اُسے بتایا کہ سراجُ الدّولہ نے مُرشد آباد چھوڑنے سے قبل اُسے ہیروں کی ایک تھیلی بھیجی تھی جو اُس نے صحن میں دفن کر دی تھی۔ مُعظّم علی ماں کی وفات کے بعد زیادہ عرصہ مرزا حُسین بیگ کے ہاں گزارنے لگا۔ ایک دن وہ مرزا صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ میر جعفر کا بیٹا میرن بیس سپاہی لے کر آن پہنچا اور مُعظّم علی کو گرفتار کر کے اُسے قید میں ڈال دیا۔ اسی دوران میں میر جعفر کا داماد میر قاسم اُس سے ناراض ہو گیا اور خود گدّی پر بیٹھنے کے نقشے بنانے لگا اور اُن قیدیوں کو رہا کرنے کا منصوبہ تیار کیا جو میر جعفر کے خلاف تھے؛ چنانچہ مُعظّم علی بھی رہا کر دیا گیا۔ وہ سیدھا مُرشد آباد پہنچا۔ اپنے ایک دوست کے ہاں قیام کیا۔ اُس کا اپنا مکان نیلام ہو چکا تھا۔ ایک رات اُس نے اپنے ملازم صابر کے ہمراہ اپنے مکان کا صحن کھودا اور سراج الدّولہ کی دی ہُوئی ہیروں کی تھیلی نکال کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اُس کی زندگی کا مقصد فرحت اور اُس کے والدین کی تلاش تھی۔ وہ ہر راہرو سے پہلے اُن کا پتہ پُوچھتا۔ لوگ اُسے دیوانہ سمجھ کر ہنستے مگر وہ سرگرمی سے اُن کی تلاش میں لگا رہا۔ ایک بستی میں اُسے ایک بُوڑھے شخص نے بتایا کہ حُسین بیگ یہاں دو تین دن بیمار پڑ کر مُلکِ بقا کی طرف کُوچ کر چکا ہے اور

درۂ خیبر پر طورخم کی پاکستانی چوکی سے پاکستانی سرحد سیدھی نظر آتی ہے۔ یعنی دو ستونوں کے درمیان لٹکتی زنجیر کے اِدھر پاکستان اور اُس پار افغانستان ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ دائیں ہاتھ پہاڑی کے اوپر پاکستانی علاقہ افغانستان کے اندر ایک میل سے آگے ایک پہاڑی کی چوٹی تک چلا گیا ہے جہاں قلعہ نما چوکی پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہے۔ وہاں سے افغانستان کا علاقہ دُور دُور تک نظر آتا ہے۔ پہاڑی تک جاتی پگڈنڈی افغانی علاقے سے بالکل صاف دکھائی دیتی ہے۔
(کشورِ محمود و بابر ——— منظور ممتاز)

اُس کی بیوی اور بیٹی اُسے دفنا کر کہیں چلی گئی ہیں۔ ممکن ہے وہ لکھنؤ، حیدر آباد یا دہلی گئی ہوں کیونکہ اُن شہروں میں ان کے عزیز رہتے ہیں۔ مُعظّم علی نے دہلی اور لکھنؤ میں اُنہیں تلاش کیا اور پھر حیدر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک ہیرا بیچ کر اُس نے بہت سارے پیسے حاصل کر لیے تھے اور اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ان ہیروں کی وجہ سے وہ بے حد امیر ہو گیا ہے۔ اب اُس نے کچھ اور ملازم بھی رکھ لیے تھے۔ وہ حیدر آباد کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے کچھ شور سُنائی دیا۔ اُس نے ایک ملازم کو حالات کا جائزہ لینے بھیجا تو معلوم ہُوا کہ مرہٹوں نے ایک قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔ مُعظّم علی اور اُس کے ساتھیوں نے قافلے والوں کی مدد کی اور مرہٹوں کو مار بھگایا۔ اس قافلے کے سردار حیدر آباد کے مُتموّل تاجر شیخ فخر الدّین تھے۔ اُنھوں نے حیدر آباد میں مُعظّم علی کو اپنے گھر پر ٹھہرایا اور اُس کی شرافت اور بہادری سے متاثر ہو کر اپنی بھانجی عطیہ کا رشتہ دینا چاہا۔ مگر مُعظّم علی نے معذرت کرتے ہُوئے کہا کہ وہ فرحت کا ہے اور اُسے تلاش کر کے اُسی سے شادی کرے گا۔ حیدر آباد میں بھی اُسے فرحت کی تلاش میں ناکامی ہُوئی تو شیخ فخر الدّین کے مشورے سے اُس نے گھوڑوں کی تجارت کرنے کا فیصلہ کیا؛ چنانچہ کچھ گھوڑے خرید کر وہ لکھنؤ واپس آ گیا اور ایک حویلی خرید کر وہاں اپنا مال فروخت کرنے لگا۔ گھوڑوں کی تجارت میں اُسے معقول منافع ہُوا اور آہستہ آہستہ وہ ایک امیر تاجر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔

جس شخص سے مُعظّم علی نے حویلی خریدی تھی اُس نے درخواست کی تھی کہ وہ ایک بُوڑھی عورت اور اُس کی بیٹی کو حویلی کے خستہ حال کمرے میں رہنے کی اجازت دے دے کیونکہ اُن کا کوئی اور ٹھکانا اور سہارا نہیں اور وہ سلائی کر کے گزارہ کرتی ہیں۔

ایک دن مُعظّم علی گھوڑے پر سوار آ رہا تھا کہ بُوڑھی عورت کی بیٹی اُس کے گھوڑے سے ٹکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ لڑکی کے گرنے سے اُس کے چہرے پر سے نقاب اُتر گئی اور مُعظّم علی کی مسرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکی فرحت ہے۔ قدرت کی عجب ستم ظریفی تھی کہ جس لڑکی کی تلاش میں وہ شہر شہر گھومتا رہا وہ اُسی کی حویلی کے ایک کمرے میں کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اُس نے فوراً طبیب کو بُلایا جس سے فرحت کو ہوش آ گیا۔ مُعظّم علی نے گلہ کرتے ہُوئے کہا:

"مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم لوگ یہاں رہتے ہو؟"

فرحت نے جواب دیا: "مجھے خطرہ تھا کہ آپ مجھے پہچاننے سے اِنکار کر دیں گے کہ اب ہماری پہلی سی حیثیت نہیں رہی۔"

"مَیں نے تمہیں حیدر آباد، لکھنؤ اور دہلی ہر جگہ تلاش کیا مگر تم نہ ملیں۔ بعد میں تمہیں پہچاننے سے کیونکر اِنکار کر سکتا تھا؟" تھوڑی دیر بعد فرحت اور اُس کی ماں بالاخانے کے تین کشادہ اور ہوادار کمروں میں مُنتقل کر دی گئیں جہاں ضرورت کی ہر چیز مہیا تھی۔ کچھ عرصے بعد مُعظّم علی اور فرحت کی شادی ہو گئی۔ وہ امن و سکون سے رہنے لگے۔

ایک دن اچانک ایک سوار آیا اور اُس نے مُعظّم علی کو نجیبُ الدّولہ کا پیغام دیا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں۔ مُعظّم علی حیران ہوا مگر فوراً تیار ہو کر نجیب الدّولہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ نجیب الدّولہ نے بتایا کہ اُس کے دوست اکبر خاں نے جو روہیل کھنڈ کا ایک سردار ہے، وہ اب مرہٹوں کے خلاف اس کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔

مُعظّم علی، جو قومی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا نجیبُ الدّولہ کی پیشکش ٹھکرا نہ سکا اور اُس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی سرکردگی میں فیصلہ کُن جنگ پانی پت کے قریب لڑی گئی۔ اس میں مرہٹوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی مدد شجاع الدّولہ، حافظ رحمت خاں اور نجیب الدّولہ کر رہے تھے۔ اس کے باوجود اُس کی فوج مرہٹوں کے مقابلے میں بہت کم تھی مگر تائیدِ ایزدی سے فتح حاصل ہوئی اور بے شمار مرہٹے مارے گئے۔ اکبر خاں اور مُعظّم علی نے خوب دادِ شجاعت دی۔ خود احمد شاہ ابدالی اُن کی جُراُت اور بہادری اور بے خوفی کا مُعترِف تھا۔ اس جنگ میں شجاع الدّولہ کا کردار قابلِ تعریف نہ تھا اور وہ آخری وقت تک مرہٹوں سے صُلح کی ترغیب دیتا رہا۔ ابدالی کی فوج فتح کے شادیانے بجاتی دہلی آ گئی۔ جمعے کے روز جامع مسجد میں مُعظّم علی نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس نے سُننے والوں کو بے حد متاثر کیا مگر شجاع الدّولہ اس سے ناراض ہو گیا؛ چنانچہ جب وہ گھر واپس آیا تو شجاع الدّولہ نے اُس کی نگرانی پر اپنے آدمی مامور کر دیے۔

مُعظّم علی لوگوں کو انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف اُبھارتا رہتا تھا۔ وہ جاہ پرست حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کو طنز کا نشانہ بنایا کرتا۔ اُس کی یہ تمام باتیں شجاع الدّولہ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ وہ مختلف ریاستوں کے مسلمان حکمرانوں کو خطوط لکھ کر قومی اتحاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ ایسے ہی خطوط اُس نے شجاع الدّولہ کو بھی لکھے۔ ان خطوط کو پڑھ کر وہ برافروختہ ہُوا اور مُعظّم علی کو بُلا کر کہا کہ اُس کے لیے حیدر آباد چلے جانا بہتر ہو گا۔ مُعظّم علی جانتا تھا کہ اگر اُس نے لکھنؤ نہ چھوڑا تو شجاع الدّولہ اُسے نہیں چھوڑے گا؛ چنانچہ وہ بیوی اور بچے کو لے کر حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ اُس وقت اکبر خاں بھی روہیل کھنڈ سے مُعظّم علی کو ملنے آیا ہُوا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ ہی حیدر آباد آ گیا۔ شیخ فخر الدّین نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی چھوٹی بھانجی بلقیس کی شادی اکبر خاں سے کر دی۔ اکبر خاں اپنی بیوی کو لے کر روہیل کھنڈ چلا گیا۔

ایک دن مُعظّم علی بازار میں گزر رہا تھا کہ اُس کی ملاقات اسد خاں سے ہو گئی۔ اسد خاں حیدر علی کا مُعتمدِ خاص تھا اور ایلچی کی حیثیت میں نظام سے ملنے آیا تھا۔ اسد خاں کی ملاقات مُعظّم علی سے پہلے دہلی میں ہو چکی تھی اور وہ اُس کے کارنامے سُن چکا تھا۔ اب مُعظّم علی کی داستان سُننے کے بعد اُس نے اُسے سرنگاپٹم چلنے کو کہا۔ اُس نے حیدر علی کی حُبّ الوطنی اور انگریز دشمنی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی کہ مُعظّم علی مسحور ہو گیا۔ اور اُس نے اسد خاں کے ساتھ سرنگاپٹم جانے کا فیصلہ کر لیا۔

(ا)

ہمہ یاراں دوزخ

اُردو ادب کے جواں ہمت ادیب اور مزاح نگار

صدیق سالک

کے قلم سے

اُن دنوں کی سرگزشت جب مشرقی پاکستان آخری ہچکی لے رہا تھا اور پاکستان کے جیالے فرزند تیغ و سناں سے محروم کر کے بھارت کے کیمپوں میں دھکیل دیے گئے تھے

ایک ایسی داستان جس میں آنسو اور آہیں بھی ہیں اور جراُت و عزیمت کے روشن شعلے اور برہمنی ذہنیت کی تاریک جھلکیاں بھی

قلیل مدت میں اس کتاب کے پانچ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں

قیمت: ۳۶ روپے

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور

مُعظّم علی سرنگاپٹم پہنچا تو اُسے پہلے مرحلے میں پانچ سو سواروں کا کمانڈار بنا دیا گیا۔ یہاں وہ شہزادہ ٹیپو کی شخصیت سے بے حد متاثر ہُوا جس کی عمر اس وقت صرف گیارہ سال تھی۔ شہزادے نے پانی پت کی لڑائی کے حالات اتنی تفصیل سے پُوچھے اور ایسے ایسے پیچیدہ سوال کیے کہ معظّم علی اُس کی جنگی مہارت پر حیران رہ گیا۔ سرنگاپٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے دن مُعظّم علی کے لیے قدرت کا بہترین انعام تھے۔ میسُور اُس کے خوابوں کی جنّت تھا۔ وہ پانچ سال کی مُدّت ہی میں اپنے جُرأت مندانہ کارناموں کی وجہ سے تین ہزار سواروں کا افسر بن گیا تھا۔ پھر اُس کی فوجی قابلیت کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے اُسے افسروں کی تربیت گاہ کا افسرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔

مرہٹوں کی چیرہ دستیاں پھر بڑھتی جا رہی تھیں۔ اُنہوں نے دہلی کے دربار میں بہت زیادہ اثر و رسُوخ حاصل کر لیا تھا۔ حیدر علی اُن سے اپنے علاقے واپس لے چکا تھا مگر وہ شجاع الدّولہ اور حافظ رحمت خاں کی مدد سے اُن پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے مُعظّم علی کو پانچ سو سواروں کے ساتھ اُدھر روانہ کیا۔ لکھنؤ پہنچ کر اُسے ایک وحشت ناک خبر ملی کہ شجاع الدّولہ نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا ہے اور اُن کی مدد سے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا ہے۔ شجاع الدّولہ سے ملاقات کے بعد اس کی تصدیق ہوگئی۔ اُس نے ہر ممکن طریقے سے شجاع الدّولہ کو انگریزوں کی مُعاونت سے باز رکھنا چاہا مگر وہ نہ مانا، لہٰذا مُعظّم علی فوراً روہیل کھنڈ کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ حیدر علی نے اُسے ایک خط حافظ رحمت خاں کے نام بھی دیا تھا۔ ایک دن وہ اور اُس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اُس وادی میں داخل ہو چکے تھے جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ شام کے دھندلکے میں معظّم علی نے دیکھا کہ اکبر خاں کا گاؤں آگ کا پڑاؤ معلوم ہو رہا ہے اور تھوڑی دُور فوج کے خیمے نصب ہیں۔ وہ چھپتے چُھپاتے اُن کے قریب پہنچا تو اُسے سپاہیوں کی گفتگو سے اندازہ ہُوا کہ یہ انگریز اور اَودھ کے سپاہی ہیں، اور اکبر خاں اُن کی قید میں ہے۔ اس کے بعد وہ اکبر خاں کے قبیلے کے لوگوں کی تلاش میں روانہ ہُوا۔ جلد ہی اُس کی مُلاقات اکبر خاں کی بیوی بلقیس سے ہو گئی جس نے اُسے بتایا کہ کس طرح انگریزوں نے اُن کی بستی کو جلا کر راکھ کر دیا اور وہ اکبر خاں کو قید کر کے لے گئے۔ معظّم علی نے اکبر خاں کے قبیلے کے لوگوں کو اکٹّھا کیا اور شب خُون مار کر اکبر خاں کو قید سے چُھڑا لیا اور بہت سے انگریز قید کر لیے۔ چونکہ حافظ رحمت خاں جنگ میں شہید ہو چکے تھے اور روہیل کھنڈ کی جنگ ہاری جا چکی تھی اس لیے اکبر خاں اپنی بیوی کو لے کر حیدر آباد روانہ ہو گیا اور مُعظّم علی نے حیدر علی کو مایوسی کا پیغام جا پہنچایا۔

مُعظّم علی کا بڑا بیٹا صدیق علی سرنگاپٹم کے فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر بحری فوج میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہ منگلور میں تعینات کیا گیا تھا۔ مسعود علی اور انور علی برّی فوج میں تھے۔ اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا مُراد علی ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اِدھر شہزادہ ٹیپو اپنی جنگی قابلیت کا سکّہ بٹھاتا چلا گیا۔ اُس نے کرناٹک کے مضبوط ترین قلعے فتح کر لیے تھے۔ جب وہ ان فتوحات کے بعد ارکاٹ پہنچا تو اُس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ یہ ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرف سے ایک نوعُمر جرنیل کا استقبال تھا۔ حیدر علی بیمار تھا اور اُس کے قویٰ جواب دیتے جا رہے تھے۔ آخر کار وہ اس دنیا کی تگ و دو سے چُھٹکارا حاصل کر کے اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا پہنچا۔ ٹیپو نے عنانِ حکومت اُس وقت سنبھالی جب مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں انگریز حکّام صلاح مشورے کر رہے تھے کہ سرنگاپٹم پہنچنے کا آسان ترین راستہ کون سا ہے۔ سُلطان ٹیپو اپنی فوج کا نظم و نسق دُرست کرنے میں مصروف تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ جنرل اسٹیورٹ وِنڈی وِش اور جنرل میکلوڈ بدنور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُسے بدنور کی دفاعی قوّت پر اعتماد تھا اِس لیے اُس نے جنرل اسٹیورٹ کو جا لیا اور اُسے شکستِ فاش دی مگر اس دوران میں بدنور کا صوبے دار، حیدر علی کا لے پالک ایاز خاں انگریزوں کے ہاتھ بک چکا تھا۔

صدیق علی منگلور کی بندرگاہ سے اپنے جہاز پر اسلحہ اور بارُود لے کر روانہ ہُوا۔ اُسے فوجی سامان پہنچانے کے لیے کنڈاپور جانا تھا۔ اُس کے جہاز میں منگلور کا مشہور تاجر ناصر الدین بھی اپنی بیٹی رضیہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رضیہ کی بدنور کے گورنر سے منگنی ہو چکی تھی اور اب ان دونوں کی شادی بدنور میں ہونا قرار پائی تھی۔ صدّیق علی کا جہاز بحفاظت کنڈاپور جا پہنچا۔ وہاں رضیہ کا بھائی افتخارُ الدّین اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ صدّیق علی فوراً واپس جانا چاہتا تھا مگر کنڈاپور کے قلعہ دار نے اُسے روک لیا۔ اتّفاق یہ کہ مسعود اور اسد خاں بھی اسی محاذ پر آ چکے تھے۔ صدّیق علی نے تمام دن اُن کے ساتھ قلعے سے باہر پڑاؤ میں گزارا اور رات کو واپس اپنے جہاز پر پہنچ گیا۔ رات کو انگریزوں نے اُس کے جہاز پر گولہ باری کر دی اور اُس کا جہاز ڈبو دیا مگر صدیق علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہُوا کہ قلعے کی توپیں خاموش ہیں اور اُن پر سفید جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اُسے قلعے دار کی غدّاری کا علم ہو چکا تھا؛ لہٰذا اُس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے قلعے پر قبضہ کر لیا اور قلعے دار کو اُس کی غدّاری کے لیے پھانسی کی سزا دے دی۔ صبح جب انگریزوں کے جہاز قلعے میں داخل ہونے کے لیے آئے تو اُن کا استقبال قلعے کی توپوں نے کیا۔ صدّیق علی نے ناصر الدّین اور اُس کی بیٹی کو بدنور بھجوا دیا مگر افتخارُ الدّین وہیں رُک گیا۔ ناصر الدّین کو بدنور جا کر معلوم ہُوا کہ ایاز غدّاری کر چکا ہے اور اُسی کے حکم سے قلعے دار نے انگریزوں کو قبضہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ رضیہ ایک محبِّ وطن لڑکی تھی اور اب کسی قیمت پر بھی ایاز خاں سے شادی کرنے پر تیار نہ تھی۔ اُس کا باپ بھی اُس کا ہم خیال تھا۔ اسی دوران میں مسعود علی بدنور کے گورنر کے پاس مدد کے لیے پہنچا۔ اُس نے بڑی خوبصورتی سے اُسے ٹال دیا اور کہا کہ اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دینا بہتر ہے۔ وہ شہر سے نکل رہا تھا کہ رضیہ بھی مردانہ لباس میں اُس کے ساتھ آ ملی۔ اُس کا باپ وہیں رُک گیا تاکہ صوبے دار کو شک نہ ہو مگر وہ صوبے دار کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ مسعود علی نے رضیہ کو بتایا کہ اُس کا بھائی شہید ہو چکا ہے۔ رضیہ نے صدّیق علی کو ایاز کی غدّاری سے آگاہ کیا۔ اُسی وقت صدّیق علی کو اطلاع ملی کہ انگریزوں کی فوج اننت پور کی طرف بڑھ رہی ہے اور بدنور کے گورنر نے قلعے دار کو ہدایت بھیجی ہے کہ وہ قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دے۔ وہ فوراً تین سو سواروں کے ہمراہ اننت پور روانہ ہو گیا۔ اور رضیہ کو ہدایت کر گیا کہ وہ اُس کے والدین کے پاس سرنگاپٹم چلی جائے مگر رضیہ اُسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی اور اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ اُس کا محبوب تو خطرات کو گلے لگانے چلا جائے اور وہ آرام سے سرنگاپٹم روانہ ہو جائے۔ وہ سرنگاپٹم کے بجائے صدّیق علی کے پاس اننت پور جا پہنچی۔ انگریزوں کی فوج زیادہ تھی اور اننت پور میں اسلحہ بارُود اور خوراک کے ذخائر کی کمی تھی۔ چند روز کے مقابلے میں کئی سپاہی شہید ہو چکے تھے۔ ان میں صدیق علی کا بھائی مسعود علی بھی شامل تھا۔ صدّیق علی نے اس اُمید پر ہتھیار ڈال دیے کہ اس طرح انگریز، عورتوں اور بچّوں کو امان دے دیں گے مگر اُس کی یہ اُمید پُوری نہ ہُوئی اور انگریزوں نے عورتوں اور بچّوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ صدّیق علی نے احتجاج کیا تو اُسے گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ جب اُس پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی تو رضیہ بھاگ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اُس نے اپنے محبوب کے ساتھ ہی جامِ شہادت نوش کیا۔

مُعظّم علی کو صدّیق علی اور مسعود کی شہادت کی خبر سُلطان ٹیپو کے خط کے ذریعے ملی جس میں اظہارِ افسوس کے بعد کہا گیا تھا کہ اگرچہ سرنگاپٹم کی تربیت گاہ میں اُس کی زیادہ ضرورت ہے لیکن وہ چاہے تو کسی مناسب آدمی کو اپنی ذمّے داری سونپ کر محاذِ جنگ پر آ سکتا ہے۔

ایک ہفتے بعد معظم علی محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہوگیا۔ سُلطان ٹیپو نے اننت پور پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت اُس کے سُپرد کردی۔ اسی فوج میں معظم علی کا بیٹا انور علی بھی شامل تھا۔ معظم علی نے اننت پور کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اور شدید گولہ باری کی۔ قلعے کے انگریز کماندار نے رسد اور کمک سے مایُوس ہو کر سفید جھنڈا لہرا دیا۔ سفید جھنڈا دیکھ کر معظم علی نے گولہ باری بند کرادی۔ ایک انگریز افسر آیا اور کہنے لگا:

"اگر آپ ہمیں سداشیو گڑھ پہنچانے کا ذمہ لیں تو ہم یہ قلعہ آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔"

"جنگ بند کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔"

"اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمارے جنگی قیدیوں سے اچھا سلوک کریں گے؟"

"ہم تمہیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ میں تمہیں نِصف گھنٹے کی مہلت دیتا ہُوں۔ اس کے بعد قلعے پر گولہ باری شروع کردی جائے گی۔"

کوئی بیس منٹ بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا اور اننت پور پر مُعظم علی کا قبضہ ہوگیا۔ وہ قیدی جو بچ رہے تھے صدیق علی اور اُس کے ساتھیوں کے انتقام کا مطالبہ کرنے لگے۔ مُعظم علی نے اُنہیں یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ میں صدیق اور مسعود کا باپ ہُوں اور مسلمانوں کو اپنی روایات کا پاس ہونا چاہیے۔

اگلے دن مُعظم علی چار سو سپاہی قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر بدنور کی طرف روانہ ہُوا۔ سلطان ٹیپو کا لشکر پہلے ہی بدنور کا رُخ کرچکا تھا۔ معظم علی بدنور پہنچا تو لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ سُلطان کی فوج کا فرانسیسی توپ خانہ فصیل کے مشرقی دروازے پر گولہ باری کر رہا تھا۔ مُعظم علی اور اُس کے کچھ ساتھی اور کچھ فرانسیسی فصیل کے قریب پہنچ گئے۔

فصیل میں چھوٹا سا شگاف پڑچکا تھا۔ دو فرانسیسی گولیوں کی بوچھاڑ میں کبھی لیٹتے، کبھی اُٹھتے اور کبھی رینگتے فصیل کے پاس پہنچے۔ ایک نے گولہ فصیل کے شگاف میں رکھ دیا۔ اتنے میں دوسرا گولی کھا کر مرچکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ پہلا واپس مُڑا اور مشعل لے کر گولے کی طرف بڑھا مگر گولی کھا کر وہیں گر پڑا۔ مُعظم علی نے یہ منظر دیکھا تو وہ پُوری طاقت سے بھاگا۔ پھر مُنہ کے بل لیٹ گیا۔ اُس نے مشعل اُٹھالی اور گولے کی طرف بڑھا۔ پھر یکے بعد دیگرے اُس کی ران اور سینے میں دو گولیاں لگیں مگر وہ گرتے پڑتے بارودی گولے کے قریب پہنچ گیا اور مشعل گولے کے فیتے پر رکھ دی۔ وہ فوراً اٹھا اور پُوری طاقت سے واپس بھاگنے لگا مگر فصیل سے بیس گز دُور جاکر گر پڑا۔ ایک دھماکا ہُوا اور فصیل میں بہت بڑا راستہ بن گیا جس کے ذریعے سُلطانی فوج قلعے میں داخل ہوگئی۔

قلعہ فتح ہوچکا تھا۔ مُعظم علی ایک خیمے کے اندر بے ہوش پڑا تھا۔ سُلطان ٹیپو اُسے دیکھ گئے تھے اور طبیب کو ہدایت کر گئے تھے کہ اس کی جان ہر قیمت پر بچائی جائے۔ مُعظم علی کو ہوش آیا۔ انور علی اُس کے سرہانے کھڑے تھے۔ اُس نے انور علی سے کہا کہ اُس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ حق کے لیے زندہ رہے، حق کے لیے لڑے اور حق کے لیے جان دے۔ اُس کی یہ خواہش پوری ہوگئی ہے۔ دوسرے دن سُلطان ٹیپو اُسے پھر دیکھنے آئے۔ مُعظم علی نے آنکھیں کھولیں اور سلطان کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور کہا: "خدا آپ کو فتح دے۔" پھر سُلطان کے ہاتھ پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مُرشد آباد کی تاریک رات کا مسافر میسُور کی حسین صُبح کے سامنے دم توڑ چکا تھا۔ سُلطان انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر اُٹھا۔ انور علی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا:

"بیٹا! اُن کی زندگی قابلِ تقلید اور اُن کی موت قابلِ رشک ہے۔"

۴۶ روپے کی خصوصی بچت

۱۵۶ روپے کے بجائے صرف ۱۱۰ روپے

اُردو ڈائجسٹ کے ایک سال کے ۱۲ شماروں کی قیمت اب ۱۲۰ رُوپے ہوتی ہے اور رجسٹری خرچ کے ساتھ مجموعی سالانہ قیمت ۱۵۶ روپے۔ اگر آپ سالانہ خریدار بن جائیں، تو آپ کو صرف ۱۱۰ روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ اس طرح آپ کو ۴۶ رُوپے کی بچت ہوگی۔ مزید فائدہ یہ ہوگا کہ جو خصوصی نمبر شائع ہوں گے، اُن کی الگ قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

براہِ کرم ذیل کا کوپن پُر کر کے ۶۰ پیسے کے لفافے میں بذریعہ ڈاک ارسال کر دیجیے

میں ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کا ماہ ________ سے خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں

مجھے ۱۱۰ روپے کا وی پی کر دیں ________

نام و پتہ ________

آپ ہمیں ۱۱۰ رُوپے کا منی آرڈر بھی روانہ فرما سکتے ہیں، چیک وصول نہیں کیا جائے گا۔ ہر شمارہ بذریعہ رجسٹری ارسال ہوگا۔

مینجر اُردو ڈائجسٹ پبلیکیشنز، سمن آباد، لاہور۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۰

روزے کے رُوح پرور اثرات

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

نماز کے بعد دوسری عبادت جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کی ہے، روزہ ہے۔ روزے سے مراد یہ ہے کہ صبح سے شام تک آدمی کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز کرے۔ نماز کی طرح یہ عبادت بھی ابتدا سے تمام پیغمبروں کی شریعت میں فرض رہی ہے۔ پچھلی جتنی اُمتیں گزری ہیں سب اسی طرح روزے رکھتی تھیں جس طرح اُمتِ محمدی رکھتی ہے؛ البتہ روزے کے احکام، اور روزوں کی تعداد اور روزے رکھنے کے زمانے میں شریعتوں کے درمیان فرق رہا ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مذاہب میں روزہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے۔ اگرچہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سی باتیں ملا کر اس کی شکل بگاڑ دی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہُوا کہ:

"اے مسلمانو! تم پر روزہ اُسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا تھا۔" (البقرہ۔۱۸۳)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو شریعتیں آئی ہیں وہ کبھی روزے کی عبادت سے خالی نہیں رہی ہیں۔

غور کیجیے کہ آخر روزے میں کیا بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو ہر زمانے میں فرض کیا ہے؟

مقصدِ زندگی — بندگیٔ رب

اسلام کا اصل مقصد انسان کی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت بنا دینا ہے۔ انسان عبد یعنی بندہ پیدا ہُوا ہے اور عبادت یعنی بندگی اس کی عین فطرت ہے۔ اس لیے عبادت بھی اعمال و عمل میں اللہ کی بندگی کرنے سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو آزاد نہ ہونا چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ اور ہر وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کس چیز میں ہے اور اُس کا غضب اور ناراضی کس چیز میں، پھر جس طرف اللہ کی رضا ہو اُدھر جانا چاہیے اور جس طرف اس کا غضب اور ناراضی ہو اُس سے یُوں بچنا چاہیے جیسے آگ کے انگارے سے کوئی بچتا ہے۔ جو طریقہ اللہ نے پسند کیا ہو اُس پر چلنا چاہیے اور جس طریقے کو اُس نے پسند نہ کیا ہو اُس سے بھاگنا چاہیے۔ جب انسان کی ساری زندگی اس رنگ میں رنگ جائے تب سمجھو کہ اُس نے اپنے مالک کی بندگی کا حق ادا کیا اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ

اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ[1] کا منشا پُورا ہو گیا۔

نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے نام سے جو عبادتیں ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کا اصل مقصد اسی بڑی عبادت کے لیے ہم کو تیار کرنا ہے۔ ان کو فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم نے دن میں پانچ وقت رکوع اور سجدہ کر لیا اور رمضان میں تیس دن صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کر لی اور مالدار ہونے کی صورت میں سالانہ زکوٰۃ اور عمر میں ایک مرتبہ حج ادا کر دیا تو اللہ کا جو کچھ حق تم پر تھا وہ ادا ہو گیا اور اس کے بعد تم اُس کی بندگی سے آزاد ہو گئے کہ جو چاہو کرتے پھرو، بلکہ دراصل اِن عبادتوں کو فرض کرنے کی غرض یہی ہے کہ ان کے ذریعے سے آدمی کی تربیت کی جائے اور اُس کو اس قابل بنا دیا جائے کہ اُس کی پُوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے۔ آئیے اب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح آدمی کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے۔

روزہ مخفی عبادت

روزے کے سوا دوسری جتنی عبادتیں ہیں، وہ کسی نہ کسی ظاہری حرکت سے ادا کی جاتی ہیں، مثلاً نماز میں آدمی اُٹھتا اور بیٹھتا اور رکوع اور سجدہ کرتا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حج میں ایک لمبا سفر کر کے جاتا ہے اور پھر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زکوٰۃ بھی کم از کم ایک شخص دیتا ہے اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ ان سب عبادتوں کا حال چھُپ نہیں سکتا۔ اگر آپ ادا کرتے ہیں تب بھی دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے، اگر ادا نہیں کرتے تب بھی لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف روزہ ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھُل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ نہ کھائے پیے مگر چھُپ کر پانی پی جائے یا کچھ چوری چھُپے کھا پی لے تو خدا کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔ ساری دُنیا یہی سمجھتی رہے گی کہ وہ روزے سے ہے اور وہ حقیقت میں روزے سے نہ ہو۔

---

[1] مَیں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا اسی لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ (الذّاریات - ۵۶)

روزہ ـــ ایمان کی مضبوطی کی علامت

روزے کی اس حیثیّت کو سامنے رکھّو، پھر غور کرو کہ جو شخص حقیقت میں روزے رکھتا ہے اور اس میں چوری چھُپے بھی کچھ نہیں کھاتا پیتا، سخت گرمی کی حالت میں بھی جب پیاس سے حلق چٹخا جاتا ہو، پانی کا ایک قطرہ حلق سے نیچے نہیں اُتارتا، سخت بھُوک کی حالت میں بھی جبکہ آنکھوں میں دم آ رہا ہو کوئی چیز کھانے کا ارادہ تک نہیں کرتا، اُسے اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے پر کتنا ایمان ہے۔ کس قدر زبردست یقین کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ اُس کی کوئی حرکت چاہے ساری دُنیا سے چھپ جائے مگر اللہ سے نہیں چھُپ سکتی۔ کیسا خوفِ خدا اُس کے دل میں ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف اُٹھاتا ہے مگر صرف اللہ کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اُس کے روزے کو توڑنے والا ہو۔ کس قدر مضبوط اعتقاد ہے اُس کو آخرت کی جزا و سزا پر کہ مہینے بھر میں وہ کم از کم تین سو ساٹھ گھنٹے کے روزے رکھتا ہے اور اس دوران میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں آخرت کے متعلّق شک کا شائبہ تک نہیں آتا۔ اگر اُسے اس بات میں ذرا سا بھی شک ہو کہ آخرت ہو گی یا نہ ہو گی اور اس میں عذاب و ثواب ہو گا یا نہ ہو گا تو وہ کبھی اپنا روزہ پُورا نہیں کر سکتا۔

ایک ماہ کی مسلسل ٹریننگ

اس طرح اللہ تعالیٰ ہر سال کامل ایک مہینے تک مسلمان کے ایمان کو مسلسل آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش میں جتنا جتنا آدمی پُورا اُترتا جاتا ہے اُتنا ہی اُس کا ایمان مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ یہ گویا آزمائش کی آزمائش ہے اور ٹریننگ کی ٹریننگ۔ آپ جب کسی شخص کے پاس امانت رکھواتے ہیں تو گویا اُس کی ایمانداری کی آزمائش کرتے ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں پُورا اُترے اور امانت میں خیانت نہ کرے تو اُس کے اندر امانتوں کا بوجھ سنبھالنے کی اور زیادہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ امین بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی مسلسل ایک مہینے تک آپ کے ایمان کو کڑی آزمائش میں ڈالتا ہے اور جب اس آزمائش میں آپ پُورے اُترتے ہیں تو آپ کے اندر اس بات کی مزید قابلیت پیدا ہونے لگتی ہے کہ اللہ سے ڈر کر دوسرے گناہوں سے بھی پرہیز کریں، اللہ کو عالم الغیب جان کر چوری چھُپے بھی اُس کے قانون کو توڑنے سے بچیں اور ہر موقع پر قیامت کا وہ دن آپ کو یاد آ جایا کرے جب سب کچھ کھُل جائے گا اور بغیر کسی رُو رعایت کے بھلائی کا بھلا اور بُرائی کا بُرا بدلہ ملے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ

”اے اہلِ ایمان! تمہارے اُوپر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے، شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔“ (البقرہ : ۱۸۳)

اطاعت کی طویل مشق

روزے کی ایک دوسری خصوصیّت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مدّت تک شریعت کی لگاتار اطاعت کراتا ہے۔ نماز کی مدّت ایک وقت میں چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت سال بھر میں صرف ایک دفعہ آتا ہے۔ حج میں البتّہ لمبی مُدّت صرف ہوتی ہے مگر اس کا موقع عمر بھر میں ایک دفعہ آتا ہے اور وہ بھی سب کے لیے نہیں۔ ان سب کے برخلاف روزہ ہر سال پُورے ایک مہینے تک شب و روز شریعتِ محمدی کے اتّباع کی مشق کراتا ہے۔

صبح سحری کے لیے اُٹھو، ٹھیک وقت پر کھانا پینا سب بند کر دو۔ دن بھر فلاں فلاں کام کر سکتے ہو اور فلاں فلاں کام نہیں کر سکتے۔ شام کو ٹھیک فلاں وقت پر افطار کرو، پھر کھانا کھا کر آرام لو۔ پھر تراویح کے لیے دوڑو۔ اس طرح ہر سال کامل مہینہ بھر صبح سے شام اور شام سے صبح تک مسلمان کو مسلسل فوجی سپاہیوں کی طرح پُورے قاعدے اور ضابطے میں باندھ کر رکھا جاتا ہے اور پھر گیارہ مہینے کے لیے اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جو تربیت اس ایک مہینے میں اُس نے حاصل کی ہے، اُس کے اثرات ظاہر ہوں اور جو کمی پائی جائے وہ پھر دوسرے سال کی ٹریننگ میں پُوری کی جائے۔

تربیت کے لیے سازگار اجتماعی ماحول

اس قسم کی تربیت کے لیے ایک شخص کو الگ الگ لے کر تیّار کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہوتا۔ فوج میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ایک شخص کو الگ الگ قواعد نہیں کرائی جاتی بلکہ پُوری فوج ایک ساتھ قواعد کرتی ہے۔ سب کو ایک وقت کے بگل کی آواز پر اُٹھنا اور بگل کی آواز پر کام کرنا ہوتا ہے تاکہ اُن میں جماعت بن کر متّفقہ کام کرنے کی عادت ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ سب ایک دوسرے کی تربیت میں مددگار بھی ہوں، یعنی ایک شخص کی تربیت میں جو کچھ نقصان رہ جائے اُس کی کمی کو دوسرا اور دوسرے کی کمی کو تیسرا پُورا کر دے۔

اسی طرح اسلام میں بھی رمضان کا مہینہ روزے کی عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ایک وقت میں سب کے سب مل کر روزہ رکھیں۔ اس حکم نے انفرادی عبادت کو اجتماعی عبادت بنا دیا۔ جس طرح ایک کے عدد کو لاکھ سے ضرب دو تو لاکھ کا زبردست عدد بن جاتا ہے، اس طرح ایک ایک شخص کے روزہ رکھنے

سے جو اخلاقی اور رُوحانی فائدے ہو سکتے ہیں، لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے مل کر روزہ رکھنے سے وہ لاکھوں کروڑوں گُنا زیادہ بڑھ جاتے ہیں ـــ رمضان کا مہینہ پُوری فضا کو نیکی اور پرہیزگاری کی رُوح سے بھر دیتا ہے۔ پُوری قوم میں گویا تقویٰ کی کھیتی سرسبز ہو جاتی ہے۔ ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ اگر اُس میں کوئی کمزوری ہوتی ہے تو اُس کے دوسرے بہت سے بھائی جو اُسی کی طرح روزہ دار ہیں، اُس کے پُشت پناہ بن جاتے ہیں۔

ہر شخص کو روزہ رکھ کر گُناہ کرتے ہُوئے شرم آتی ہے اور ہر شخص کے دل میں خود بخود یہ خواہش اُبھرتی ہے کہ کچھ بھلائی کے کام کرے۔ کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کسی جگہ اگر کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اُس میں حصّہ لے اور اگر کہیں علانیہ بدی ہو رہی ہو تو اُسے روکے۔ نیکی اور تقویٰ کا ایک عام ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور بھلائیوں کے پھلنے پھُولنے کا موسم آجاتا ہے جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلّہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھُولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہُوا نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"آدمی کا ہر عمل خُدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے، ایک نیکی دس گُنی سے سات سو گُنی تک پھلتی پھُولتی ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ اِس سے مُستثنیٰ ہے۔ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں اُس کا جتنا چاہتا ہُوں بدلہ دیتا ہُوں۔"

اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ نیکی کرنے والے کی نیّت اور نیکی کے نتائج کے لحاظ سے تمام اعمال پھلتے پھُولتے ہیں اور اُن کی ترقی کے لیے ایک حد ہے مگر روزے کی ترقی کے لیے کوئی حد نہیں۔ رمضان چونکہ خیر اور صلاح کے پھلنے اور پھُولنے کا موسم ہے اور اس موسم میں ایک شخص نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں مسلمان مل کر اس نیکی کے باغ کو پانی دیتے ہیں اس لیے یہ بے حدّ و حساب بڑھ سکتا ہے۔ جتنی زیادہ نیک نیّتی کے ساتھ اس مہینے میں عمل کرو گے، جس قدر زیادہ برکتوں سے خود فائدہ اُٹھاؤ گے اور اپنے دوسرے بھائیوں کو فائدہ پہنچاؤ گے اور پھر جس قدر زیادہ اس مہینے کے اثرات بعد کے گیارہ مہینوں میں باقی رکھو گے، اُتنا ہی یہ پھلے پھُولے گا اور اس کے پھلنے اور پھُولنے کی کوئی انتہا نہیں۔ تم خود اپنے عمل سے اس کو محدود کر لو تو یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔

عباداتت کے نتائج اب کہاں ہیں؟

روزے کے یہ اثرات اور یہ نتائج سُن کر آپ میں سے ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ یہ اثرات آج کہاں ہیں؟ ہم روزے بھی رکھتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں، مگر یہ نتیجے جو تم بیان کرتے ہو ظاہر نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ تو میں آپ سے پہلے بیان کر چکا ہُوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اجزا کو الگ الگ کر دینے کے بعد اور بہت سی نئی چیزیں اس میں ملا دینے کے بعد آپ اُن نتائج کی توقع نہیں کر سکتے جو پُورے نظام کی بندھی ہُوئی صورت ہی میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادات کے متعلق آپ کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ اب آپ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محض صبح سے شام تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام عبادت ہے اور جب یہ کام آپ نے کر لیا تو عبادت پُوری ہو گئی۔ اسی طرح دوسری عبادتوں کی بھی محض ظاہری شکل کو آپ عبادت سمجھتے ہیں، اور عبادت کی اصلی رُوح جو آپ کے ہر عمل میں ہونی چاہیے اُس سے عام طور پر آپ کے ۹۹ فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی غافل ہیں۔ اسی وجہ سے یہ عبادات اپنے پُورے فائدے نہیں دکھاتیں، کیونکہ اسلام میں تو نیّت اور فہم اور سمجھ بُوجھ ہی پر سب کچھ منحصر ہے۔

ملعون وہ ہے جو اپنی ضروریات کے لیے اپنے ہی جیسی مخلوق یعنی انسانوں پر اعتماد کرتا ہے۔ (الحدیث)

دُنیا کی سو عظیم کہانیاں ①

سخی ناتھن

ستّار طاہر

پانچ سو برس پہلے ۱۳۵۴ء میں اطالوی شاعر، کہانی کار اور دانتے کے شارح گیووانی بوکیشیو نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'ڈیکمرون' مکمل کی۔ تب سے اب تک اس کے تراجم دُنیا کی ہر زبان میں کئی کئی بار ہو چکے ہیں۔ 'ڈیکمرون' کو عالمی ادب میں لافانی مقام حاصل ہے۔ یہاں اسی کتاب کی ایک بے مثل اور ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانی کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مُلکِ خَتا میں معزّز حسب نسب اور اعلیٰ خاندان کا ایک شخص رہتا تھا۔ اُس کا نام تھا ناتھن۔ اتنا دولت مند کہ دوسرا کوئی اُس کا ہمعصر نہ تھا۔ تاہم اُس کا شہرہ دولت مندی سے زیادہ فیّاضی کی وجہ سے تھا۔ وہ انسانوں کے کام آتا اور کسی سائل کو خالی نہ جانے دیتا۔ ناتھن نے شاہراہِ عظیم پر جہاں سے لوگ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتے تھے، ماہر معماروں اور ہُنرمند کاریگروں کی خدمات حاصل کر کے شاندار محلّات تعمیر کروائے۔ جب وہ تکمیل کو پہنچے تو اُن کی سجاوٹ اور تزئین پر بے انتہا روپیہ خرچ کیا۔ پھر اُن میں ضرورت کی ہر وہ چیز مہیّا کر دی جو کسی وقت بھی انسانوں کے کام آسکتی ہے۔ ان محلّات کے دروازے شب و روز کھُلے رہتے۔ مسافروں، مہمانوں، غریبوں، بُھوکوں اور ضرورت مندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ خدمت گذاروں کے ساتھ ناتھن خود بھی دن رات لوگوں کی خدمت میں لگا رہتا۔ اُس کے دَر سے کوئی مایُوس نہ لوٹتا تھا۔ ناتھن کی فیّاضی اور مہمانوازی کی شہرت مُلکِ خَتا سے نکل کر دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ مُلکِ خَتا سے بہت دُور کسی دوسرے مُلک میں نیک نہاد اور اعلیٰ حسب نسب کا ایک فیّاض، غریب پرور اور مہمان نواز نوجوان بھی رہتا تھا۔ جس کا نام میتھرڈینز تھا۔ جب اُس کے کانوں تک ناتھن کی شہرت پہنچی تو وہ اُس کی شہرت سے حسد کرنے لگا۔ اُسے گمان تھا کہ اُس سے زیادہ سخی اور فیّاض دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ حسد کے جذبے کے تحت زیادہ سے زیادہ شہرت حاصل کرنے کے لئے اُس نے بھی ناتھن کی تقلید میں محلّات تعمیر کروائے۔ اُن کی آرائش پر پیسہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ اب وہ شہرت میں ناتھن کو مات کر دے گا۔

کرنا خدا کا ایسا ہُوا کہ ایک روز ایک گداگر عورت میتھرڈینز کے پاس آئی۔ میتھرڈینز نے اُسے خیرات دی۔ کچھ وقفے سے وہ دوبارہ آگئی۔ میتھرڈینز نے دل پر جبر کر کے اُسے دوبارہ خیرات دے دی۔ وہ گداگر عورت

بھی عجیب بھی کہ بار بار جھولی پھیلائے پھر آجاتی۔ کبھی غصّے میں، کبھی جھنجھلا کر میتھر ڈینیز اُسے خیرات دیتا گیا۔ جب وہ تیرھویں بار جھولی پھیلائے پھر آئی تو میتھر ڈینیز کے ہاتھ سے صبر اور تحمّل کا دامن چھوٹ گیا اور اُس نے ڈانٹ کر بوڑھی عورت سے کہا:

"اے عورت! تُو بہت لالچی ہے اور میرے لئے دردِ سر بن گئی ہے۔"

گداگر عورت نگاہیں اُوپر اُٹھا کر نیم طنزیہ انداز میں کہنے لگی:

"فیّاضی تو ناتھن پر ختم ہے۔ دنیا میں کوئی اُس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ مَیں ایک دن میں پینتیس بار اُس کے سامنے خیرات لینے گئی اور ایک بار بھی اُس کی پیشانی پر بل نہ آیا ہر بار اُس نے پہلے سے بڑھ کر مُجھے خیرات دی۔ ہر بار وہ پہلے سے کہیں زیادہ خندہ پیشانی سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اور تیرے پاس مَیں ابھی صرف تیرھویں بار آئی ہُوں کہ تُو مجھ سے بیزار ہو گیا، تیری فیّاضی تھک گئی ہے۔ واقعی ناتھن بے مثل ہے۔"

میتھر ڈینیز جو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شہرت اور فیّاضی میں وہ ناتھن کو مات دے چکا ہے، اس عورت کی گفتگو سُن کر جل بھُن گیا۔ اُس کے دل میں حسد کے شعلے تیز ہو گئے۔ اُس نے سمجھ لیا کہ ناتھن اُس کی شہرت کی راہ میں دیوار اور سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اب مجھے اس دیوار کو راہ سے ہٹا دینا چاہیے تاکہ میرا موازنہ ناتھن کے ساتھ نہ ہوتا رہے۔ اور مَیں اپنی مثال آپ بن جاؤں۔ میتھر ڈینیز نے ناتھن کو اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس نے اپنے اس منصوبے کی بھنک کسی کو پڑنے نہیں دی۔ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سفر پر روانہ ہوا اور تیسرے دن ناتھن کے علاقے میں جا نکلا۔ ناتھن کے تعمیر کردہ شاندار محلّات کو دیکھ کر متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا، کیونکہ اُس کے اپنے تعمیر کرائے ہُوئے محلات کے مقابلے میں یہ زیادہ خوبصورت، شاندار اور پُر آسائش تھے۔ یکتری کے احساس نے اُس کے ارادے کو پختہ کر دیا کہ وہ ناتھن کو ختم کر کے ہی رہے گا۔

اُس نے اپنے ساتھ آنے والے چند ملازموں کو حکم دیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ وہاں ٹھہر جائیں اور کسی کو علم نہ ہونے دیں کہ اُن کا آپس میں کوئی تعلّق بھی ہے۔

شام کا وقت تھا، میتھر ڈینیز ناتھن کے بنائے ہوئے ایک محل کے پاس پہنچا۔ بُوڑھا ناتھن چھڑی کا سہارا لیے سیر کو نکلا ہُوا تھا۔ میتھر ڈینیز نے کبھی ناتھن کو دیکھا نہ تھا وہ اُسے پہچان نہ سکا اور اُسے ایک بُوڑھا خدمت گذار سمجھا۔

"میں ناتھن کے محل میں جانا چاہتا ہُوں۔"

بُوڑھا جو ناتھن ہی تھا، اُس نے بڑے تپاک سے میتھر ڈینیز کو خوش آمدید کہا:

"حضور تشریف لائیے، مجھے اپنا خادم سمجھیئے۔ مَیں آپ کو ناتھن کے ذاتی محل تک پہنچائے دیتا ہُوں۔"

"بڑے میاں! اگر تم مجھے ناتھن کے محل میں اس طرح پہنچا دو کہ ناتھن مجھے دیکھ نہ سکے۔ نہ اُسے میری آمد کا پتہ چلے تو مَیں تمہیں بہت انعام دوں گا۔"

اتنی بات کہہ کر میتھر ڈینیز نے بات بناتے ہوئے کہا:

"مَیں اُس کی بڑی شُہرت سُن کر آیا ہوں اور اُس کا امتحان لینا چاہتا ہُوں۔"

ناتھن نے بڑے ادب سے جواب دیا:

"حضُور! میں آپ کا خادم ہُوں۔ آپ جو حکم دیں گے، بجا لاؤں گا۔ ناتھن کو آپ کی آمد کا بالکل علم نہ ہو گا۔"

میتھر ڈینیز بہت مسرور ہوا کہ اُس کی قسمت اُس کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی اپنے ڈھب کا آدمی بھی مل گیا ہے۔ وہ ناتھن کے ساتھ چل پڑا۔ جو بڑے ادب، خوش خُلقی اور احترام کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جب ناتھن کا محل سامنے آگیا تو وہ جلدی سے چند قدم آگے بڑھا اور ایک خاص ملازم کو بُلا کر چپکے چپکے حکم دیا:

"جلدی سے محل میں جا کر سب کو مطلع کر دو کہ اس نوجوان

مہمان کے سامنے کوئی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ مَیں ناتھن ہُوں۔ اگر یہ مہمان میرے بارے میں پُوچھ گچھ کرے تو اسے یہی جواب دیا جائے کہ مَیں یہاں کا ایک پُرانا ملازم اور خدمتگار ہُوں۔"

ناتھن کا ملازم اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کے لیے فوراً محل کے اندر چلا گیا۔

ناتھن اپنے مہمان میتھر ڈینز کو ساتھ لیے اپنے محل کے اندر پہنچا۔ اُسے ایک شاندار، خوبصورت اور پُر آسائش کمرہ میں ٹھہرایا۔ اس کے بعد دل وجان سے اُس کی آؤ بھگت میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے نوجوان میتھر ڈینز کے ہر حکم کی تعمیل کی۔ ضرورت کی ہر چیز اُس کے سامنے پیش کی۔ میتھر ڈینز بُوڑھے کی مُستعدی، خدمت گذاری اور اخلاق سے متاثّر ہو کر پُوچھنے لگا کہ وہ کون ہے۔

ناتھن نے بڑے ادب سے جواب دیا:

"میں اپنے آقا ناتھن کا ایک ادنیٰ خدمت گار ہُوں۔ اُس کی خدمت کرتے بُوڑھا ہو گیا ہُوں۔ میرے مالک نے مجھے پُوری آزادی دے رکھّی ہے۔ دوسرے ملازم بھی میرے بڑھاپے کی وجہ سے میری عزّت کرتے ہیں۔ مَیں جو چاہوں کروں، کوئی اس میں مداخلت نہیں کرتا۔" اتنا کہہ کر ناتھن نے کچھ توقّف کے بعد پھر زبان کھولی:

"مَیں حضُور کا بھی خادم ہُوں۔ آپ جو حکم دیں گے، بلا خوف و خطر بجا لاؤں گا۔"

اس کے بعد ناتھن نے بڑے غیر محسوس انداز میں نوجوان میتھر ڈینز سے اُس کے بارے میں گفتگو شروع کر دی کہ وُہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میتھر ڈینز بُوڑھے پر بہت اعتماد کرنے اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ بُوڑھا ملازم اُس کا رازدار بن سکتا ہے اور وہ اُسے اپنے منصُوبے کی تکمیل کے لیے استعمال میں لا سکتا ہے، کیونکہ وہ بہت سیدھا اور احمق ہے، تاہم کچھ جھکتے اور کچھ ہچکچاتے ہوئے میتھر ڈینز نے اُسے بتا دیا کہ وہ کون ہے اور کس ارادے سے وہاں پہنچا ہے۔

ناتھن کو بے حد تعجب ہُوا کہ یہ نوجوان حسد کی وجہ سے اُسے قتل کرنے آیا ہے لیکن اُس نے اپنا ردِّ عمل کسی تاثّر اور حرکت سے ظاہر نہ ہونے دیا، بلکہ بڑے مؤدّب لہجے میں کہا:

"میرے محترم نوجوان! آپ حد درجہ معزّز اور نیکوکار انسان ہیں۔ آپ نے بھی فیّاضی کا راستہ چُنا ہے اور پھر اس عمر میں، جب نوجوانوں کے مشاغل کچھ مختلف ہوتے ہیں، آپ تو بہت عظیم ہیں۔ مَیں نے محسوس کر لیا ہے کہ ناتھن کی شُہرت اور اُس کے وجُود کو آپ کے راستے کی رُکاوٹ نہیں بننا چاہیے اور آپ جیسے فیّاض، مخیّر اور نیک نوجوان کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ یقین کیجیے آپ کا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ آپ مجھے حکم دیں کہ مَیں آپ کے اس ارادے کی تکمیل میں کیا اعانت کر سکتا ہُوں۔"

میتھر ڈینز کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بُوڑھے کی بھولی بھالی معصُوم شکل، اُس کے اخلاق اُس کی شائستگی سے وہ پہلے ہی متاثّر ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا:

"محترم بزرگ! اپنے منصُوبے کی تکمیل کے لیے بلاشُبہ مجھے آپ کی اعانت درکار ہے۔ بتائیے کہ مَیں کس طرح اکیلے میں خاموشی سے ناتھن کا خاتمہ کر سکتا ہُوں۔ اور کسی کو علم بھی نہ ہو۔"

بُوڑھے ناتھن نے چند لمحے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف درختوں کا ایک جُھنڈ ہے۔ ناتھن ہر روز صبح وہاں سیر کے لیے جاتا ہے۔ اُس وقت وہ تنہا ہوتا ہے۔ آپ کے راستے میں کوئی رُکاوٹ پیدا کرنے والا موجُود نہ ہو گا۔

آپ صُبح وہاں پہنچ جائیں۔ اپنے ارادے پر عمل کر کے ناتھن کو ہلاک کر دیں۔ آپ وہیں سے سیدھے اپنے گھر کی راہ لیں ـــــ اس جُھنڈ کے داہنے ہاتھ ایک راستہ نکلتا ہے وہ آپ کو کسی کی نگاہوں میں لائے بغیر سیدھا آپ کی منزل تک پہنچا دے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے گی کہ ناتھن کے قتل کا ذمّے دار کون ہے۔"

ناتھن کے اس مشورے پر میتھر ڈینز نے عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دیر تک ناتھن نوجوان میتھر ڈینز کی خدمت اور آؤ بھگت میں لگا رہا۔ پھر اُس کی اجازت لے کر شب بخیر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن صبح کے وقت میتھر ڈینز نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ فلاں راستے پر جا کر اُس کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ ناتھن کو ختم کرنے کی تیاری کر کے کمرے سے نکل کھڑا ہُوا......

ناتھن صُبحِ کاذب کے وقت ہی اُٹھ کر درختوں کے اُس جُھنڈ کے نیچے گیا تھا۔ وہ اپنے نوجوان مہمان میتھر ڈینز کے ہاتھوں مرنے کے لیے بخوشی تیار ہو چکا تھا۔

میتھر ڈینز نے جُھنڈ کے پاس پہنچ کر آس پاس کا بغور جائزہ لیا۔ اُسے دُور دُور تک کوئی شئے دکھائی نہ دی۔ اُسے بُوڑھے کی اطلاع پر یقین آ گیا۔ وہ جُھنڈ کے اندر داخل ہُوا جہاں ناتھن موجُود تھا۔ اُس نے سر پر پگڑی باندھ رکھّی تھی۔ اور پلّو سے اپنا مُنہ چُھپا رکھا تھا۔ میتھر ڈینز نے دل میں کہا کہ اسے ہلاک کرنے سے پہلے میں اس کا چہرہ ضرُور دیکھوں گا، اور اسے بتاؤں گا کہ مَیں اُسے کیوں قتل کر رہا ہُوں۔ تیزی سے ناتھن کے پاس پہنچ کر اُس نے تلوار نیام سے نکالی اور بولا:

"ناتھن! چند منٹ کے بعد تم ایک لاش ہو گے مگر مَیں تمہارا چہرہ ضرور دیکھوں گا۔"

یہ کہہ کر میتھر ڈینز نے تلوار کی نوک سے اُس کی پگڑی زمین پر اُچھال دی۔

اُس کے سامنے وہی بُڈّھا کھڑا تھا جس نے اُسے یہاں کا راستہ بتایا تھا۔

بُڈّھے ناتھن نے ادب سے کہا:

"میرے معزّز مہمان! اگر تم میری موت سے خوشی حاصل کر سکتے ہو تو مَیں اس کو اپنی خُوش قسمتی سمجھُوں گا۔"

میتھر ڈینز ششدر اور ہکّا بکّا کھڑا رہ گیا۔ اُس کی

عید مبارک!

الفلاح پنکھے

ALFALAH

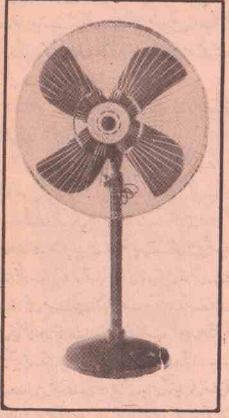

خوبصورت * پائیدار * چلنے میں دیرپا

منجانب

حافظ الیکٹرک کمپنی

شاہدولہ روڈ، چاہ بیری والا۔ گجرات

رجسٹرڈ نمبر ۳۳۱۹ء — فون فیکٹری ۳۴۸۰۶ — فون رہائش ۳۵۵۲

آنکھیں بے اختیار آنسو بہانے لگیں۔ وہ ناتھن کے قدموں میں جھک کر کہنے لگا:

"میرے محترم اور مقدس بزرگ! مَیں آپ کی بڑائی کا دل سے قائل ہو گیا ہُوں۔ آپ کے سامنے مَیں کتنا ہیچ اور حقیر ہُوں! اور آپ کتنے عظیم ہیں کہ مَیں آپ سے آپ کی جان لینے کی باتیں کرتا رہا اور آپ سچے دل سے میری خدمت کرتے رہے۔ آپ نے میرے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے خود کو تیار کر لیا اور قتل ہونے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ حسد نے میرے باطن کی جو آنکھیں بند کر دی تھیں آپ نے اُنہیں اپنی عظمتوں سے کھول دیا ہے۔ آپ مجھ سے انتقام ضرور لیں۔ اب اسی طرح میری رُوح کو سکُون مِل سکے گا۔ یہ تلوار اُٹھائیں اور مجھ جیسے ہیچ اور پست انسان کا سر کاٹ دیں۔"

ناتھن نے اُسے اپنے قدموں سے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور آہستگی سے کہنا شروع کر دیا:

"میرے عزیز! میرے فرزند! تمہارے منصوبے کو مَیں بُرا کہوں گا نہ تم سے انتقام لُوں گا۔ یقیناً تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو، مگر کیوں؟ اس لئے کہ تم نے بھی نیکی اور فیاضی و سخاوت کا راستہ اپنایا ہے۔ اور تم چاہتے تھے کہ ایسی شُہرت ملے جو مجھ سے زیادہ ہو۔ تمہارا بُنیادی جذبہ قابلِ ستائش ہے میرے عزیز! مَیں تم سے کیسے انتقام لے سکتا ہُوں۔ تم نے نوجوانی میں فیاضی اور سخاوت اپنائی۔ اپنی دولت غریبوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کرنے کا حوصلہ کتنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ تمہارے لیے میرے دل میں محبّت کے سوا کچھ نہیں۔ اس دُنیا جہاں انسان اپنے بھائیوں کے حقُوق سلب کرتے ہیں، اس کے لیے جنگ لڑتے ہیں، دُوسرے مُلکوں پر قبضہ کرتے ہیں، اُن کی ہوس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس دُنیا اور ایسے انسانوں میں اگر کوئی اپنی دولت نیکی اور سخاوت کے کاموں میں صَرف کر کے یہ توقّع رکھتا ہے کہ اُس کی نیک نامی اور شُہرت سب سے بڑھ جائے تو مَیں اسے جُرم نہیں سمجھتا۔"

ناتھن نے میتھر ڈینز کے آنسو پونچھے اور اُسے پیار سے تھپکا اور میتھر ڈینز نے رُندھی آواز میں پُوچھا:

"میرے محترم اور مقدّس بزرگ! جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔ پھر آپ اتنی جلد اپنی زندگی میرے ہاتھوں ختم کرانے پر کیسے آمادہ ہو گئے؟"

ناتھن نے آہستہ سے جواب دیا:

"میرے محلّات سے آج تک کوئی مایُوس نہیں لَوٹا۔ کسی نے جو مانگا وہی پا لیا۔ تم سے پہلے اگر کوئی میری جان مانگتا تو مَیں اپنی جان دے چکا ہوتا۔ میرے فرزند! تم نے مجھ سے میری زندگی مانگی، بھلا مَیں اپنی روایت سے کس طرح انحراف کر سکتا تھا۔ مَیں تمہیں کس طرح خالی لَوٹا سکتا تھا اس لیے اپنی جان دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ مَیں تمہیں ناخوش اور مایُوس کرنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا اور پھر ذرا سوچو تو مَیں اَسّی برس کا ہو چکا ہُوں۔ اب میری زندگی ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ مَیں تو دل ہی دل میں تمہارا احسان مان رہا ہُوں کہ تم نے اس بُوڑھی اور بے وُقعت جان طلب کر کے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔"

میتھر ڈینز پھر رونے لگا اور ہانپتی آواز میں بولا:

"آپ کی زندگی کتنی قیمتی ہے! کاش میرے بس میں ہوتا تو مَیں اپنی زندگی آپ کو دے دیتا۔"

ناتھن شفقت سے مُسکرایا اور کہنے لگا:

"میرے عزیز! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم میری جگہ ناتھن بن کر رہو۔ مَیں تمہاری جگہ چلا جاتا ہُوں۔ تم اس طرح ناتھن بن جاؤ گے اور ساری شُہرتیں تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گی۔ مَیں تمہاری جگہ لے کر اپنی عمر کے آخری ایّام کم شُہرت میں بسر کر لُوں گا۔"

میتھر ڈینز کا قلب تبدیل ہو چکا تھا۔ حسد کا اژدھا ناتھن کی عظمت نے قتل کر دیا تھا۔ اُس نے کہا:

"نہیں میرے بزرگ! آپ جیسا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مَیں وعدہ کرتا ہُوں کہ آپ جیسا بننے کی کوشش کرُوں گا"

ناتھن نے میتھر ڈینز کو اپنی دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

جوڑوں کا درد

سائنٹیفک معلُومات ـــ سائنٹیفک ہدایات

طب کی دُنیا میں تہلکہ بپا کر دینے والی کتاب کی تلخیص ـــ قسط نمبر ۲

محسن فارانی

خواتین کے بالوں کی صفائی کے لیے ماہرینِ جمال لیموں کا رس تجویز کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ لیموں کا رس کھوپڑی کی زائد چکنائی دھو ڈالتا ہے۔ ایسے ہی انسانی جسم کے اندر بھی یہ رس چکنائی کو کھا جاتا ہے۔ اور اگر آرتھرائٹس یعنی وجع المفاصل کا مریض لیموں کا رس بکثرت استعمال کرنے لگے تو اس کے جوڑوں کا تیل تیزی سے خشک ہونے لگتا ہے اور یُوں مرض شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

آرتھرائٹس کے بہت سے مریض غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ لیموں کا رس اُنہیں بیماری سے شفا دیتا ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ صدیوں پہلے یہ رس ماس خورے یا اسکروی کے علاج میں کارآمد پایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آرتھرائٹس کی علامتوں والے بہت سے اشخاص نے بھی اسے مُوثر پایا۔ یُوں اس گمراہ کُن خیال نے جڑ پکڑی اور پھر تین سو برس تک لوگ ایک سحر میں پھنسے رہے اور شاید آج بھی اس کے اسیر ہیں۔

سولھویں صدی میں اسکروی کے مریض ہر ہفتے دو چمچ لائم یعنی گلگل کا رس ٹھوس غذا کے ساتھ استعمال کرتے۔

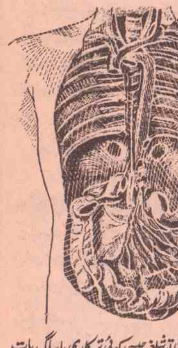

گلگل دستیاب نہ ہوتا تو شلغم جیسی کوئی ترکاری یا ساگ پات خوراک میں شامل کر لیے جاتے۔ یہاں سے فسانہ چل نکلا اور لائم جُوس کی جگہ لیمن جُوس نے لے لی۔ بتدریج گلاس بھر لیمن جُوس یعنی لیموں کا رس روزانہ غذا کا جزو بن گیا۔ بعض من چلے تو چار پانچ گلاس پی کر ڈکار لیتے اور وہ بھی اسکروی کے لیے نہیں بلکہ آرتھرائٹس دُور کرنے کی خاطر۔ اور تو اور ایک

زمانے میں شمالی افریقہ اور اسپین کے مُور بھی ماس خورے میں لیموں کا رس آزماتے رہے۔

گلگل اور لیموں کے علاوہ بھی کئی اشیا ماس خورے کا "علاج" کرتی رہی ہیں۔ قدیم رومنوں کا خیال تھا کہ ہرا دھنیا اس بیماری کا علاج ہے۔ ڈچ اس مقصد کے لیے بند گوبھی کے اچار کو شافی سمجھتے تھے اور انگلستان کے عطائی معالج سلادِ آبی کو اکسیر جانتے تھے۔ شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین صنوبر کی سوئیوں سے بنی ہوئی ایک طرح کی چائے "جادو اثر" خیال کرتے تھے۔

رواں صدی کے پانچویں چھٹے عشرے میں فلوریڈا کے بیشتر باشندے اپنے ہی کنجوں میں کثرت سے لیموں اُگاتے جو لذتِ کام و دہن کا سامان فراہم کرتے۔ ایک طبی مطالعے سے یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ اُن لوگوں میں دانتوں کا ہلنا، بھوک کی کمی اور بازوؤں اور ٹانگوں میں درد جیسے عوارض عام تھے۔ ظاہر ہے ماس خورے کی یہ علامات لیموں کا رس بکثرت نوش کرتے رہنے کا نتیجہ تھیں۔

جوڑوں کا درد اور لیموں

جوڑوں کے درد کے جو مریض لیموں کے رس کو اپنے لیے شفا خیال کرتے ہیں، اُنھیں دیکھنا چاہیے کہ اُن کی جلد اور جسم تیزی سے خشک تو نہیں ہو رہا۔ بالوں پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے کہ اُن کا رنگ قبل از وقت بھورا تو نہیں پڑ گیا۔ اگر ایسا ہے تو وہ جان لیں کہ لیموں کا رس اُن کے مرض میں اضافہ ہی کرتا ہے۔

وقت اور تجربات نے یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی ہے کہ لیموں جوڑوں کے درد کا علاج ہرگز نہیں، بلکہ اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ بعض کا مرض شدت اختیار کر لیتا ہے اور بعض مستقل طور پر اپاہج ہو جاتے ہیں۔ تُرشادہ پھلوں کے رس خصوصاً لیمن جُوس میں پائی جانے والی ثمری شکر جوڑوں اور جلد کے اَستر اور رگوں سے طفیلیے جیسا لگاؤ رکھتی ہے۔ یہ شکر جسمانی تیل کو کھا جاتی ہے۔ خصوصاً جوڑوں کی صُورت میں تو یہ اُنھیں اس طرح بگاڑتی ہے کہ انسان اپاہج بن جاتا ہے۔

پھر کسی نے دریافت کیا کہ لیموں پانی میں نچوڑ کر پینے سے قبض نہیں رہتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لیموں کا رس خُون صاف کرتا ہے۔ وہ یہ کام کرتا تو ہے ـــــ مگر ایک خوفناک قیمت پر۔ اگر آپ جوڑوں کے درد کا شکار ہیں اور لیموں سے بھی رغبت رکھتے ہیں تو ہوشیار رہیں۔ روزانہ درد کی کیفیت کا اندازہ لگاتے رہیں۔ اپنی جلد، ناخنوں، کھوپڑی اور بالوں پر نگاہ رکھیں کہ یہ خشک سے خشک تر تو نہیں ہوتے جا رہے۔ یہ دانشمندی تو نہیں کہ لیموں کے پانی سے قبض کا علاج کرتے کرتے آپ جوڑوں کے درد کے مستقل مریض بن جائیں جبکہ کئی اور کم ضرر رساں طریقوں سے قبض کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں راچسٹر منیسوٹا کے مشہور میو کلینک کے ماہرین نے انتباہ کیا تھا کہ زکام، قبض اور ریومیٹزم یعنی درد ریح کے لیے لیموں کی اسکنجبین پینا ٹھیک نہیں۔ اُن کے نزدیک اس کا طبی نقصان یہ تھا کہ اس سے دانتوں کا اِنیمل یعنی سفید غلاف ضائع ہو جاتا ہے۔

اگر لیموں آمیز پانی دانتوں کے مضبوط غلاف کو یُوں بُری طرح متاثر کرتا ہے تو سِٹرک جُوس یعنی گلگل یا لیموں کا خالص رس کس قدر نقصان دہ ہوگا، یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ وہ ہمارے اندرونی اعضا کے لیے تو کہیں زیادہ تباہ کُن ثابت ہوتا ہے۔

سِٹرک جُوس کا تیزاب دورانِ ہضم الکلی میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن اس عمل میں ہمارے جسم کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور دورانِ خُون اور اُس کے تیلوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اس کا شاید آپ کو اندازہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیموں کا رس چکنائی کے تیل تباہ کر دیتا ہے جن کی ہمیں شدید ضرورت رہتی ہے۔ یہ اُن کا ہضم ہونا اور جسمانی جوڑوں تک پہنچنا مشکل بنا دیتا ہے۔

آرتھرائٹس کا مریض اگر کبھی کبھار سلاد یا مچھلی پر تھوڑا سا لیموں کا رس چھڑک لے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس حد سے آگے بڑھنا تکلیف میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اُسے گرمیوں میں لیموں کا شربت پینے کی اجازت کسی طرح نہیں دی جا سکتی۔ ایسا مریض اگر جلد اور دیرپا صحت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے لیموں کھانے یا اس کا رس پینے کا خیال غیر مُعیّنہ مدت کے لیے دل سے نکال دینا چاہیے۔

گلگل، چکوترہ اور نارنگی

لیموں سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور پھل گلگل ہے۔ اکثر لوگ اسے کھانے کا شغف نہیں رکھتے۔ اُنھیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے اور جوڑوں کے درد کے مریضوں کو تو گلگل کا رس یا اس کا مشرُوب پینے کا خیال تک دل میں نہیں لانا چاہیے کہ یہ بھی جسمانی تیل یا روغن خشک کر ڈالتا ہے۔

چکوترہ یا گریپ فروٹ ایک اور تُرشادہ پھل ہے جسے جوڑوں کے درد کے مریض اپنی خوراک میں شامل کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ وٹامن سی سے بھرپُور ہے۔ اُن کا یہ خیال بجا ہے لیکن اُن کی نظر اس پہلو پر نہیں جاتی کہ گریپ فروٹ جسمانی تیلوں کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ اس کے رس میں اگر چینی ملا لی جائے تو اور بھی تباہ کُن اثرات سامنے آتے ہیں۔ اس سے جوڑوں کا درد شدید ہو جاتا ہے اور جلد کی خشکی بڑھ جاتی ہے۔ مریض تندرست ہو جائے تو اس کے پانچ سال بعد کبھی کبھار چکوترہ کھا لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ تب یہ زیادہ نُقصان نہیں دیتا۔

آرتھرائٹس میں آپ کا جسم قلّتِ روغن کی اصلاح کر رہا ہو تو چکوترے یا اس کے رس سے کامل احتراز کرنا چاہیے۔ وٹامن سی سے بھرپُور پھل اور بھی ہیں جن سے جسمانی تیلوں کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ سیب، ناشپاتی اور آڑو کھائیے اور لُطف اُٹھائیے۔ سمجھ دار معالج ایسے

کراچی میں
گلف ہوٹل
صدر کے بارونق علاقے میں
اوّل درجے کا
سنٹرلی ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل
اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی تمام سہولیات مثلاً جدید ترین لفٹ، پُرسکون کمرے جو بہترین آرام دہ فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ ہر کمرے میں ٹیلیفون، ٹیلکس سروس، سواری کی سہولت ہر وقت مہیا رہتی ہے۔ اوّل درجے کا ایئرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ، کشادہ لابی اور سب سے بڑی بات یہ کہ کرایہ انتہائی مناسب
gulf hotel
FRERE STREET SADAR
KARACHI
PAKISTAN
Telephones: 515831-39
TELEX : 25125

مریض کو ترشاوہ پھل کھانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ ایسے مریض بعض اوقات اپنے تجربے سے ان پھلوں کی مضرت رسانی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ خاصی مقدار میں ترشاوہ رس استعمال کرنے کے بعد اُن کے جوڑوں میں بے پناہ درد اُٹھتا ہے لیکن وہ اس اہم سگنل کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بدستور اس فسانے میں گرفتار رہتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ پھل نہ کھائے تو شاید ایک ناگزیر قدرتی عطیتے سے محروم رہ جائیں گے۔

اب آئیے سب سے مقبول ترشاوہ پھل کی طرف، اور وہ ہے نارنگی جس میں سنگترہ، مالٹا، کینو اور فروٹر شامل ہیں۔

آج کی مصروف زندگی میں ناشتہ بھی سُرعت سے کیا جاتا ہے۔ اور جوڑوں کے درد کے بہت سے مریض بھی صبح اکثر نارنگی کے رس کا ایک گلاس پی کر سمجھتے ہیں کہ ناشتہ ہو گیا۔ اب نارنگی کا رس آہستگی سے پیا جائے یا تیزی سے، حقیقت یہ ہے کہ وہ جلد اور جوڑوں کو خشک کر ڈالتا ہے۔

لیکن ٹھہریے، ایک آدھ نارنگی کھانا جوڑوں کے درد میں ہرگز ممنوع نہیں۔ جب آپ ایک سنگترہ یا مالٹا کھاتے ہیں تو منہ کا لُعاب اُس کے تیزابی مادے کو الکلی میں بدل ڈالتا ہے۔ ہاں، سادہ نارنگی کا رس پینے سے پرہیز کریں کیونکہ اُس میں ثمری شکر اور سٹرک ایسڈ یا ترشاوہ تیزاب ایک خاص ترکیب میں گھلے ملے ہونے کے باعث براہِ راست جسمانی تیلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح گاڑھا اور منجمد ترشاوہ رس بھی اس مرض کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔

یاد رہے کہ نارنگی میں تیزابی مادہ ایک فیصد ہے اور لیموں اور گلگل میں سات فیصد۔ اور اسی نسبت سے لیموں اور گلگل کے خشک اثرات بھی سات گُنا زیادہ ہیں۔

ایک شخص جتنے لمبے عرصے تک جوڑوں کے درد کا مریض رہا ہے، سادہ نارنگی کے شربت سے اُتنا ہی پرہیز کرنا ہو گا۔ مرض سے کامل صحت پانے کے ایک سال بعد وہ پھلوں کی چاٹ میں نارنگی کی چند قاشیں لے سکتا ہے۔ کبھی کبھار سالم نارنگی بھی کھا لے تو کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ قاشیں مُنہ میں رکھ کر اچھی طرح چوسی جائیں تاکہ رس میں لُعابِ دہن شامل ہو سکے۔

ماہرینِ طب اور ترشاوہ پھل

کارنیل یونیورسٹی کے سی ایم میکے نے چوہوں کے چار گروہ زیرِ مطالعہ رکھے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مختلف مشروبات دانتوں پر کس طرح مُضر اثرات ڈالتے ہیں۔ اُس نے ٹماٹر کا رس، نارنگی کا رس، کولا مشروب اور مقطر پانی الگ الگ استعمال کیے۔ مقطر پانی سے دانتوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ٹماٹر کے رس نے دانتوں کے اینیمل پر ہلکی ہلکی خراشیں ڈال دیں۔ نارنگی کے رس نے صرف چھ ماہ کی مُدت میں دانتوں پر کٹے پھٹے نشان ڈال دیے۔ کولا مشروبات کے اثرات آگے زیرِ بحث آئیں گے۔

تورز فرانس کے مدرسہ طب میں پروفیسر بوندوے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہماری خوراک میں ترشاوہ رس کی زیادتی سے نظامِ ہضم خراب ہو سکتا ہے اور ایسی بدہضمی عموماً معدے کے ناسُور کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے ایسے تجربات بھی کیے ہیں جن میں لیموں اور نارنگی کے ست یا بُخارات نے کئی قسم کے خُردبینی حیوان مار ڈالے۔ اُن میں ہلاکت خیز خُناق اور تپ محرقہ کے جراثیم بھی شامل تھے۔ پروفیسر بوندوے کے بقول چکوترے، لیموں اور نارنگی کے رس آنتوں میں گیس اور پیٹ کا اپھارہ پیدا کرتے ہیں۔

میو کلینک راچسٹر کے دو ماہرینِ دنداں نے لیموں کا رس استعمال کرنے والے پچاس مریضوں کے دانتوں کا تفصیلی معاینہ کیا۔ اُن میں سے ہر مریض دانتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا جو لیموں میں پائے جانے والے اسکاربک ایسڈ کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے ایک عام ہدایت دی کہ روزانہ لیموں کا رس پینے سے احتراز کیا جائے۔ اُن کی رائے میں لمبے عرصے تک لیموں کا رس استعمال کرتے

رہنے سے دانت اتنے خستہ ہوجاتے ہیں کہ محض برش کرنے سے اُن کے کنارے جھڑنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر ایچ ہکس نے 'جرنل آف دی امیریکن ڈینٹل ایسوسی ایشن' میں اپنے مریضوں کا ایک دلچسپ مطالعہ پیش کیا۔ بعض نے شکایت کی کہ سیب کا چھلکا اور سا چوائن چبانے سے اُنہیں حسّاسیت لاحق ہوجاتی ہے۔ دوسرے مریضوں میں دانت ہلنے، مسوڑھوں سے خون بہنے، کان بجنے، آنکھوں کی چُندھیاہٹ، مستقل سردرد اور تھکن، دانتوں کا انیمل اُترنے اور سانس میں رکاوٹ جیسی خرابیاں پائی گئیں۔ اور جب ڈاکٹر ہکس نے اُن کی خوراک میں سے نارنگی، لیموں اور چکوترے کے رس خارج کردیے اور اُنہیں معتدل مقدار میں خام پھل کھانے کی ہدایت کی تو اُن کی شکایات جاتی رہیں۔ ترشاوہ رس کے بجائے ڈاکٹر ہکس نے بند گوبھی، سبز مرچ اور دوسری ترکاریاں تجویز کیں جو وٹامن سی سے بھرپور ہیں۔ وہ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ زیادہ مقدار میں ترشاوہ رس استعمال کرنے سے دانتوں اور پورے نظامِ جسمانی پر مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اُنہی دنوں ڈاکٹر سی ڈی ملر نے چوہوں پر ایک تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انناس، چکوترے اور امرود کا رس پینے سے دانتوں کی شکست و ریخت ہوتی ہے، وہ یہ پھل کھانے کے مضر اثرات سے کہیں زیادہ ہے۔ بقول میلون ای ہیچ کے ترشاوہ رس نظامِ جسمانی پر غیر ضروری بوجھ ڈال دیتے ہیں۔

پھلوں کی لذتیں

سیب، کیلا، خوبانی، چیری، آڑو اور ناشپاتی جیسے پھل معدنیات سے پُر ہوتے ہیں اور یہ اچھی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ سیب اگر اُسی طرح کھائے جائیں جس طرح قدرت انہیں پیدا کرتی ہے تو یہ ہر شخص کے لیے مفید ہیں لیکن سیب کا رس تیل پر اثر انداز ہوتا ہے اور جوڑوں کے درد کے مریض کو اُس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ 'ایک سیب روزانہ' اچھا فارمولا ہے مگر اس کا رس پینے یا اسے پکانے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے کیونکہ ایسا کرنے سے غذائی اہمیت کے وٹامن ضائع ہوسکتے ہیں۔

جوڑوں کا درد ہو تو انناس کا رس پینا بھی مفید نہیں؛ تاہم اس کی قاشیں کبھی کبھار کھالی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جہاں تک ناشپاتی کا تعلق ہے، اُس میں شکری اجزا اس قدر ہیں کہ اُسے محدود مقدار میں استعمال کرنا چاہیے۔ اگر آپ آلو بخارا یا آلوچہ کھانے کا شوق رکھتے ہیں تو انہیں خوب چبا کر کھائیے۔ ان کا رس پینے کی غلطی مت کیجیے کیونکہ ان کی شکر تیل کا ستیاناس کردیتی ہے۔

کیلے میں صرف چربی پیدا کرنے والے تیل ہوتے ہیں۔ اگر آپ موٹاپے کا شکار نہیں اور اپنی کمر کے متعلق تشویش میں مبتلا نہیں تو کیلوں سے بھرپور لطف اٹھائیے وہ آپ کے جوڑوں کو ہرگز متاثر نہیں کریں گے۔

کافی اور چائے

بیسویں صدی کی اور کوئی شہرت ہو یا نہ ہو، تاریخ میں لکھا جائے گا کہ یہ وہ عہد تھا جس میں سوڈا اور کولا جیسے ہلکے مشروبات نے جنم لیا تھا اور قارئین کے لیے شاید یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ 'ہلکے مشروبات' جوڑوں کے درد والوں کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔

لیکن پہلے عام مشروبات کی بات ہوجائے، اور وہ ہیں کافی اور چائے۔ آپ جوڑوں کے مریض ہیں تو نقصان اُٹھائے بغیر کافی پی سکتے ہیں مگر یہ تبھی ممکن ہے اگر اسے اپنے کھانے کے حوالے سے درست وقت پر نوش کریں۔ اگر آپ کھانے سے دس سے لے کر تیس منٹ پہلے یا کم از کم تین چار گھنٹے بعد کافی پئیں گے تو یہ غذائی تیل کو متاثر نہیں کرے گی اور اگر سیاہ کافی استعمال کریں تو یہ اور بھی اچھی بات ہوگی۔

اگر جوڑوں کا درد برقرار ہو تو تیز چائے پینا چھوڑ دیں۔ چائے نوشی سے جوڑوں اور جلد کے اَستر میں تیل بُری طرح خشک ہوجاتے ہیں۔ کثرت سے چائے پینا اس لیے بھی نقصان دہ ہے کہ اس میں ٹینک ایسڈ بھی ہوتا ہے۔ اور چائے میں چینی، لیموں اور برف کی بکثرت آمیزش اُسے خطرناک مشروب بنادیتی ہے لیکن صرف اُس کے لیے جسے جوڑوں کا درد لاحق ہو۔

دُودھ یا بالائی ملانے سے جوڑوں کے استر پر چائے کے مُضر اثرات کم پڑجاتے ہیں؛ تاہم جو لوگ دُودھ ملی چائے کے عادی ہیں وہ کیمیا کے ایک پُرانے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ تیل یعنی دُودھ اور پانی یعنی چائے ایک دُوسرے میں گھلتے ملتے نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلسل چائے نوشی بعد میں دورانِ خون کو بگاڑ دیتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں چائے ضرور پینی ہے، اُن کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ چائے ہلکی اور محدود مقدار میں نوش کریں۔

گیس بھرے مشروبات

اب آئیے گیس بھرے مشروبات کی طرف جو ہمارے ہاں بتدریج دُودھ اور سادہ پانی کی جگہ لے رہے ہیں۔ ان کی مضرت جانچنے کے لیے ایک سادہ تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ کوئی اچھا تیل مثلاً مکھن لیں اور اُسے گلاس بھر سوڈا واٹر میں ڈال دیں، پھر دیکھتے رہیں کہ وہ غائب کیسے ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ گیس اور شکر بھری نقصان دہ چکنائی میں بدل جاتا ہے۔ دراصل ان مشروبات میں پایا جانے والا سوڈیم کاربونیٹ چکنائی کو کھا جانے والا طفیلیہ ہے۔ یہ چکنائی اور اس کی قدر و قیمت کو ضائع کردیتا ہے۔ اور جوڑوں کے درد کے مریض اگر تندرست ہونا چاہتے ہیں تو اُنہیں ہمیشہ کے لیے گیس بھرے مشروبات سے پرہیز کرنا ہوگا۔

اب کسی بھی ذائقے یا رنگ میں سوڈا واٹر ہو یا کولا مشروب، اُس میں بھری ہُوئی گیس آپ کے لیے نقصان دہ

ALLPARTS

ہے۔ اگر آپ کو شک ہو تو کسی بھی کولا مشروب کے چند اونس اپنی گاڑی کے بونٹ پر ڈالیں اور دیکھیں کہ پینٹ کے تیل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہاں نشان پڑ جائے گا۔ اندازہ کریں اگر آپ کے جسم کے اندر یہی عمل ہو تو کس قدر خوفناک ہوگا۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ اپینڈکس کی تکلیف اور بچوں کا فالج اور پیٹ کی بیماریاں گرمیوں ہی میں کیوں ہوتی ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ گیس بھرے مشروبات میں پائی جانے والی کاربن ڈائی آکسائڈ اور چینی سے اپینڈکس کی چربیلی تہہ کا تیل اور چکنائی ضائع ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپینڈکس کی سُوجن ظاہر ہوتی ہو۔ جوڑوں کے استر میں یہی صورتِ حال پیش آتی ہے اور اپینڈکس بھی اسی کیفیت سے گزرتا ہوگا۔

گیس بھرے مشروبات تیل کی وہ تہہ برباد کر دیتے ہیں جو اعصابی بافتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یُوں اعصابی خلیات ننگے ہو جاتے ہیں اور پولیو جیسے امراض کے وائرس اُن اعصاب میں گھس کر نشو و نما پانے لگتے ہیں۔ بافتوں کے گرد تیل کی حفاظتی دیوار موجود ہو تو مُضر وائرس حملہ آور نہیں ہو سکتے۔ پھر ان دنوں پولیو بڑوں کو بھی اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کہیں گیس بھرے مشروبات ہی تو اس کا سبب نہیں بن رہے۔

طبی ماہرین کا فیصلہ

ڈاکٹر جی بلومر، اینلز آف ویسٹرن میڈیسن اینڈ سرجری فروری ۵۲ء میں لکھتے ہیں کہ ہلکے مشروبات کا لمبے عرصے تک استعمال آخر کار نقصان دیتا ہے۔ بعض ہلکے مشروبات میں نقصان دہ ادویہ ہوتی ہیں جبکہ اُن میں سے اکثر جسم کے اندر مضرت رساں کیمیائی عمل برپا کرتے ہیں۔ ہلکے مشروبات پینے کے شوق میں ہم اکثر دُودھ جیسی زیادہ صحّت بخش غذائی اشیا نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر بلومر کہتے ہیں: "مشروب سازاداروں پر یہ قانونی پابندی عائد ہونی چاہیے کہ وہ مشروبات کی بوتلوں پر اُن کے اجزا ضرور درج کریں۔"

کئی ہلکے مشروبات میں فاسفورک ایسڈ ملا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر میکے نے انسانی دانت کولا مشروب میں لٹکا دیا پھر دو ہفتے بعد اُس کا معاینہ کیا تو پتہ چلا کہ دانت کا سارا کیلشیم فاسفورک ایسڈ میں حل ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر سی ملر نے ۱۲۹ چوہوں کو غذا کے ساتھ گیس بھرے مشروبات دیے تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ سوڈا واٹر، کولا اور تمام گیس بھرے مشروبات دانتوں کا حفاظتی انیمل چاٹ جاتے ہیں۔ ستم یہ کہ ان کی غذائی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔

پنسلوینیا میڈیکل جرنل کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر ایچ ٹرنر کہتے ہیں کہ امریکیوں میں چشمہ پہننے کا روز افزوں رواج گیس بھرے مشروبات پینے کا نتیجہ ہے۔ نوخیز بچے خاص طور پر اس بلانوشی کی عادت ہی کے باعث آنکھوں پر عینکیں سجائے ہوئے ہیں۔ میوکلینک کے دو سرکردہ ڈاکٹروں کی رائے میں کولا اور تیزابی مشروبات سے دانتوں کی ٹُوٹ پھُوٹ کا عمل تیز ہو جاتا ہے اور ایسے مشروبات سے متاثرہ دانتوں کو بُرش کرنے سے اُن کی شکست و ریخت اور تیزی سے ہونے لگتی ہے۔

ڈاکٹر میکے کی تحقیقات کے بعد ایک اور رپورٹ سامنے آئی جس میں مختلف ہلکے مشروبات کی تیزابیت کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اُس کے نتائج درج ذیل تھے:

مشروب		تیزابیت (پی ایچ)
کولا مشروبات	:	۲،۴
لیموں اور گلگل	:	۲،۹
چیری	:	۳،۱
رس بھری	:	۳،۱
نارنگی	:	۳،۲
انگور	:	۳،۶
کریم سوڈا	:	۳،۹
کوکا سوڈا	:	۴،۳
سوڈا واٹر	:	۴،۷

اس کالم میں تیزابیت ظاہر کرنے والا عدد جتنا کم ہوگا، اُس میں پائے جانے والے تیزابی مادّے کی مقدار اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ یاد رہے پانی کی تیزابیت ، ہے جو کیمیائی لحاظ سے تعدیلی ہے؛ چنانچہ ، سے اُوپر تیزابیت منفی ہوتی ہے، یعنی وہ شے تیزابی خواص کے بجائے الکلائن یا اساسی خاصیتیں ظاہر کرتی ہے۔ یُوں کولا مشروبات میں تیزابی مادہ سب سے زیادہ ہے اور سوڈا واٹر میں سب سے کم۔ اور مشروب کی تیزابیت جتنی کم ہو اُس کا تیزابی مادہ دانتوں کے انیمل کو اتنا ہی توڑتا پھوڑتا ہے۔

سوڈا واٹر کے نقصان دہ ہونے کی ایک وجہ اور ہے۔ ہمارا جسم بہت بڑی مقدار میں گیس جذب کر لیتا ہے کیونکہ معدے کے اندر ہوا کا دباؤ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے جسمانی خلیات میں گیس کا شامل ہونا کسی طور مفید نہیں۔

جہاں تک تیز مشروبات یعنی شراب وغیرہ کا تعلق ہے، اُن کے نقصانات ہلکے مشروبات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اور اُن کا استعمال ہر لحاظ سے خطرناک ہے۔

سگریٹ نوشی مُضر ہے

ہماری تحقیق کے مطابق تمباکو نوشی کا جوڑوں کے درد سے بظاہر کوئی تعلق نہیں مگر یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بکثرت سگریٹ پینے سے خُون کی شریانیں سُکڑ جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں جوڑوں کی بافتوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تمباکو نوشی کے مُضر اثرات اور بھی ہیں۔ عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے مکمل احتراز کیا جائے اور اگر سگریٹ پیے بغیر آپ نہ رہ سکتے ہوں تو ان کی تعداد کم سے کم رکھیں۔

روزمرّہ کی غذا کے سلسلے میں ہم سے عموماً چھوٹی چھوٹی فروگزاشتیں سرزد ہوتی ہیں جن کا جوڑوں کے درد

ALIPARTS

سے براہِ راست تعلق ہے۔ اُن میں سے ایک سرکے وغیرہ میں محفوظ اشیا کا استعمال ہے۔ مائع شکل میں سرکہ اُن غذائی تیلوں کو نقصان پہنچاتا ہے جو انسانی جسم کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ ہاں سلاد وغیرہ میں آپ معمولی سا سرکہ شامل کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مشروبات میں شامل سفید چینی آرتھرائٹس والوں کے لیے بڑی مُضر ہے۔ پُوری زندگی میں کثرت سے چینی استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنتوں کی اندرونی دیواریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ تب چینی کے ذرّات ان دیواروں میں سرایت کر کے جوڑوں کے اَستر تک جا پہنچتے ہیں اور وہاں تیل جَل اُٹھتا ہے۔ ایک صحت مند شخص کے جوڑوں سے مائع لے کر اُس کا تجزیہ کیا جائے تو ہزار مکعب سینٹی میٹر میں چینی کی مقدار ۸۰ ملی گرام نکلتی ہے۔ جوڑوں کا ایک مریض جس کا ہاضمہ دُرست ہو، اُس میں بھی یہی تناسب سامنے آتا ہے۔ لیکن ایسے مریض کی آنتوں کی جھلی کمزور ہو اور اُسے ایک بوتل سوڈا واٹر پلا دیں تو بیس منٹ کے اندر جوڑوں میں چینی کی مقدار تگنی ہو جائے گی۔

خون میں تیزی سے سرایت کر جانے والی مٹھاس مثلاً چینی چکنائی کو جلا ڈالتی ہے یا اُس کی افادیت کم کر دیتی ہے؛ لہٰذا اگر خدانخواستہ آپ آرتھرائٹس کے مریض ہیں تو مائع چینی، دانے دار چینی، شہد اور شیرے سے کامل پرہیز کریں۔ ان کا متبادل پھلوں کے اندر موجود مٹھاس ہے، اس لیے پھل بلاتکلف استعمال کریں۔

غذائی چارٹ گُمراہ کُن ہیں؟

ان دنوں غذائی چارٹ کثرت سے دیکھنے میں آ رہے ہیں لیکن اُن میں دو باتوں کا سِرے سے ذکر نہیں ہوتا۔ کوئی چارٹ یہ نہیں بتاتا کہ غذا کا درست درجۂ حرارت کیا ہونا چاہیے اور نہ کسی میں یہ وضاحت ہوتی ہے کہ مختلف اشیا کس ترتیب سے کھائی جائیں۔ اس لحاظ سے تمام چارٹ بے معنی اور گمراہ کُن ٹھہرتے ہیں۔

مثلاً ایک چارٹ بتاتا ہے کہ دُودھ میں وٹامن، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ وغیرہ ہوتے ہیں لیکن اُس میں کہیں اشارہ تک نہیں ہوتا کہ ٹھنڈے دُودھ کے اثرات یہ ہیں اور گرم کے یہ۔ اور یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ اگر دُودھ نیم گرم پئیں تو وہ مکمل طور پر ہضم ہو جائے گا اور آپ کا جسم زیادہ مقدار میں وٹامن، پروٹین اور کاربوہائیڈریٹ حاصل کر سکے گا۔

ایک نومولود بچے کو شیر گرم کے بجائے ٹھنڈا دُودھ پلاتے رہیے اور دیکھیے کہ اُس کی جلد، کھوپڑی اور ناخنوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آپ کو واضح فرق نظر آئے گا۔ دونوں اقسام کے دُودھ غذائیت دیں گے لیکن شیر گرم کہیں بہتر نتائج پیش کرے گا۔

غذائی چارٹ ہرگز نہیں بتاتے کہ آپ دُودھ کا گلاس کھانے سے پہلے پئیں، کھانے کے دوران میں یا اس کے بعد؛ حالانکہ زیادہ سے زیادہ وٹامن اور غذائی حراروں کا حصُول اسی پر منحصر ہے۔ اور دُودھ کی تمام تر افادیت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ کس حد تک ہضم ہو کر جُزوِ بدن بنتا ہے۔ کہیں دُودھ کا استعمال اُن غذائی اشیا کے ساتھ اَنمل اور بے جوڑ تو نہیں جنھیں آپ بیک وقت استعمال کر رہے ہیں۔

ہر غذائی چارٹ میں پھلوں کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نارنگی، چکوترہ، انناس وغیرہ سب جسم کو وٹامن اور معدنیات دیتے ہیں لیکن ایسے چارٹ مختلف پھلوں کے استعمال کا فرق واضح کیوں نہیں کرتے؟ وہ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ پھل اصلی شکل میں کھانے اور اُس کا رس پینے میں کیا فرق ہے؛ چارٹ یہ پہلو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ایک شخص کس بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مثلاً ممکن ہے آپ کا معدہ ایک خاص چیز ہضم نہ کر سکتا ہو۔ اس صُورت میں اگر چارٹ کے غذائی فارمُولے پر عمل کریں تو ظاہر ہے اُس شے کے حرارے حاصل نہیں کر پائیں گے جسے آپ ہضم نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے غذائی چارٹ نامکمل اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔

چارٹ میں عام آدمی کے لیے جو پھل تجویز کیے جاتے ہیں، ایک حاملہ عورت کو اُن سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ معالج بلکہ ماہرین بھی حاملہ عورتوں کو بلا جھجک پھلوں کے رس پینے کی تلقین کرتے ہیں جبکہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ ترش پھلوں کے رس جِلد کو ہر قسم کے تیل سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس طرح جِلد پر خراشوں کے سے نشانات پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ خواتین بلکہ اور لوگوں کو بھی چاہیے کہ پھل ہمیشہ کھائیں، اُنھیں معدے میں نہ اُنڈیلیں۔

انڈے مثالی ناشتے کی شے سمجھے جاتے ہیں اور ہر غذائی چارٹ کا جزو ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ ہم بھی یہ چیز آرتھرائٹس والوں کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ اگر اُنھیں کوئی کھانسی یا پتّے کی بیماری نہ ہو تو انڈے خُوب کھائیں اور مزے اُڑائیں۔ لیکن غذائی چارٹوں میں انڈے تیار کرنے کے متعلق کوئی ہدایت نظر نہیں آتی؛ حالانکہ اُنھیں بنانے کا طریقہ بدلنے سے اُن کی غذائی افادیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ مثلاً جب آپ انڈے پھینٹتے ہیں تو زردی کا ٹھیک طرح ہضم ہونا مشکل بنا دیتے ہیں۔ اگر جوڑوں کا درد ہو تو آپ بس دس منٹ تک اُبلے ہُوئے انڈے استعمال کریں۔

گوشت ہر وٹامن چارٹ پر نمایاں ہوتا ہے، مگر اُن میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ اسے دیر تک پکانے سے وہ تمام وٹامن ختم ہو جاتے ہیں جن کے لیے اتنا تردّد کیا جاتا ہے۔ آرتھرائٹس کے مریضوں کو تو خاص طور پر چاہیے کہ اُبلتے ہُوئے پانی میں وٹامن ضائع کر دینے کی غلطی ہرگز نہ کریں۔

سبزیوں کے بارے میں بھی یہ احتیاط پیشِ نگاہ رکھیں۔ انھیں زیادہ پکانے سے احتراز کریں۔ سبزیاں پریشر ککر میں پکائیں یا اگر ممکن ہو تو کچّی ہی استعمال کریں۔

پانی خطرناک ہے؟

کھانا کھاتے وقت یا اس کے فوراً بعد پانی پینے سے غذا کے وٹامن، لحمیات اور معدنیات کی افادیت کم ہو سکتی ہے۔ جوڑوں کے درد والوں کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ہوگا۔

چارٹوں کی اکثر غذائیں اپنے اندر پانی اور تیل میں حل ہونے والے دونوں قسم کے وٹامن رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے جسم کے لیے بے حد اہم ہیں۔ تیل میں حل پذیر وٹامن اے، ڈی اور ای ہیں۔ جب آپ کھانے کے ساتھ ساتھ پانی پیتے ہیں، جسم کے اندر وٹامن اے، ڈی اور ای لے جانے والے تیلوں اور چکنائیوں کی کیمیائی ساخت بدل جاتی ہے۔ اس طرح یہ وٹامن اپنا حقیقی مقصد پُورا کر نہیں سکتے۔ وہ کمزور یا عملاً ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ آپ کے جسم کو متوازن غذا مل رہی ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں انتباہی علامتیں یہ ہیں:

① رُخساروں کا رنگ اُڑ رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غذا میں لحمیات کی کمی ہے یا وہ ٹھیک طرح ہضم نہیں ہو رہے۔

② دانتوں میں کیڑا لگنے سے خلا پیدا ہو رہے ہوں تو اس کے معنی ہیں کہ غذا میں نشاستے کی مقدار متوازن نہیں۔

③ کہیں ذرا گر پڑنے سے ہڈّیاں ٹُوٹنے لگیں تو یہ غذا میں معدنی اجزا کم ہونے کی دلیل ہے۔

④ رات کے وقت کم دکھائی دے یا زیادہ طاقت کے شیشوں والا چشمہ استعمال کرنا پڑے تو یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ آپ کی غذا میں وٹامن کم ہیں۔

آپ جانتے ہیں غذائی اشیا پانچ قسم کی ہیں: ۱۔ پروٹین یعنی لحمیات۔ ۲۔ معدنیات۔ ۳۔ نشاستے دار اشیا۔ ۴۔ چکنائیاں۔ ۵۔ وٹامن یعنی حیاتین۔

معدنیات کچّی سبزیوں یا پھلوں میں پائے جاتے ہیں۔ کاربوہائیڈریٹس یا نشاستے دار اشیا اناج، روٹی وغیرہ میں بکثرت ملتی ہیں۔ چکنائیاں مکھن، انڈوں اور دُودھ کا لازمی جزو ہیں۔ لحمیات ہم گوشت، دالوں اور انڈوں کی صُورت

میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وٹامن، مچھلی، پرندوں اور سبز ترکاریوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

فرض کیجیے ایک گھرانے میں یہ پانچوں قسم کی غذائیں صحیح تناسب سے کھائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ اہلِ خانہ تندرست ہیں اور کچھ بیمار۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مختلف مشروبات، مختلف درجۂ حرارت پر مختلف اوقات میں اور کھانے کے دوران میں یا دو کھانوں کے درمیان پیتے ہوں گے۔

اُن کے انتخاب میں دُودھ، چائے، کافی، پانی یا گیس بھرے مشروبات شامل ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر مائع، غذا میں شامل چکنائیوں پر مختلف تناؤ پیدا کرتا ہے چکنائیوں پر اس تناؤ ہی سے اُن کے مفید یا غیر مفید ہونے کا تعین ہوتا ہے۔ تناؤ زیادہ ہو تو نظامِ انہضام کو ہاضم رطوبتیں زیادہ مقدار میں بنانی پڑتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمارے اعضا خصوصاً لبلبے اور پِتّے کی شکست و ریخت کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔

مائعات ہمارے نظامِ انہضام کو نقصان کیا کیا پہنچاتے ہیں، یہ جاننے کے لیے ایک دن کے کھانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دن کا آغاز ناشتے سے ہوتا ہے۔

ناشتہ (آرتھرائٹس والوں کے لیے غیر موزوں)

گریپ فروٹ کا ٹھنڈا رس
پھینٹے ہُوئے انڈے اور گائے کا گوشت
ڈبل روٹی اور مکھن
دُودھ کی بالائی والی کافی

ناشتہ (آرتھرائٹس والوں کے لیے موزوں)

مکھن لگا سالم گندم کا ٹوسٹ
نیم اُبلے انڈے
نیم گرم دُودھ کا گلاس (تقریباً ۴۰ حرارے)

پہلا ناشتہ ایک عام آدمی کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن آرتھرائٹس کی صُورت میں ہرگز موزوں نہیں۔ ایسا مریض اگر خالی معدے میں گریپ فروٹ جُوس انڈیلے تو وہ غذائی چکنائیاں ضائع کر لیتا ہے۔ یُوں جسم کا پُورا نظام خشک ہو جاتا ہے۔ پھر پھینٹے ہُوئے انڈوں کی زردی چکنائی کی شکل میں ہضم نہ ہوگی بلکہ توانائی میں بدل جائے گی اور ٹھنڈی روٹی اور مکھن کی چکنائیاں ہضم کرنے کے لیے زیادہ ہاضم رطوبتیں درکار ہوں گی۔ اس کے بجائے آرتھرائٹس کے مریض کو گرم ٹُوسٹ اور مکھن استعمال کرنا چاہیے۔

رہی کافی یا چائے تو ان کا پانی انڈوں اور مکھن کی چکنائیاں کو چربی میں بدل ڈالتا ہے؛ حالانکہ آرتھرائٹس کے مریض کو چکنائی چاہیے۔ چائے اور کافی کا مکھن کے ساتھ کوئی میل نہیں۔ ان میں شامل چینی چکنائی کو جلا دیتی یا اُس کی افادیت کم کر دیتی ہے۔

انڈوں اور گوشت کا مُتبادل یہ ہو سکتا ہے کہ اناج ٹھنڈے دُودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ اس صُورت میں ٹھنڈا دُودھ اناج کی چکنائی کو مُنجمد کر دے گا۔

اب آیئے آرتھرائٹس کے لیے موزوں ناشتے کی طرف مکھن لگا سالم اناج کا ٹُوسٹ یا اَن چھنے آٹے کی روٹی اچھی طرح چبایئے۔ ایسا کرنے سے مکھن تیل میں بدلنے لگے گا۔ نیم اُبلے انڈے جوڑوں کے لیے بہترین چکنائی دیں گے۔ انڈوں کا متبادل آپ دلیہ بھی کھا سکتے ہیں۔ اناج کے ساتھ چینی ہرگز استعمال نہ کیجیے اور اگر اُس میں دُودھ ڈالیں تو وہ لازمی طور پر نیم گرم ہونا چاہیے۔

اگر آپ محسوس کرتے ہوں کہ وٹامن سی کا استعمال ضروری ہے تو ناشتے کے ساتھ اسکاربک ایسڈ کی گولیاں کھا سکتے ہیں۔ تیل کی شکل میں مائع وٹامن سی ان کا اچھا بلکہ بہتر متبادل ہے۔ ناشتے کے آخر میں ہمیشہ نیم گرم دُودھ پیجیے، اس سے جسم میں تیل کا بہاؤ برقرار رہے گا۔ اگر دُودھ کے بجائے کافی پینا ہی چاہیں تو سیاہ رنگ کی پیجیے، ناشتے سے پہلے

دوپہر کا کھانا

اگر آپ غذاؤں کی صحیح ترتیب نہیں جانتے تو دوپہر کا کھانا وقت کا ضیاع ہوگا۔ اچھا اور بُرا دونوں طرح کا کھانا پیشِ خدمت ہے:

مثالی دوپہر کا کھانا (آرتھرائٹس والوں کے لیے غیر موزوں)

گوشت کے برگر یا سینڈوچ
پانی کا گلاس
ایپل پائی یا کیک
چائے یا کافی

دوپہر کا کھانا (آرتھرائٹس والوں کے لیے موزوں)

آپ کے گھر پر تیار کیے ہوئے پنیر سینڈوچ
سبز سلاد جس میں تیل اور سرکہ شامل نہ ہو
نیم گرم دُودھ کا گلاس

کھانے کے شروع ہی میں پانی کا استعمال غلط ہے۔ معدے میں غذا پانی سے پتلی ہو کر اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔ ہاں، دس منٹ پہلے پانی پی لیا جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ اتنے وقت میں وہ معدے سے نکل کر آنتوں میں چلا جاتا ہے۔

مغربی ملکوں میں سؤر (حرام جانور) کا گوشت کھایا جاتا ہے جس کی چکنائی وٹامن سے خالی ہوتی ہے۔ اُس سے حاصل ہونے والا تیل جوڑوں کے درد میں بالکل بے فائدہ ہے۔ پانی میں پکا ہُوا سیب جسم کو صرف نشاستہ مہیا کرتا ہے اور کچھ نہیں۔ غذا میں نشاستہ جتنا زیادہ ہو، آرتھرائٹس کے مرض سے نجات اُتنی ہی مشکل ہوتی ہے۔ اس کے بجائے خام سیب آپ کے لیے ہر طرح سے موزوں ہے۔

ٹھنڈی کافی یا چائے میں دُودھ یا بالائی شامل کرنے کے دو نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک تو غذائی تیل ٹھیک طرح ہضم نہیں ہوتے۔ پھر گوشت اور مٹھائی کی گھٹیا چکنائی ہضم ہونے میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور پِتّے کو دُگنا کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس طرح خُون ضروری تیل جسم کو فراہم نہیں کر سکتا اور آپ کو پِتّے کی بیماری بھی آلیتی ہے۔

اس کے برعکس آرتھرائٹس کے لیے مجوزہ دوپہر کا کھانا جسم کو تیل فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپ کے گھر پر تیار شدہ

Rubads

سینڈوچ کے بجائے آپ اَن چھنے آٹے کی روٹی یا مکھن لگا ٹوسٹ بھی کھا سکتے ہیں ۔اس کے ساتھ گوشت کے شوربے یا قیمے سے لُطف اُٹھایا جاسکتا ہے ۔

روٹی اور شوربے وغیرہ کے ساتھ سلاد کے پتّے، ہری اجوائن، دھنیا یا پودینہ، کھیرا اور گاجر وغیرہ استعمال کرنے سے خوراک زُود ہضم اور تغذیہ بخش ہو جاتی ہے ۔ وہ اہم وٹامن اور معدنیات بھی مہیا کرتی ہے ۔ دل چاہے تو ٹوسٹ، سینڈوچ اور شوربے کے بعد دُودھ کا نصف گلاس پی جائیے ۔ پھر سلاد کھا کر بقیّہ دُودھ کے مزے لیجیے ۔

آرتھرائٹس کے مریض یاد رکھّیں کہ دوپہر کے کھانے میں سبزیوں یا پھلوں کا رس، گیس بھرے مشروبات اور مٹھائی وغیرہ استعمال کرنا کسی طور درست نہیں ۔

رات کا کھانا

جوڑوں کے مرض میں یہ کھانا بہترین بھی ہوسکتا ہے اور بدترین بھی ۔ انتخاب آپ کے سامنے ہے :

مثالی رات کا کھانا (آرتھرائٹس میں غیر موزوں)

تیز مشروبات (شراب وغیرہ)
جھینگا مچھلی
برفیلا پانی
پُٹھ کا نرم بُھنا گوشت
سبزیاں
آئس کریم
کافی

رات کا کھانا (آرتھرائٹس کے لیے موزوں)

شوربے کی پیالی یا قیمہ
سیخ پر بُھنا گوشت
دو سبزیاں (ایک کچّی)
سیب ۔
نیم گرم دُودھ کا گلاس (۸۰۰ تا ۱۲۰۰ حرارے)

کھانا شروع کرتے ہُوئے مشروب کا استعمال سرے سے غلط ہے اور جھینگا کھانے کے بعد آپ سرد پانی کی چُسکیاں لینے لگیں تو اُس کا گوشت منجمد ہو جاتا ہے ۔ پھر ہاضمے کے عمل سے گزرنے کے لیے اُسے مطلوبہ درجہ حرارت حاصل کرنے میں دیر لگتی ہے ۔ معدے میں جمع شدہ ٹھنڈا پانی بُھنے گوشت کی افادیت بھی کم کر دیتا ہے جو آپ بعد میں کھاتے ہیں ۔ سبزیاں اور بعد میں کھائی جانے والی دوسری غذائیں بھی کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوں گی کیونکہ آپ کھانے کے ساتھ پانی استعمال کیے جا رہے ہیں ۔

اب رہا آرتھرائٹس والوں کے لیے مجوزہ رات کا کھانا ۔ اُس کا آغاز تیل بردار شوربے یا قیمے سے ہوتا ہے ۔ سیخ پر بُھنا گوشت اس مرض میں بہترین غذا ہے، بشرطیکہ وہ نرم ہو اور اُسے زیادہ نہ بھونا جائے ۔ کھانے کے ساتھ سیب یا آڑو وغیرہ خام حالت میں خوب چبا کر کھائیں، اس طرح اُن کی معدنیات اور وٹامن جزوِ بدن بنیں گے ۔ (جاری ہے ۔)

حاجی
اِمدادُاللّٰہ
مہاجر مکّی رح

نظر زیدی

اُس مجاہدِ آزادی اور شیدائے اسلام کی زندگی کے مفصل حالات جس نے ۱۸۵۷ء میں ہر محاذ پر انگریزی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے علم اور افکار سے قوم کو اس قابل بنا دیا کہ آزادی کا جہاد جاری رکھ سکے ۔

قیمت : دس روپے

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

یاسر عرفات کی سچی کہانی

ایلن ھارٹ کی شُہرۂ آفاق کتاب
'عرفات ـــ اے پیس میکر آر ٹیررسٹ ؟'
کی تلخیص ـــ قسط ۵

ایک ایسا واقعہ جس نے خالد حسن کو بے دست وپا کر دیا اور یاسر عرفات کو یہ موقع عطا کیا کہ وہ الفتح کی مرکزی کمیٹی سے بتدریج اپنی شرائط تسلیم کرا سکے وہ تھا احمد الشکیری کی سربراہی میں پی ایل او کا قیام ۔ ناصر اس تنظیم کا بنیادی معمار تھا ۔ اُس کا ارادہ اسے کٹھ پتلی بنا کر استعمال کرنے کا تھا ـــ لیکن اس تنظیم کی اصل خالق امریکی وزارتِ خارجہ تھی جس کی عنان ڈین رسک کے ہاتھوں میں تھی ۔

ناصر پر ہمیشہ ایک خوف آسیب کی طرح مسلط رہا ۔ اُسے یہ دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ بائیں بازو کے فلسطینی کسی نہ کسی بہانے اُسے اسرائیل کے خلاف جنگ میں گھسیٹ لیں گے اور وہ یہ جانتا تھا کہ یہ جنگ کبھی جیتی نہیں جا سکتی ۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کے پہلے چیئرمین کس بڑی طاقت کے ایجنٹ تھے؟

بعد میں ایسا موقع آیا جیسا کہ خود ناصر نے عرفات اور الفتح کے رہنماؤں کو بتایا: "میری میز پر انٹیلی جنس کی رپورٹوں کا انبار لگا رہتا ہے جن کے ذریعے کم و بیش بڑی حد تک میں تمہاری زیرِ زمین سرگرمیوں سے باخبر رہتا۔ ۱۹۶۴ء میں ناصر اس وجہ سے بے حد پریشان تھا کہ فلسطینی گوریلے پُرجوش سرگرمیوں سے عرب اسرائیل جنگ چھیڑنے کا باعث بن جائیں گے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ اُسے یہ خوف لاحق تھا کہ دوسرے فلسطینی، جنگ کی تیاریوں میں مصروف گوریلوں اور اُس کے شامی حریف اور دشمنوں سے سمجھوتہ نہ کر لیں اس لیے کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا ضروری تھا جس کے ذریعے فلسطینیوں کی زیرِ زمین سرگرمیوں کے خطرات سے نجات حاصل کی جا سکے۔ یہ حل ایک فلسطینی ادارے کے قیام کی صُورت میں تلاش کیا گیا کہ اُنہیں اپنے اظہار کے لیے ایک ایسا فورم دستیاب ہو جائے جس کے حوالے سے وہ اپنی قوتِ اقتدار اور کسی حد تک اپنی آزادی کا اظہار کر سکیں۔۔۔ اور اس پر حقیقی کنٹرول ناصر ہی کا ہو۔

اس خوف میں صرف ناصر ہی مبتلا نہ تھا۔ تمام عرب بالخصوص سرحدی ریاستوں سے تعلق رکھنے والے رہنما فلسطینیوں کی سرگرمیوں سے سہمے ہُوئے تھے جو اسرائیل کے لیے اشتعال کا باعث ہو سکتی تھیں۔ اس مشترکہ خوف کی وجہ سے اُنہوں نے ناصر کے اس منصوبے کی حمایت کی اور یُوں پی ایل او کا قیام معرضِ وجود میں آیا۔

❋

جلد ہی الفتح کے رہنماؤں کو اندازہ ہو گیا کہ ناصر پر امریکی دباؤ بہت زیادہ تھا۔ ہانی حسن نے اس سلسلے میں مجھے جو کچھ بتایا، بعد میں اُس کے بھائی اور خود عرفات نے اس کی تصدیق کر دی۔ اُن کا بیان تھا:

"ناصر سے ہماری صلح کے بعد میری اور میرے ہمراہ الفتح کے ساتھیوں کی ناصر کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں اور مذاکرات کے درمیان یہ صاف طور پر واضح ہو گیا تھا کہ چھٹی دہائی میں ناصر، امریکیوں کے شدید دباؤ کے نیچے تھا۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ ناصر اور ڈین رسک کے درمیان کوئی مُعاملہ طے پا چکا تھا، صرف یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ ناصر اور ڈین رسک کے درمیان گہری مفاہمت ہو چکی تھی، اس ذہنی اشتراک کے تحت یہ طے پا چکا تھا کہ فلسطینیوں پر کس طرح کنٹرول کیا اور اُنہیں ثبت اور جائز سیاسی اور فوجی سرگرمیوں سے روکا جا سکے۔

"امریکیوں نے ناصر پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ فی الحقیقت اسرائیل کے ساتھ امن قائم کرنے کا خواہاں ہے تو اُسے یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ فلسطینیوں کے لیے بہت کچھ کرنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں، کیونکہ اسرائیل ایک حقیقت ہے اور اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اسرائیل پر ایک حد تک دباؤ ڈال کر اُسے زیادہ سے زیادہ یہ ترغیب دے سکتے ہیں کہ ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جس کے تحت کچھ فلسطینی واپس اپنے گھروں کو جا سکیں۔ فلسطینی اکثریت کی نقد معاوضے سے کسی حد تک تلافی کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اُنہیں اپنی نئی زندگی کا آغاز عرب علاقوں ہی میں کرنا ہو گا۔

"اس کے بعد ہم اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ناصر، شاہ حُسین، لبنان کے حکّام اور بہت سی عرب حکومتیں یہودی ریاست کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔۔۔ لیکن اس راہ میں ایک ہی رُکاوٹ تھی کہ فلسطینیوں کے لیے کچھ کیا جائے۔ اس ضمن میں عرب رہنماؤں کے مطالبات بڑے نہ تھے۔

پہلی عرب سربراہ کانفرنس کا اصل منصوبہ کیا تھا؟

وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ تھوڑا بہت فلسطینیوں کی اشک شوئی کے لیے کر دیا جائے جس کی بُنیاد پر وہ عرب عوام کو یہ تاثر دے سکیں کہ اُنہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ فلسطینیوں کے لیے جتنا زیادہ سے زیادہ وہ حاصل کر سکتے تھے، اُس کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں برُوئے کار لے آئے ہیں۔ اُن کا اصل مسئلہ اپنے چہروں کو بے داغ رکھنا تھا۔ اُنہیں اس لیے امریکی مدد کی ضرورت تھی کہ وہ اسرائیل پر دباؤ ڈالے جس کے نتیجے میں وہ اپنے چہرے بچا سکیں اور اب امریکی ناصر کو جو کچھ بتا رہے تھے، اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ ناصر امریکیوں کی طرف سے ملنے والی مدد کی قیمت ادا کرے۔ قیمت یہ تھی کہ ناصر اور دوسرے رہنما فلسطینی قومیّت کی تحریکِ احیا کے آگے بند باندھ دیں۔ اشارے کنائے سے ناصر کو امریکی مطلع کر رہے تھے کہ اگر وہ فلسطینیوں کو روکنے میں ناکام رہا، یا ایسا کرنا نہیں چاہتا تو پھر عربوں اور اسرائیل کے درمیان کبھی امن قائم نہ ہو سکے گا۔ ایسا نہ ہُوا تو امریکہ، اسرائیلی تشدّد اور توسیع پسندی کی روک تھام کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ یوں اسرائیل طاقت کے بل بوتے پر عربوں پر اپنی مرضی مسلّط کر سکتا ہے۔

"الفتح سے تعلق رکھنے والے ہم لوگ جو ناصر کا احترام کرتے تھے، اُن پر ان حقائق کا انکشاف ۱۹۶۸ء میں ہُوا اُس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ناصر نے ہمیں یہ سب باتیں بے تکلّفی سے بتا دی تھیں۔ عرفات کے دل میں ناصر کا بے حد احترام تھا وہ اُسے باپ کا مقام دیتا تھا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں ایک موقع پر ناصر نے عرفات کو اپنے دل کی ہر بات بتا دی تھی۔ اُس نے کہا کہ ایک وقت مجھے اُمّید تھی کہ مَیں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر امریکیوں سے منوا لوں گا کہ اسرائیل ۱۹۴۷ء کے منصوبۂ تقسیم کے مطابق سرحدوں کے اندر چلا جائے، لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا ہے، کیونکہ اسرائیل امریکیوں کو بلیک میل کرنے میں ہُشیار ہو چکا ہے۔ اب اسرائیلی ہی مشرقِ وسطیٰ کے لیے امریکی خارجہ پالیسی تیار کرتے ہیں۔ ایک دن، جب مَیں اور تم نہیں ہوں گے تو امریکیوں کو اپنی اس حماقت کی قیمت چکانا پڑے گی لیکن وہ دن بہت دُور ہے۔"

"مجھے شُکیری کے ساتھ اپنی خاص ملاقات بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس ملاقات میں شُکیری نے مجھ سے کہا تھا: میرے بیٹے! غور سے سُنو، تم ایک نوجوان ہو لیکن تمہیں بہت سمجھداری کا ثبوت دینا ہو گا۔ اگر تم اپنے فلسطینی عوام کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو پی ایل او کو استعمال میں لاؤ۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں نے اسے ڈین رسک کے اشارے پر قائم کیا تھا لیکن یاد رکھو اب اگر ہمارے پاس کچھ ہے تو یہی تنظیم ہے۔"

ان حالات و واقعات میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جب عرفات اور وزیر اسی زمانے میں چین کے دورے پر گئے تو ناصر پر ڈین رسک اور امریکی وزارتِ خارجہ کا دباؤ پھر بڑھ رہا تھا۔ ڈین رسک جب تک وزیرِ خارجہ رہا اس کوشش میں لگا رہا کہ چین کو مشرقِ وسطیٰ میں دخل دینے سے باز رکھے۔ امریکی اُس وقت ویت نام میں جنگ میں پھنس چکے تھے، اس لیے چین کا مشرقِ وسطیٰ کے اُمور میں دلچسپی لینا امریکی وزیرِ خارجہ کے لیے سکون کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔

پی ایل او کے قیام کا اصولی فیصلہ پہلی عرب سربراہ کانفرنس میں ہُوا جو جنوری ۱۹۶۴ء میں قاہرہ میں ہُوئی۔ اس کانفرنس میں عرب ملکوں کے تیرہ سربراہوں نے شرکت کی تھی۔ اس کے ایجنڈے پر اہم مسئلہ یہ تھا کہ اسرائیل نے بحیرۂ گلیلی کے پانی کا رُخ موڑ کر اپنے صحرائی علاقے آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے ممکنات یہ تھے کہ ایک طرف اسرائیل

نئی بستیاں بسالیتا اور دوسری طرف اُس کی زرعی اور اقتصادی قوّت میں بڑا اضافہ ہو جاتا۔ اسرائیل کے اس اعلان کا عرب دُنیا میں شدید ردِ عمل ہُوا۔ اس جوش اور جذبے کی شدت کو اپنے انداز میں بے اثر بنانا اب ناصر کا مسئلہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے وہ یہ بڑ ہانک چکا تھا کہ اگر اسرائیل نے پانی کا رُخ بدلا تو اسے اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا۔ اب اُس کے لیے ایک ہی متبادل راستہ رہ گیا تھا کہ وہ مایوسی اور ناکامی کا برملا اظہار کر کے یہ تسلیم کر لے کہ عرب، فوجی اور سیاسی اعتبار سے اسرائیل کی طاقت اور جارحیت کے سامنے بے بس ہو چکے ہیں اور جس اُونچے مقام سے وہ پہلے بڑ ہانک رہا تھا وہاں سے خود نیچے اُتر آئے۔ ناصر نے اپنی اہانت میں کمی لانے کے لیے عرب سربراہ کانفرنس کا منصوبہ سوچا کہ وہ اکیلا ہی اہانت کا سزاوار نہ بنے بلکہ دوسرے بھی اس میں شامل کر لیے جائیں۔

اس سربراہ کانفرنس نے تین تجاویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ناصر نے پانی کا رُخ پھیرنے پر اسرائیل کو جنگ کی دھمکی دے دی تھی اور کہاں یہ حالت کہ سربراہ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسرائیل کے اس منصوبے کے نتیجے میں عربوں کے علاقوں میں پانی کی قلت پیدا ہو جائے تو اُسے دریائے اُردن کے شمالی آبی راستوں سے پُورا کر دیا جائے۔ ایسی بلندی اور ایسی پستی!

دوسری تجویز کے تحت متحدہ عرب کمان (U. A. C) کا قیام عمل میں آیا ـــ دراصل یہ منصوبہ عرب ملکوں نے اپنا دفاع مضبوط کرنے کے لیے بنایا تھا لیکن اس کا پروپیگنڈہ بہت مختلف انداز میں کیا گیا کہ طاقت ور عرب سربراہوں نے اسرائیل سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ بہت جلد عربوں پر اس منصوبے کی حقیقت کھل گئی کہ اس کے نام پر اُن کے ساتھ انتہائی گھٹیا مذاق کیا گیا تھا۔

تیسری تجویز ایک فلسطینی تنظیم کے قیام سے متعلق تھی جس کے ذریعے فلسطینی عوام" اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنا کردار ادا کر سکیں"۔ یُوں پی ایل او کو پیدائش کا سرٹیفکیٹ مرحمت فرما دیا گیا۔

❋

عرب سربراہ کانفرنس کے چار ماہ بعد مشرقی یورپ میں پہلی فلسطینی قومی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ۴۲۲ فلسطینیوں نے شرکت کی۔ اُن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ مختلف حلقوں اور علاقوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اُن میں الفتح کے ارکان بھی تھے۔ خالد حسن نے مرکزی کمیٹی کی طرف سے شرکت کی۔ دوسرے روز مختلف عرب سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کے نمائندے بھی شامل ہوئے۔

خالد حسن نے جمہوریت کے ایک انتہائی جذباتی علمبردار کی حیثیت سے اس کانفرنس میں جو کچھ دیکھا، اس سے وہ دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ وفود کسی پالیسی پر بحث یا مذاکرات کرنے کے لیے یکجا نہیں کیے گئے تھے۔ اُن کی موجودگی محض اُن دستاویزات اور پروگراموں کی تائید

امریکہ اور ناصر کے درمیان کیا خفیہ معاہدہ طے پایا تھا؟

کرنے کے لیے تھی جو پہلے سے احمد الشکیری تیار کر کے لائے تھے۔ ان میں دو اہم دستاویزات فلسطینی قومی چارٹر اور پی ایل او کے بُنیادی منشور کے بارے میں تھیں، ان کی توثیق کر دی گئی۔ پی ایل او کے قیام کا اعلان ہُوا اور احمد الشکیری اس کے چیئرمین مقرر ہُوئے یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ تنظیم کا صدر دفتر قاہرہ میں ہو گا۔ خالد حسن نے صاف اُٹھایا کہ الفتح کی حیثیت منتخب آمریت کی ہو گی نہ وہ عرب حکومتوں کا آلہ کار بنے گی۔ کئی عرب حکومتوں نے وعدہ کیا کہ پی ایل او کو فنڈز کے بارے میں کبھی کوئی دِقت پیش نہیں آئے گی لیکن وعدوں کے باوجود پی ایل او کو ملنے والی رقم اتنی قلیل تھی کہ اس کے بل بوتے پر فلسطینی کاز اور فلسطین کے لیے کوئی نمایاں پیش رفت نہیں کی جا سکتی تھی۔ عام فلسطینی اور فلسطینی دانشور پی ایل او سے یہ توقع رکھتے تھے کہ اس کا ایک اپنا عسکری شعبہ بھی ہو گا یعنی آزادیٔ فلسطین کے لیے فوج کا قیام۔ الشکیری نے جو منصوبہ تیار کیا تھا، اُسے ناصر اور دوسرے عرب سربراہوں کی پُرجوش تائید حاصل تھی جبکہ شاہ حُسین نے اس سلسلے میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ پی ایل اے (فلسطینی لبریشن آرمی) کے دستوں کی تشکیل کے لیے طے پایا کہ تمام سرحدی عرب ریاستوں میں ان کو پروان چڑھایا جائے اور ممکن ہو سکے تو ان میں مزید توسیع کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ پی ایل اے کے یُونٹ جن ملکوں میں مقیم ہوں گے اُن ملکوں کی حکومتوں کا اُن پر مکمل کنٹرول ہو گا۔

عرفات، وزیر اور الفتح کی مرکزی کمیٹی کے دوسرے تمام ارکان کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہ تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک کوئی عرب حکومت اسرائیل کے خلاف جنگ کرنے پر انتہائی مجبور نہیں ہو جاتی اُس وقت تک آزادیٔ فلسطین کے نام پر قائم کی جانے والی فوج کی کوئی حیثیت نہ ہو گی۔

❋

احمد الشکیری میں ایسی کئی خصوصیات تھیں جن کے باعث وہ پی ایل او کے حوالے سے ایک اہم کھلونا بن سکتا تھا لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی کہ وہ ناصر کا آلۂ کار بننے کے لیے کیوں رضامند ہو گیا۔ احمد الشکیری ایک قوم پرست قائد تھا مگر تھا کرائے کا سپاہی جسے ہر اُونچی بولی دینے والا خرید سکتا تھا۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اُس نے معاوضہ لے کر اقوامِ متحدہ میں شام کی نمائندگی کی اور غالباً اس سے بھی زیادہ معاوضہ وصول کر کے اقوامِ متحدہ میں سعودی عرب کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا۔ وہاں پر مغرب پر اپنے غیر موزوں انداز میں تنقید کی کہ اُس کا رویّہ سعودی عرب کی ناگواری اور ناپسندیدگی کا باعث بنا۔ اہم اختلاف اُس وقت پیدا ہُوا جب احمد الشکیری نے یمن میں مصری جارحیت کے بارے میں سعودی عرب کی شکایات اقوامِ متحدہ میں پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں ناصر نے جنوبی عرب فیڈریشن بشمول عدن سے برطانیہ کو نکال باہر کرنے کے لیے لڑائی شروع کر رکھی تھی اور شاہ فیصل اُسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاہ فیصل نے احمد الشکیری کو نکال باہر کیا۔ ناصر نے اُسے عرب لیگ میں فلسطینیوں کے نمائندے کی حیثیت دلوا دی۔ یُوں احمد الشکیری کو ناصر کی پُوری حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔

ناصر سمجھتا تھا کہ احمد الشکیری اُس کے مقاصد پُورے کرنے کی بھرپُور اہلیت رکھتا تھا۔ فلسطینیوں میں احمد الشکیری کو ایک سچّے اور جنونی قوم پرست کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ یہی شہرت اُس کی سب سے قیمتی

حافظ الاسد نے عرفات کے سلسلے میں انٹیلی جنس کو کیا احکام دیے تھے؟

متاع تھی۔ تیسری اور چوتھی دہائی میں اُس نے اپنے لیے لوگوں کے دلوں میں بڑا جاندار تاثر قائم کر دیا تھا۔ وہ بہت ذہین تھا اور لفظوں سے کھیلنے کا گُر جانتا تھا۔ خطابت کے میدان میں اُس کا انداز ہٹلر اور پادری آئیان پیسلے کی طرح تھا۔ اسرائیلی کہتے تھے کہ یہ احمد الشکیری ہی تھا جس نے سب سے پہلے 'یہودیوں کو سمندر میں پھینک دو' کا نعرہ تخلیق کیا تھا؛ بہرحال حقائق کچھ بھی ہوں پی ایل او کے پہلے چیئرمین کی حیثیت سے الشکیری نے اپنی تقریر میں اسرائیل کو بڑی دھمکیاں دیں۔ اُس کی شہرت اور ذہانت کے امتزاج نے اُسے ایک موزوں ترین کٹھ پتلی بنا دیا۔

۱۹۶۴ء قریب آ رہا تھا کہ ناصر کو شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا جس کا ذکر اُس نے بعد میں الفتح کے رہنماؤں سے کیا تھا۔ سرحدی عرب حکومتیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ انھوں نے فلسطینیوں کی آزادی کا جو فرضی ڈھونگ رچایا ہے، اس کی قیمت انھیں اپنی حکومتوں کی تباہی اور نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ ان حکومتوں کی بہترین توقع یہ تھی کہ کسی طرح فلسطینیوں کے مسئلے کا کوئی مناسب حل نکل آئے تاکہ وہ اسرائیل کے ساتھ سمجھوتہ کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسرائیلی رہنما فلسطینیوں کے مسئلے میں مخلص ہوتے اور کسی حد تک عرب حکومتوں کا وقار بچانے کی کوشش کرتے تو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کبھی لڑی ہی نہ جاتی۔

ناصر کا مسئلہ فلسطین کے بارے میں رویّہ اور طرزِ عمل مبہم تھا جو ایک بے معنی اور بے بنیاد اُمید سے وابستہ تھا۔ اپنے خیالی تصورات اور مبہم اُمیدوں کا اظہار وہ اپنی تقریروں میں کرتا رہتا۔ اس ابہام سے فلسطینی عوام یہ تاثر لے رہے تھے کہ ناصر کبھی نہ کبھی اُن کے وطن کی آزادی کے لیے اسرائیل سے فیصلہ کُن جنگ لڑے گا؛ حالانکہ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اُسے یہ بھی خدشہ تھا کہ اُس کی ان بے معنی اور مبہم تقریروں سے اسرائیل اُس کے خلاف پروپیگنڈہ مہم تیز کر دے گا۔ اس لیے اُس نے اپنے تمام ذاتی اور خفیہ ذرائع بھرپور انداز میں بروئے کار لا کر تمام یورپی رہنماؤں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی پبلک تقریروں میں جو کچھ کہتا ہے اُن پر بالکل یقین نہ کیا جائے۔ اُس کا ذہن قطعاً تبدیل نہیں ہُوا اور وہ اب بھی اسی نظریے پر یقین رکھتا ہے کہ فلسطین کو مسلح جدوجہد اور جنگ کے ذریعے آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔

ناصر کی اسٹریٹیجی یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مفاہمت کے لیے حاصل کر سکے اور یہ مفاہمت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ اشک شوئی فلسطینیوں کی بھی ہوتی رہے۔ اسرائیلی رہنماؤں میں بہت سے ایسے تھے جو ناصر کی پوزیشن کو سمجھ رہے تھے لیکن ان کی اسٹریٹیجی یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں اور مغربی ممالک کو قائل کر سکیں کہ فلسطین کا مسئلہ سرے سے ختم ہو چکا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اسرائیلی وزیرِ اعظم مسز گولڈا میئر نے بی بی سی کے پروگرام 'پینوراما' میں انٹرویو دیتے ہُوئے کہا: "فلسطینی کہیں وجود نہیں رکھتے۔"

۱۹۶۳ء کے اواخر میں ناصر کو اندازہ ہو گیا کہ اُس نے جو مبہم اور گول مول پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ دونوں محاذوں پر خود اُس کے خلاف جا رہی ہے۔ فلسطینیوں کی ایک بڑی اکثریت کا اُس پر سے اعتماد اُٹھ چکا تھا اور وہ اُس پر شک کرنے لگے تھے۔ اسرائیل کا پروپیگنڈہ بڑا جاندار اور مؤثر تھا۔ اُس نے پروپیگنڈے کے محاذ پر جنگ جیت لی تھی۔ وہ پُوری دُنیا اور بالخصوص مغرب کو یہ باور کرانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے کہ یہودی ریاست شدید ترین خطرات اور تباہی کا سامنا کر رہی ہے۔ بعد میں ناصر نے الفتح کے رہنماؤں کو بتایا کہ خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ اندازہ کر چکا تھا کہ جب اسرائیلی پروپیگنڈہ مغرب کو پُوری طرح قائل کر دے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسرائیلی مصر پر حملہ کر دیں گے اور یُوں مصر کو اہانت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ناصر اسرائیلی رہنماؤں کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اقوامِ متحدہ اور امریکہ سے خُفیہ وعدہ کیا تھا کہ دس برس تک اسرائیل کے خلاف کوئی جارحانہ قدم اُٹھایا نہیں جائے گا۔ اس خُفیہ وعدے کی میعاد ۱۹۶۷ء میں ختم ہو رہی تھی اور اسرائیل فی الواقع اس فیصلے کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ اُسے ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء میں بھرپُور حملہ کرنا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس جنگ کے دباؤ سے عرب ممالک اُس کی شرائط پر امن کا معاہدہ کر لیتے ہیں تو معاملہ اُس کے حق میں نمٹ جائے گا اور اگر وہ متوقع جنگ کے دباؤ میں نہیں آئے تو پھر جنگ کے بعد عربوں کو کم از کم دس برس اپنی فوجوں کی بحالی ہی پر لگ جائیں گے اور یُوں اس مدت میں وہ سیاسی محاذ پر عربوں کے خلاف اپنا کام مکمل کر لے گا۔

۱۹۶۴ء کا آغاز ہُوا۔ ناصر کو اب ایک ایسی پالیسی اختیار کرنی تھی جس کے نتیجے میں فلسطینی اُس پر اپنا اعتماد برقرار رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی طاقتوں کو مناسب یقین دہانیاں کراتے ہُوئے مصر کو خطرات کی زد سے دُور لے جائے۔ حالات کا یہ وہ منظر تھا جس میں احمد الشُّکیری کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسرائیل کو مختلف النّوع دھمکیاں دلوانے کے لیے ناصر اُس پر تکیہ کر سکتا تھا۔ فلسطینی احمد الشُّکیری کو انتہا پسند قوم پرست سمجھتے تھے۔ وہ ناصر کا آدمی تھا، اس لیے فلسطینیوں نے یہ تاثر لینا شروع کر دیا کہ الشُّکیری، ناصر کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اسرائیلی بھی لازمی طور پر یہی نتیجہ نکال لیتے لیکن ناصر جب چاہتا الشُّکیری کے خیالات سے اختلاف کا اظہار کرتا یا اُسے نکال باہر کر سکتا تھا۔ یہ تھی ناصر کی حکمتِ عملی جس کے ذریعے ایک طرف فلسطینیوں کی زیرِ زمین خُفیہ سرگرمیوں کی روک تھام کر لیتا اور دوسری طرف فلسطینیوں کو بے وقوف بنا سکتا تھا؛ تاہم اُسے علم تھا کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔

احمد الشُّکیری کو بھی اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ وہ ناصر کی کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ جب خالد حسن اور احمد الشُّکیری الفتح اور پی ایل او کے باہمی اشتراک و تعاون کے امکانات پر مذاکرات کے لیے یکجا ہُوئے تو خالد حسن کی روایت کے مطابق احمد الشُّکیری نے بتایا کہ "تم جانتے ہو گے کہ مجھے تم لوگوں کا شکنجہ کسنے کے لیے لایا گیا تھا۔"

مَیں نے جب خالد حسن سے وضاحت پُوچھی کہ وہ اپنے الفاظ میں احمد الشُّکیری کا مفہوم بیان کر رہا ہے تو خالد حسن نے کہا:

"نہیں، یہی الفاظ تھے جو اُس نے کہے تھے۔"

وزیر نے بھی پی ایل او اور الفتح کے تعاون و اشتراک کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے احمد الشُّکیری سے مذاکرات کیے تھے۔ اُس نے بتایا کہ احمد الشُّکیری نے اعتراف کیا کہ حکومتیں کسی طور بھی پی ایل او کو آزادی دینے

فون : دفتر : ۴۱۵۲۱۰
بدر ایجنسیز پراپرٹی ڈیلرز
جائیداد کی خرید و فروخت کا بااعتماد ادارہ
گلشن راوی میں پلاٹوں کوٹھیوں کی خرید و فروخت کیلئے
بدر ایجنسیز سے رابطہ قائم کریں
پروپرائٹر: حاجی بدر — مقدس مارکیٹ گلشن راوی۔ لاہور

کے لیے تیار نہیں۔ وزیر نے کہا کہ ہم الفتح کو اس کا خُفیہ بازُو بنانے کے لیے تیار ہیں، کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ اس طرح ہم حکومتوں کو پی ایل او کی آزادی سلب کرنے سے باز رکھ سکیں گے۔ مذاکرات کے نتیجے میں الفتح کے ارکان اس نتیجے پر پہنچے کہ احمد الشُّکیری اُن کے ساتھ اشتراک کرنے پر آمادہ تھا لیکن وہ اسے عملی صُورت دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ اُسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

الفتح اگر بار بار احمد الشُّکیری سے رابطہ قائم کرنے اور کسی سمجھوتے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ الفتح کو اُمید تھی کہ ایسی صُورت میں پی ایل او کے اندرُونی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

❋

ناصر نے پی ایل او کے بارے میں فلسطینیوں کی زیرِ زمین خُفیہ سرگرمیوں کے بارے میں جو اندازہ لگایا، وہ بالکل صحیح نکلا۔ پی ایل او کے معرضِ وجُود میں آتے ہی الفتح کی تباہی شروع ہو گئی۔ عرفات اور وزیر نے خُفیہ طور پر کام کرنے والے شُعبوں اور کیڈروں کا جو جال تیّار کیا تھا، وہ تار تار ہو گیا۔ خالد حسن کا کہنا ہے:

"جس بُحران کا ہمیں سامنا کرنا پڑا اُس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں کی جا سکتی۔ ہم اپنے بیشتر فوجی کیڈروں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے کسی تنظیم کے بجائے فلسطین سے وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا؛ چنانچہ وہ الفتح کو چھوڑ کر پی ایل او میں شامل ہونے لگے۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ اُن کو اسرائیل پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ ہم بڑی ہی قلیل تعداد کو اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔"

❋

مختلف مواقع کے اندازوں اور اعداد و شمار کے مطابق الفتح اپنے اسّی یا نوّے فیصد کیڈروں سے محروم ہو گئی۔ ناصر نے کویت کے حُکّام سے کویت میں الفتح کے دفتر بند کر دینے کے لیے کہا۔ الفتح اگرچہ ایک خُفیہ زیرِ زمین تنظیم تھی لیکن ناصر کو انٹیلی جنس رپورٹوں سے علم ہو چکا تھا کہ کویت میں اس کے دفتر کو مرکزی دفتر کی حیثیت حاصل ہے۔ خالد حسن نے بتایا کہ کویتی حُکّام نے ہمیں مُطّلع کیا کہ وہ بیک وقت پی ایل او اور الفتح کے دفاتر قائم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ سرکاری طور پر اُنہوں نے ہمارا دفتر بند کر دیا لیکن غیر سرکاری طور پر ہمیں اپنا خُفیہ دفتر قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

عرفات کو توڑ پھوڑ کے ان واقعات سے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ فلسطینیوں کی اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے فوجی اقدام کا لمحہ اب آ چکا ہے؛ اگر یہ وقت گزر گیا تو فلسطینی ہمیشہ کے لیے اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔ ۱۹۶۴ء کے موسمِ گرما میں وزیر کے ساتھ مشورے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ چکا ہے کہ الفتح کی مرکزی کمیٹی فوجی اسٹریٹیجی کے حق میں اعتماد کا ووٹ دے۔ عرفات نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر اُسے اعتماد کا ووٹ حاصل نہ ہُوا تو وہ اپنے گروپ کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لے گا۔

اُسے اس بُنیادی سوال کا جواب ڈھونڈنا تھا جو اُس سے چینیوں نے پُوچھا تھا کہ وہ اپنے فوجی عمل کا آغاز کہاں سے کرے گا۔ اُسے سرحدوں پر واقع کسی عرب مُلک میں اپنا اڈّہ بنانے کی ضرورت تھی۔ مصر، اُردن،

...نان — میں ایسا کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔ صرف شام ...ال رہ جاتا تھا جہاں بعث پارٹی کی آمرانہ حکومت قائم تھی۔ ...اں فوجی مقاصد کے لیے اڈّہ بنانے کا روشن امکان ...وجود تھا لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی تھا کہ کیا وقت آنے ...ر بعث پارٹی شام پر ہونے والے اسرائیلی حملوں کا مقابلہ ...سکے گی، کیونکہ یہ طے شُدہ حقیقت تھی کہ الفتح کے فوجی ...اپریشن کے ردِّ عمل میں اسرائیل کا مشتعل ہو جانا لازمی ...تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب یاسر عرفات کے پاس ...ہونا ضروری تھا۔ الفتح کی مرکزی کمیٹی کے وہ ارکان جو اس ...اسٹریٹیجی کے خلاف تھے، اُنہیں ہمہ وار کرنے کے ...اس سوال کا تسلی بخش جواب ضروری تھا۔

❋

بعث کے لفظی معنی احیاء یا نشاۃِ ثانیہ کے ہیں۔ یہ ...پسند قوم پرست پارٹی ۱۹۴۳ء میں دمشق میں مائیکل ...اور اُس کے ساتھیوں نے قائم کی جو عرب سوشلسٹ ...کی نقیب تھی۔ اُن کے خیال میں اس طرح عرب متّحد ...سکتے تھے۔ مختلف سیاسی رہنما اپنے مقاصد کے لیے ...پارٹی کے نعروں کو اپناتے رہے۔ اور یُوں بعث ...، صدر ناصر کی نام نہاد انقلابی قیادت کی سب ...بڑی حریف بن گئی۔ الفتح کا وجود، اس حریفانہ کشمکش ...عرفات کی ہُنر مندی اور موقع پرستی کا مرہونِ منّت ہے۔ ...ات نے دونوں متصادم حریفوں کو مناسب وقت آنے ...ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے الفتح کا وجود ...ار رکھا۔

یاسر عرفات بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ...پارٹی کے بانی مائیکل افلق اور دوسرے ارکان سے ...شنا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ کئی بار خُفیہ طور پر دمشق گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شام میں جب پھر فوجی انقلاب آیا تو بعث پارٹی کی حکومت پر گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گئی۔ فوجی اور غیر فوجی شُعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ناصر کے حامیوں کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا۔

❋

اس فوجی انقلاب سے پہلے ہی دمشق میں عرفات کے حق میں فضا ہموار ہونے لگی تھی۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں عرب سربراہ کانفرنس کے موقع پر ناصر اور شامیوں کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہُوئی تھی۔ شامی وفد نے عرب سربراہوں کو بتایا تھا کہ اگر وہ متّحد ہو جائیں تو بلا تاخیر حملہ کر کے اسرائیل کو شکست دے سکتے ہیں۔

ناصر مشتعل ہو کر کہنے لگا:

"شامیوں کا دماغ چل گیا ہے کہ پی ایل او کی حیثیت کٹھ پُتلی سے زیادہ کی نہیں۔" یُوں قاہرہ اور دمشق کے درمیان اقتدار اور برتری کے لیے رسّہ کشی کا آغاز ہُوا۔ جب پی ایل او کا قیام معرضِ وجود میں آ گیا تو شام نے ایک خاص نکتے پر عرفات کو مطّلع کیا کہ ناصر اور اُن کے اختلافات کی اصل حقیقت کیا ہے۔ عرفات نے اس سے صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ اُسے دمشق آنے کی دعوت بھی دے دی گئی۔

دمشق میں یاسر عرفات کے دو بہت اہم رابطے تھے۔ ایک احمد سویدانی جو ملٹری انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر تھا۔ دوسرے ایئر فورس کے کمانڈر حافظ الاسد جو بعد میں شام کے صدر بنے۔ یہ دونوں اہم شامی عہدیدار عرفات کو مطلوبہ مدد پہنچانے کے حق میں تھے، اگرچہ اِن کے محرکات جُدا جُدا تھے۔

سویدانی جذبۂ جہاد رکھنے والا ایک مسلمان تھا۔ ناصر کی طرح اُس کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ عرب اسرائیل کے خلاف روایتی جنگ لڑ کر کبھی فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ اُس کے

خیال میں عربوں کے لیے ایک ہی عسکری انتخاب باقی رہ گیا تھا کہ اسرائیل کو مسلسل گوریلا جنگ میں اُلجھائے رکھیں۔ سویدانی جنرل گیاپ کا بے حد مدّاح تھا جس نے ویت نام میں پہلے فرانسیسیوں اور پھر امریکیوں کو گوریلا جنگوں ہی سے شکست دی تھی۔ سویدانی چاہتا تھا کہ تمام عرب ریاستیں جو سرحد پر واقع ہیں اسرائیل کے خلاف گوریلا جنگ میں شریک ہو جائیں۔ اُس کی یہ بھی خواہش تھی کہ شام سب سے آگے ہو اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔ اپنے اس نظریّے کی وجہ سے وہ عرفات اور الفتح کے ساتھ پُرخلوص تعاون کا حامی تھا۔

حافظ الاسد کی حمایت کی وجہ بڑی سادہ اور بہت کم مخلصانہ تھی۔ اُس نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو شام کا صدر بنانے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ فلسطینیوں کا پتّا اُس کے ہاتھ میں ہو۔ ناصر کا آلۂ کار احمد الشکیری تھا۔ حافظ الاسد عرفات کو آلۂ کار بنانا یا پھر اُسے وقت آنے پر تباہ کر دینا چاہتا تھا۔ ابتدا ہی سے عرفات کو شامیوں کے ساتھ اپنے تعلّقات کے بارے میں کوئی واہمہ یا غلط فہمی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شامی اُسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں گے اور وہ اُنھیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ ایک ایسا طے شدہ امر تھا جس کا نتیجہ مصائب کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن ۱۹۶۴ء کے موسمِ خزاں میں عرفات ہر کہیں سے مدد لینے کا آخری فیصلہ کر چکا تھا۔

عرفات نے سویدانی سے صرف تین چیزوں کے لیے کہا۔ شام میں الفتح کی تنظیم کے لیے اجازت، اُن ہتھیاروں کو ذخیرہ کرنے کی اجازت جن کی اُسے الجزائر اور چین سے ملنے کی توقّع تھی اور ایک فوجی بیس جہاں اُس وقت الجزائر میں زیرِ تربیت الفتح کے افسر تربیت حاصل کرنے کے بعد نئے رنگروٹوں کو تربیت دے سکیں۔ اس وقت الفتح کے پہلے بیس ہمہ وقتی فوجی افسر الجزائر کے ملٹری سٹاف کالج میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔

سویدانی کا پہلا ردِّعمل حوصلہ افزا تھا۔ اُس نے عرفات کو بتایا مجھے اُمّید ہے کہ مَیں اعلیٰ افسروں سے الفتح کے لیے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا، تاہم اُس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ شام کی طرف سے جو مدد مہیا کی جائے گی وہ مشروط بنیادوں پر ہو گی، غالباً اعلیٰ احکام اس پر اصرار کریں گے کہ شامی علاقے سے اسرائیل پر کوئی حملہ نہ کیا جائے۔ عرفات کو یہ سُن کر کوئی تعجب نہ ہُوا۔ اُسے پہلے ہی سے یہ اندازہ تھا کہ شامی دونوں صورتوں میں بہترین نتائج حاصل کرنے کے طلبگار ہوں گے۔ آزادیٔ فلسطین کی مدد کا ڈھنڈورا پیٹ کر وہ اس کا اعزاز حاصل کریں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ احتیاط بھی کریں گے کہ اسرائیلی غیظ و غضب کا نشانہ نہ بن جائیں۔ اسرائیل پر جو حملے کیے جائیں گے وہ لبنان اور اُردن سے ہوں گے۔ سویدانی نے عرفات کو یقین دلایا تھا کہ دسمبر میں اُسے بہتر جواب دے سکے گا۔

❋

اسرائیلی حکومت اعلان کر چکی تھی کہ فلسطینی 'دہشت پسندوں' کی تمام تر سرگرمیوں کی ذمّے داری عرب حکومتوں پر عائد ہوتی ہے جو انھیں مدد فراہم کر رہی ہیں۔ مصر، اُردن اور لبنان اس اعلان سے اتنے خوفزدہ ہُوئے کہ اسرائیلی حملے کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلانے لگا۔ ان حکومتوں نے اپنی انٹیلی جنس سروسز کو حکم نامے جاری کیے اور الفتح کو تباہ اور اس کے رہنماؤں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ناصر نے عرفات کے سر کی قیمت مقرر کر دی۔ الفتح کی مرکزی کمیٹی کے ارکان جو کویت میں تھے اور فوجی کارروائی کے مخالفت تھے اُن میں ابتری پھیل گئی۔ اُنھوں نے ناصر سے رابطہ قائم کر کے اُسے یقین دلانا چاہا کہ الفتح شام کی آلۂ کار نہیں اور ناصر کا اندازہ غلط ہے کہ وہ اُس کی دشمن ہے۔ عرفات خود خوفناک شُبہات کی وجہ سے شدید پریشان تھا۔ کیا لڑائی آخری

الفتح پر سب سے نازک وقت کب آیا تھا

ہے؟ کیا واقعی اس کا کوئی نعم البدل نہیں؟ کیا اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ فلسطینیوں کو مسلح جدوجہد کے لیے آمادہ کرے جس میں ہزاروں جانیں تلف ہونے کا حقیقی خطرہ تھا۔ عرفات ان سوالوں سے خوفزدہ نہیں تھا، وہ ان کا سامنا جرأت سے کر رہا تھا اور ان کے جواب بھی پا چکا تھا؛ البتّہ یہ شُبہ اپنی جگہ باقی تھا کہ یہ جوابات دُرست ہیں یا نہیں؟ اور ان کی صداقت کے لیے وہ کس سے رجوع کرے؟

عرفات اس منتشر اور تکلیف دہ ذہنی حالت میں تھا کہ اس نے وزیر کی رفاقت میں فادر رایاز سے گفتگو کرنے کے لیے کویت سے بیروت کا سفر کیا۔ سوال یہ تھا کہ رُوحانی رہنمائی کے لیے اُس نے ایک کیتھولک راہب ہی کا انتخاب کیوں کیا۔ یہ ایک اسرار ہے۔ فادر رایاز اور عرفات کے درمیان جو مکالمہ ہُوا، اس کی تفصیل فادر رایاز ہی سے سُنیے:

"عرفات نے مجھ سے پُوچھا کیا مَیں اُس کے خیالات سے اتفاق کرتا ہُوں۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں دل سے اُس کی تائید کرتا ہُوں۔ پھر عرفات نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جو اُس وقت ایک اہم راز کا درجہ رکھتی تھی۔ اُس نے انکشاف کیا کہ جب پہلے پہل الفتح نے فوجی کارروائیوں کا آغاز کیا تو اُس وقت اُس کے پاس صرف سات تربیت یافتہ جنگجو تھے اور پانچ رائفلیں۔ ایک دوست نے الفتح کے لیے ایک ہزار ڈالر کا چیک دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بتا دیا تھا کہ چونکہ اکاؤنٹ میں ابھی رقم نہیں، اس لیے اسے کیش کرانے میں دو یا تین ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔

عرفات اور وزیر قائل ہو چکے تھے کہ اگر الفتح کے لیے نئے رنگروٹ بھرتی کرنے، ان کی تربیت اور گوریلا جنگ کے لیے مناسب ہتھیاروں کی فراہمی کا انتظار کیا گیا تو اتنی تاخیر ہو جائے گی کہ الفتح کبھی مسلح جدوجہد کا آغاز نہ کر سکے گی۔ پیسوں کی فراہمی کا معاملہ فوجی کارروائیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا باعث بن جائے گا؛ تاہم یہ اُمور اُن کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں تھے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ مرکزی کمیٹی مزید تاخیر کیے فوجی کارروائی کے فیصلے پر صاد کر دے۔

ابو جہاد نے مجھے بتایا: "مَیں نے اور عرفات نے دو نکات تیّار کیے۔ پہلے نکتے کے بارے میں ہم نے مرکزی کمیٹی کے ارکان کو بتایا کہ ہم حکومت ہیں نہ باقاعدہ فوج۔ ہم اپنی سرزمین پر بھی نہیں؛ چنانچہ اس طرح کی کوئی تنظیم نہیں بن سکتی جس طرح ہمارے ساتھی ہم سے مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے امکانات موجود نہیں کہ ہم فوجی کارروائی کے آغاز سے پہلے منظم ہو سکیں۔ دوسرے نکتے کی تفصیل یُوں بیان کی کہ ہمارے حالات اس طرح کے ہیں جن میں انقلابی طرزِ فکر اور انقلابی اسٹریٹیجی اپنانے کی ضرورت ہے اور انقلابات کبھی تیاریوں سے جنم نہیں لیتے، بلکہ ان کا آغاز کیا جاتا ہے، اس لیے ہم اپنی مسلح جدّوجہد کا آغاز کریں گے اور اپنی قوّت اسی جدّوجہد کے ذریعے بڑھائیں گے۔"

ان بنیادی نکات میں وزن پیدا کرنے کے لیے عرفات اور وزیر نے اس پر بہت زور دیا کہ اب الفتح کی کارکردگی آزمانے کا وقت آ چکا ہے۔ ہم اپنا بہت پروپیگنڈہ کرتے آئے ہیں۔ الفتح لوگوں کے دلوں میں توقعات پیدا کر چکی ہے، اس لیے اب اگر وہ میدانِ عمل میں نہ آئی تو ہم اُن زیرِ زمین کام کرنے والے ساتھیوں کا بھی اعتماد کھو بیٹھیں گے جنھوں نے ابھی تک کٹھ پتلی تنظیم پی ایل او میں شمولیّت اختیار نہیں کی۔ ابو جہاد نے مزید بتایا: "ہمیں اپنی کارکردگی اور صلاحیت کو چین اور دوسرے ملکوں کی نگاہوں میں بھی ثابت کرنا ہو گا جو ہمیں ہتھیار دینے کا وعدہ کر چکے

ہیں۔ اُس وقت کوئی ہماری مدد اور اعانت نہ کرے گا جب تک ہم اپنے نصب العین کے ساتھ صحیح معنوں میں اخلاص کا ثبوت فراہم نہ کر دیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ جن دروازوں پر ہم دستک دے رہے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اُس وقت تک نہ کُھلیں گے جب تک ہم لڑائی کا آغاز نہیں کرتے۔"

اگرچہ الفتح کے رہنما آج بھی اس حوالے سے گفتگو پر آمادہ نہیں ہوتے لیکن اُن دنوں الفتح شدید انتشار اور بُحران کا شکار ہو کر ٹوٹنے یا تباہ ہونے والی تھی، کیونکہ اس مسئلے پر مرکزی کمیٹی کے ارکان میں جو تناؤ پیدا ہُوا وہ بہت خطرناک صُورت اختیار کر چکا تھا۔ مرکزی کمیٹی کے ارکان میں سے ایک غالباً یُوسف امیرا کے مُستعفی ہو جانے سے ووٹوں کی تقسیم دونوں طرف پانچ پانچ رہی۔ آدھے فوجی اقدام کے حق میں تھے اور آدھے خلاف۔ یہ صُورت اگر قائم رہتی تو یقینی طور پر الفتح میں پھُوٹ پڑ جاتی۔ خالد حسن نے تصدیق کی ہے کہ آخری نتیجہ یاسر عرفات کے حق میں پانچ ووٹوں کی تائید سے برآمد ہُوا جبکہ مخالفت میں چار ووٹ تھے۔

خالد حسن نے جو تعاون کیا اُس کے نتیجے میں عرفات کو فتح حاصل ہوئی مگر عرفات کے ساتھ خالد حسن کے ارادوں کی لڑائی ختم نہیں ہُوئی، بلکہ ایک نئے اور ڈرامائی مرحلے میں داخل ہو گئی جب عرفات نے مرکزی کمیٹی کی ہدایات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس تصادم کا سبب آرا میں اختلاف تھا۔ بعض اُمور میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک تو یہ اُلجھن تھی کہ اجتماعی قیادت نے کس حد تک مسلح جدّوجہد کی ذمے داری قبول کی ہے۔ مرکزی کمیٹی کے وہ ارکان جنھوں نے عرفات کے منصوبے کی مخالفت کی تھی اُن کا تاثر یہ تھا کہ جو مملکتِ عمل طے پائی ہے، وہ قطعی نوعیت کی نہیں۔ اور اس پر نظرِ ثانی اس روشنی میں کی جائے کہ عرب حکومتوں کا ردِ عمل کیا ہے۔ اُنھوں نے استفسار کیا تھا کہ اگر عرب حکومتوں نے الفتح کو تباہ کرنے اور کچلنے کی کوشش کی تو اس صورت میں کیا الفتح ان عرب حکومتوں کے خلاف جنگ کرے گی؛ یا اس تصادم کے پیشِ نظر اپنا رُخ پھیر کر عرب حکومتوں کے ساتھ اشتراک اور تعاون کی اُمّید میں مشترکہ اسٹریٹیجی وضع کرنے کے لیے انتظار کی پالیسی اپنائے گی۔

آخری لمحوں میں ایک اور فیصلہ ہُوا کہ فوجی کارروائیاں العاصفہ (طوفان) کے نام پر شروع کی جائیں گی۔ (جاری ہے)

افطار کے وقت روزے دار ڈھیر سارا ٹھنڈا پانی پی جاتا ہے مگر پیاس ہے کہ بُجھتی ہی نہیں۔ دُوسری طرف ہاضمے کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ سرد اشیا کا فوراً معدے میں پہنچ جانا ہاضمے کی خرابی کا باعث بنتا ہے جبکہ پیاس سے بھی تسکین نہیں ملتی۔ ذائقے اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس اُسی وقت تک ہوتا ہے جب تک غذا مُنہ میں رہے اس لیے اسے نگلنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ پیاس کی شدّت پر قابُو پانے کا نُسخہ یہ ہے کہ آپ حسبِ ضرورت دو تین گلاس پانی یا شربت پی لیں اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی کے گھونٹ کچھ دیر مُنہ میں رکھ کر کُلّیاں کرتے جائیں۔ اس طرح ایک ڈیڑھ گلاس پانی سے کُلّیاں کرنا آپ کے لیے باعثِ تسکین ہو گا۔

پیاس دُور کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ٹھنڈے تربوز کا گودا دیر تک مُنہ میں رکھیں اور اُس کی ٹھنڈک ختم ہونے پر کھائیں۔ یُوں تربُوز کی ایک بڑی قاش پیاس کی شدّت دُور کر دے گی۔

ڈاکٹر فرید الدین احمد ، لاہور

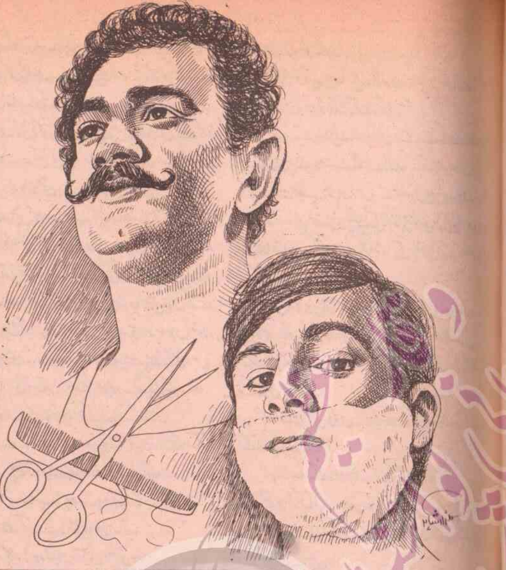

چھوٹی حقیقتوں کا ایک بڑا زندہ افسانہ

Pakistanipoint
Waqar Azeem

جو چھوٹ گیا

الطاف فاطمہ

یہ تقریباً ۱۹۰۰ کے آگے پیچھے کا زمانہ ہو گا کہ تازہ وارد ایک نئے نویلے کمشنر کا دورہ پڑ گیا۔ اپریل کے جاتے دنوں کی چاپ اور مٹی کی الی دانوں کی مہک بہت واضح طور پر محسوس ہونے لگی تھی۔

موسم کچھ ایسا ناگوار بھی نہ تھا مگر نئے نویلے صاحب پر یہ رُت کچھ زیادہ ہی بھاری پڑتی تھی۔ دو ہی دن میں اُن کا مُنہ لال چقندر رہنے لگا۔ رہ رہ کر رومال کالر تلے گردن کے گرد جماتے کہ بالوں کی جانب سے بہہ بہہ کر آنے والے

پسینے کا کچھ تو سدّباب کیا جا سکے۔ یہی وہ امر تھا جو حجامت بنوانے اور گل مُچھوں کے بال ہلکے کروانے کا محرّک بنا۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ پیش کار ہی سے رجوع کیا ہو گا۔

"یہاں کوئی! کوئی کُچ کُچ اچھے قسم کا باربر مل سکے گا؟"

'اچھے قسم کا' سے اُن کی مراد حفظانِ صحّت کے اُصولوں پر پُورا اُترنے والا تھی۔

اپنے پیش کار صاحب کو یہ عارضہ لاحق تھا کہ صاحب کے مُنہ سے فرمائش نکلی نہیں کہ وہ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر پل پڑتے، تھرتھراتے اور اُن کی گردن بے ضرورت آٹومیٹک طور پر ہلنا شروع کر دیتی۔ وہ ہتھیلیاں رگڑتے، ہنہنانا شروع کر دیتے۔ الغرض اس بھری دوپہر میں اُنہوں نے ہلچل مچا دی ــــ ایسی کہ سہ پہر سے پہلے پہلے کوئی دس ایک حجام اپنی کسوتوں سمیت موجود تھے بلکہ ایک دو مُٹّھی چپّی والے بھی لائن حاضر کر دیے گئے۔

قیلولے کے بعد، جسے وہ 'سیستا' بولتے تھے، صاحب غسل خانے چلے تو دوبارہ حجامت کا خیال آگیا۔

"وِل مُنشی صاب! وہ ... وہ آپ کا ... آپ کا ..."

صاحب بات کم کرتے ہاتھ زیادہ ہلاتے۔

"جی سرکار! وہ خاص تراش (مُنشی صاحب کے ایک مزاج دان) حاضر ہیں۔" حُسنِ کارکردگی کی آبیاری نے اُن کا چہرہ پھُول کے مانند کھلا رکھّا تھا۔

وہ خاص تراش خاک حاضر تھے! تمام دوپہر ڈاک بنگلے کے احاطے میں نیم کی چھاؤں تلے کچھ سوتے اور کچھ جاگتے اور بیڑیاں پھونکتے رہے۔

سرکار ایک دم ٹھٹکے۔ پھر استفسار کیا۔

"وِل تُم نے کیا بولا؟ وہ کون ہیں جو حاضر ہیں؟"

"عالی جاہ خاص تراش!"

"اچّھا! اچّھا باربر!" اُنہوں نے انگوٹھے کے ساتھ والی اُنگلی اُونچی کی اور پھر اس کا رُخ زمین کی جانب کیا۔ "خاص تراف؟"

"نو سر! عالی جاہ مَیں نے خاص تراش عرض کیا تھا۔"

(ہاتھ جوڑتے ہُوئے)

"اچّھا! تو آپ ایسا کریں گا کہ وہ ہمارا وکیبلری والا لائیں گا۔ ہم یہ ورڈ نوٹ کرنا مانگٹا۔"

ایک ایک حرف اور اُس کے ہجے لکھنے اور ... کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے ... سرکار عالی جاہ اس وقت طلبِ علم اور اس کے حصول میں مصروف ... ایسے کہ سر پیر اور اپنی پسینے کی غرقابی کا خیال بھی ذہن ... نکلا ہُوا تھا چہ جائیکہ خاص تراشوں کی انتخابی پریڈ کا خیال رکھتے۔

اس اثنا میں تمام خاص تراش اپنی اپنی جانوں ... بیزار ہو چکے تھے اور ان میں جو اصل نسل اور خاندانی ... کے خاص تراش تھے، وہ تو اپنی اپنی کسوتیں اُٹھا، بڑبڑا ... یہ کہتے چل بھی دیے:

"لعنت! جہنّمی لوگوں کے گیسوؤں کی اصلاح کریں ... گے تو اور کیا ملے گا؟"

اب جو رہ گئے وہ اچکّوں جیسی شکلوں والے چُھٹے قسم ... نائی تھے جو سڑک کنارے چٹائی ڈال کر آتے جاتے ... لوگوں کے سروں کی گھٹائی کے علاوہ نتھنوں کے بال ... اور ناخن تراشتے ہیں۔

خدا خدا کر کے حجّام، صاحب کے سامنے سے قطار بند چلتے ہُوئے گزرے تو اُن کے درمیان دو ... مٹّھی چپّی والے بھی شامل تھے۔

صاحب نے ایک سرے سے حجّاموں کی کسوتیں کھُلوانا اور ناک بھوں چڑھا چڑھا کر رد کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اُن کے ذہنِ مبارک سے بار بار لرز لرز کر اَن ہائی جینک یعنی مضرِ صحّت کا لفظ نکلتا تھا۔ صاحب نے لنگڑے مُٹّھی چپّی والے کو، جس کی ایک ٹانگ چلتے میں زمین پر لوٹ جاتی تھی، البتّہ رُک جانے کو کہا، باقی سب کو چلتا کیا۔

اب پیش کار کا انجام دیکھیے کہ دن بھر اچّھی اُجرت کے سبز باغ ہی نہیں دکھائے تھے بلکہ کمشنر صاحب کے

حوالے سے عام طور پر اُجرت کے نرخ بڑھا دینے کا گُر بھی سکھا دیا تھا؛ چنانچہ مایوس لوٹنے والوں نے وہ بھگو بھگو کر لگائیں کہ مُنشی صاحب کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔

دورے کے اختتام پر افسر بلدیات نے پیشی کے رجسٹر اور ہدایات کی فائلیں سنبھالتے سنبھالتے یُوں ہی تکلفاً پُوچھ لیا:

"اور کوئی تجویز، کوئی مشورہ جناب؟"

تب صاحب کو گویا کچھ یاد آ گیا۔ بڑے مُشوّش اور معترض انداز میں تقریباً سرگوشی کرتے ہُوئے بولے:

"افسر صاحب! اس اتنے بڑے شہر میں حکّامِ بالا خصوصاً صاحب لوگوں کی ہیئر ڈریسنگ کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ ٹھنڈی سڑک (مال روڈ) پر بھی کوئی ہیئر کٹنگ سیلون یا کوئی ... کوئی ..."

یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گئے، جبڑا سخت کر لیا اور نگاہ تر چھی ہو گئی، اور افسر صاحب کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ناراضی اور ناگواری کا سبب کیا ہے۔

عاجزی سے عرض کیا: "حضور! اگلی دفعہ تشریف لائیں گے تو زحمت نہ ہو گی۔"

"کیا بولا تُم نے زحمٹ؟ ... مگر یہ تو کوئی اچّھی باٹ ... پھر ..." انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی نیچے اور پھر اُوپر کو جانے لگی۔ وکیبلری والی نوٹ بُک میں نئے الفاظ کا اضافہ ہونے لگا۔ ہجے کیے گئے۔ معنی رٹے جانے لگے۔

کسی بلدیاتی اسکول وغیرہ کے اجرا کا معاملہ ہوتا تو شاید بڑے لمبے چکر پڑتے، فائلیں اُوپر سے نیچے، نیچے سے اُوپر ہونے لگتیں اور آخر گردش سے تھک کر لال فیتے میں بڑے آرام سے پڑ کر سو گئی ہوتیں ــــ مگر یہ تو صاحب کے دوسرے دورے سے پہلے پہلے ایک عدد ہیئر کٹنگ سیلون ٹھنڈی سڑک پر کھُلوانے کا مسئلہ تھا جس میں صاحب لوگ اور میم صاحبان اُن دنوں جبکہ جراثیم کا وہم عجب طرح سے اُنہیں لرزاں و ترساں رکھتا تھا، بے تکلّف اور

ابتدا اور انتہا کی وسعتوں پر ہے محیط
زندگی کا شہر ــــ شہرِ لازوال
شورشوں اور حادثوں کی سلطنت!
جس کے دُور اُفتادہ گوشے کی بلندی پر ہے قائم
ایک باغ ــــ خوشنما حیرت کا باغ

(سندھی سے ترجمہ: ــــ محسن بھوپالی)

بلاخوف اصلاحِ گیسو کروا سکیں؛ چنانچہ اگلے ہی دن حجّام صاحبان محکمۂ بلدیات کے چکّر کاٹتے نظر آئے۔

مختصر یہ کہ ایک خوش وضع، خوش قطع، دراز قامت، گھنی اور بل دار مونچھوں اور غلافی آنکھوں والے حجّام کو ترجیح دی گئی کہ وہ اپنا تعلّق مغلیہ حاکمِ شہر کے خاص تراش سے بتاتا تھا اگرچہ دیگر حجّام صاحبان کی رائے اس کے برعکس تھی۔ خلیفہ صاحب اور افسر صاحب کے درمیان معاہدہ کچھ یُوں طے پایا کہ دُکان کی فراہمی سے لے کر بورڈ لکھوانے کی ذمّے داری اُن کی، اور خلیفہ تو بس اگلے دورے سے پہلے پہلے ایسی دُکان چالو کر دے کہ ایک بار تو صاحب فیتہ کاٹنا ہی بھُول جائے۔

اور بات یہ تھی کہ وہ خاندانی خلیفہ ہو نہ ہو مگر دُکان اُس نے ایسی سجائی کہ مانو کوئی انگلستان سے دُکان کی تصویر فریم میں جڑوا لایا ہو۔

"حد کر دی اس خلیفہ نے تو!" ہر طرف سے یہی صدا آئی تو خلیفہ اپنی گھنی مونچھوں تلے بڑے ناز اور ٹھسّے سے مُسکرایا۔

اب اس ہجوم اور عوام کے اژدحام کا کچھ نہ پُوچھیے جو ایک بار صاحبان کے بال کٹا کر نکلنے کے بعد ہُوا۔

ٹھنڈی سڑک کی اس شفّاف اور برق دم دُکان میں کتنے ہی لڑکے تربیت لے کر ہیئر ڈریسر بنے۔ ایک خُنک اور خاموش پُرسکون گوشے میں کہ ابھی امپورٹڈ کاروں کے

شورُوموں اور اُن کی پوشاکوں کے کاروبار کا اس سڑک نے خواب بھی نہ دیکھا تھا، اس سیلون پر بڑے میلے اور بڑی رونقیں اُتریں۔ آڑو، باڑو بھی نئے نئے سیلون کھلتے گئے مگر اس کی بات ہی اور تھی! سیلون کیا تھا ایک صحت گاہ، آپریشن تھیٹر کہیے جسے۔ یُوں لگتا تھا جیسے شہر کے سب سے اُونچے اسپتال کے گورا وارڈ میں داخل ہو گئے ہوں ــــــ معبدوں کا سائنٹفک تقدس لیے ہُوئے۔

دیگر سامانِ آرائش و آسائش کے علاوہ اس سیلون کا امتیاز اس کے پُشت در پُشت ... خاص تراشوں یعنی باربروں کی فریموں میں لگی متعدد تصاویر تھیں اور اُن کے مقابلے میں حضور ولی عہد بہادر پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کی تصویری جھلکیاں، کئی جرنیلوں کے سرٹیفکیٹ اور سب سے بڑھ کر کپلنگ صاحب کے دستِ خاص کی سند۔ سچی بات ہے کہ سکندر بخت، جو لارڈ کرزن کا ذکر بھی رواروی میں کرتا تھا، کپلنگ صاحب کا نام یُوں لیتا تھا جیسے کوئی اپنے مُرشد کا ذکر کرتا ہو... سکندر بخت کے لڑکپن نے کپلنگ صاحب کی ادھیڑ عمری اور پھر بڑھاپا سب ہی کچھ دیکھا تھا۔

وہ کبھی کبھی کیا اکثر میرا سر بڑی نفاست سے تھامتے ہُوئے کسی اور رُو اور زمانے میں پہنچ جاتا اور کہا کرتا: "میاں، والد صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ رُوحوں کے بھی اپنے راز ہوتے ہیں۔ رہتی کسی جسم میں ہیں، ہوتی کہیں اور ہیں۔ کشش کہیں اور کو لے جاتی ہے اور بعض اوقات تو یُوں ہوتا کہ رُوح اور تن کا رشتہ جوڑنا بھی دشوار ہوتا ہے، سو یہی معاملہ کپلنگ صاحب کے ساتھ تھا۔"

لیکن میں سکندر بخت کا ذکر ابھی سے کہاں لے کر بیٹھ گیا ہُوں اور اس سے بڑھ کر خود اپنا بھی۔ یہ جناب بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو مجھے ٹھنڈی سڑک پر کمشنر صاحب کی مرضی سے کھلنے والے سیلون کی آن بان کا ذکر کرنا ہے۔ یہ سارا گھپلا کپلنگ صاحب کی بنا پر ہُوا۔

اور ان استاد پر بھی مستزاد یہ خصوصیت تھی اس خاندان کے کئی افراد اصلاحِ گیسُو کی تربیت لینے کے خیال سے عازمِ انگلستان ہُوئے تھے اور سکندر بخت اس گھرانے کی ایک کڑی تھا، آخری کہنے میں بھی مجھے کوئی باک نہیں۔ وہ اب تک وہاں کا سِلا ہوا سُوٹ زیبِ تن کرتا تو اُس کی آنکھیں روشن ہونے لگتیں۔ دراز قامتی کا موروثی انداز اگرچہ نکلتے ہُوئے درمیانے سراپا میں ڈھل گیا تھا، مگر ہجوم اور انبوہ میں بھی نمایاں رہتا۔ مرورِ ایّام نے رنگت میں بھی خلل ڈالا تھا۔ اُجلے اُجلے نکھرے نکھرے آبائی رنگ میں زمانے کی سُرمئی رمق نے گندم گونی اُبھار دی تھی مگر آنکھوں کا وہی موروثی غلافی انداز اور دکھاوٹ میں آن بان ــــ وہی بل کھائی گھنی گھنی مونچھوں کا اُسلوب۔ بڑے ٹھسّے والا ہیئر ڈریسر۔ بڑے ناز نخرے والا اُستاد۔

صبح اور سہ پہر کے مخصوص اوقات میں دُکان کی مخصوص برق دم یونیفارم پہنے، بیٹی میں دُکان کا مونوگرام سجائے وہ گھڑی کی سُوئی کے ساتھ نمودار ہوتا۔ اُس کی آمد گاہکوں اور دوسرے باربروں میں ہلچل مچا دیا کرتی۔ "اُستاد آ گئے، اُستاد آ گئے" کی دھیمی آوازیں گردش کرتیں۔

ایک بھرپور نظر اپنے منتظر گاہکوں پر ڈالتے ہُوئے اُستاد اپنی آستینیں اُوپر چڑھاتا، کھونٹی پر سے سفید برّاق اوورآل بالکل سرجنوں کے انداز میں پہنتا۔ کیبن کے دروازے پر کھڑے ہو کر وہ چشم و ابرو سے اشارہ کرتے کرتے زیرِ مونچھ تبسّم کرتا تو اُس کے فن اور مہارت کا اسیر گاہک، بے داغ سفید پردہ سرکا کر اندر داخل ہوتا اور ساتھ ہی باوقار انداز میں نپے تُلے قدموں وہ بھی اندر جاتا۔ مضبوط شفّاف، نرم نرم مخروطی اُنگلیوں والے ہاتھ آگے بڑھتے، بڑی نفاست سے گاہک کا سر کُرسی کے ایک خاص زاویے میں ٹکا کر آئینے کے مقابل کرتا۔ گویا آپریشن شروع ہو جاتا۔ اسی سرجنوں والی مشّاقی اور احتیاط سے

وہ اصلاحِ گیسو کے تمام آلے ایک ایک کر کے اُٹھاتا اور استعمال کرتا۔

اُس کی محویّت اور انہماک کا وہ عالم ہوتا جیسے کوئی مجسمہ تراشتا ہو، کوئی صورت گری کرتا اور نین نقش اُبھارتا ہو۔

مہارت کے ساتھ سبک سبک چلتے ہاتھوں اور نرم اور دھیمی آواز میں اُس کی باتوں کا سحر گاہک کی رُوح کو راحت دیتا۔

اور یہ رُوح کا بھی کچھ پتہ نہیں ملتا۔ کتنی ہی خراب و خستہ اور کثیف کیوں نہ ہو، آگہی، خلوص اور محبّت میں راحت پاتی ہے۔ اس کے گداز سے یُوں پگھلتی ہے جیسے شمع اپنی تپش سے پگھلتی ہو۔ یُوں خالص ہوتی ہے جسے سونا گاز سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا اور صاف ہوتا ہو۔ سکندر بخت کا گاہک بھی اُس کے طلسم میں جکڑا، آئینے کے مقابل ایک ناقابلِ بیان راحت سے ہمکنار ہوتا۔ کلکٹر اور کمشنر سے اُوپر سوچتے جائیں، کس کس کا سر اُس کے آگے نہ جُھکا تھا مگر اُس کا اپنا سر کسی کے آگے خم نہ ہُوا۔ وہ دو آئینوں کے درمیان کھڑے ہو کر خود اپنی حجامت ایسی بناتا کہ کوئی جان ہی نہ سکتا، ان بالوں کو کسی غیر کا ہاتھ نہیں لگا۔

ایک بار اُس نے میرے بالوں کو مشین سے سنوارتے اور دھیمی دھیمی آواز میں باتیں کرتے کرتے، بڑی گہری سانس لے کر کہا تھا: "یہاں کس کی بجی ہے۔ کس کی رہی ہے۔"

اُس کی آواز گمبھیر تھی۔ اُس کے لہجے میں ایک عجب اسرار تھا کہ سُننے والا کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ آخر یہ حجّام ہے یا کوئی فلسفی۔ کہتے ہیں اسلام کی قرونِ وسطیٰ میں بھی کچھ ہوتا کہ کوئی حجّام، کوئی ندّاف اور کوئی نانبائی حکمت و فلسفہ بولنے لگتا، دانش کے موتی اپنے اردگرد بیٹھنے والوں کی جھولیوں میں بھر دیتا اور تصوّف اور صفائے قلب کے اسرار کھولنے لگتا اور اب یہ زمانہ دیکھیے کہ باربر بُرے اور بھلے گاڑیوں کے ماڈل، وی سی آر، کیسٹ اور ہیراپھیری کے گُر بن مانگے سُناتے اور بتاتے ہیں۔

اپنے زیرِ تربیت لڑکوں کو وہ تربیت بھی عجب انداز میں دیتا۔ ٹہلتے ہُوئے ایک کیبن سے دوسرے کیبن جاتا۔ معمولی درجے کے گاہکوں کی حجامت انہی اپرنٹسوں کے ذمّے ہوتی۔ وہ کام کرتے ہُوئے لڑکوں کو بغور دیکھتا اور دھیمی آواز میں مشورے دیتا: "ابے! یہ کیا کر دیا ہے!" وہ ہنستے ہُوئے کسی سر کی طرف نگاہ ڈالتا۔ پھر مشین پکڑ کر خود چلانے لگتا۔

"قینچی کس طرح پکڑی ہوئی ہے؟" وہ کسی اپرنٹس کو گھورتا تو مارے ہیبت کے اُس کا ہاتھ لرزنے لگتا۔

"یہ قلمیں کیسے تراش رہے ہو۔ اس طرح.. یُوں.. یُوں" وہ اُسترا یا مشین خود چلا کر دکھاتا۔

"یہ کیا کر رہے ہو... گھاس کاٹ رہے ہو؟"

اُس کی آمد کے اوقات اُس کے خاص گاہکوں کو اچھی طرح یاد تھے۔ لاؤنج کے سیاہ چرمی صوفے، کُرسیاں اور سارے اسٹول بھر جاتے۔ سائڈ ٹیبلوں پر میگزین اور رسالے سجے ہوتے۔ سب اُس کی فراغت اور اپنی باری کے انتظار میں پائپ یا سگار پی رہے ہوتے۔ لیڈیز اگرچہ اُکتا رہی ہوتیں مگر کیا مجال جو اپنی باری کے سوا آگے آنے کی کوشش کرتیں۔ پتہ تھا سکندر بخت کا ڈسپلن بڑا سخت ہے۔ وہ سبک سبک اور منظم طریقے سے کام کرنے کا عادی تھا۔ پہلے آؤ، پہلے خدمات حاصل کرو، اُس کا موقف تھا۔

دوسری جنگِ عظیم برّصغیر میں بڑی گہما گہمی اور عجیب صُورتِ حال کا زمانہ تھا ـــ خصوصاً سکندر بخت کی دُکان کے لیے۔ اُن دنوں برٹش آرمی کے افسر کثرت کے ساتھ چلتے پھرتے اور دُکانوں اور ریستورانوں میں گھستے دکھائی دیتے بلکہ یُوں محسوس ہوتا کہ یہ زندگی کا جام آخری قطرے تک پینا ہی نہیں، چُوس لینا چاہتے ہیں اور ہنس بول اور گا کر حیاتِ مستعار بتانے پر ایمان رکھتے ہیں۔

"ٹھنڈی سڑک کی رونقیں اور دلچسپ ہنگامے....

آپ سادہ سوچ لیں، میاں! آپ تو اُن دنوں بچے ہوں گے۔" یہ تمام باتیں سکندر بخت میری حجامت بناتے اور بالوں میں ملتے ہُوئے بڑے الف لیلوی انداز میں سُناتا۔ اتنی تفصیل سے کہ میں بال رُوموں سے اُٹھتی ہُوئی آرکسٹرا کی دُھنیں تک صاف اور واضح طور پر سُن سکتا تھا۔ اُسے ایک دُھن میں اس طرح زیر و بم کے ساتھ بولتے سُن کر میں ہمیشہ دل ہی دل میں کہتا:

"تم اس زمانے میں ہو جو یہاں کھڑے ہو۔ اور جو قدیم زمانے میں ہوتے تو بغداد، غرناطہ یا دہلی کے کسی چوک میں کسی کے تخت یا کسی عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھے، داستان کہتے ہوتے۔ قہوے کے فنجان سُننے والوں کے ہاتھوں میں ہوتے۔ سقے اور ساقی گھوم رہے ہوتے۔ رات بھیگتی جاتی اور تمہاری آواز کی چہکار بڑھتی جاتی۔"

دنیا میں اور ہے کیا ازل اور ابد کے سوا! اور درمیان کے دنوں کی بس طویل داستانیں۔ اور یہ باتیں میں نوخیز سالوں میں بے وقت یُوں سوچنے لگا تھا۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی ۱۹۴۷ء آ گیا تھا۔ اپنے پورے جاہ و جلال سے لہراتا یونین جیک لپیٹ کر برطانوی جہازوں کا بیڑہ بحرِ ہند سے نکل گیا۔ ۱۹۴۷ء اور برِّصغیر آزاد ہونے کے ساتھ کیا ہُوا، یہ سب اتنی تفصیلات سے بیان ہوتا رہا ہے کہ آموختہ بن چکا ہے۔ میرا موضوع وہ قتلِ عام اور بہیمیت نہیں بلکہ میں تو اس وقت سکندر بخت کی یاد تازہ کرنے کے موڈ میں ہُوں۔

جب میں پاکستان کے ایک مہاجر کیمپ میں پہنچا تو وہاں کی پیالی دال اور تنوری روٹی کو ایک نعمت اور انعام ہی نہیں بلکہ اپنا مقدر سمجھ بیٹھا۔ کسی قسم کی آرزو، خواہش یا منصوبہ دل میں پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کُل اٹھارہ سال کی تو میری عمر تھی اور سب سے چھوٹا ہونے کے باعث کسی نے سمجھنے ہی نہ دیا کہ میں اب بچہ نہیں۔ شیو کرتا ہُوا گھر سے چلا تھا لیکن اب گھر، امّاں، ابا جان سب ایک

ایسا ماضی بن گئے تھے جو یاد بھی نہیں آتا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہ تھا کہ دس بارہ افراد کے خاندان میں سے مَیں یہاں اکیلا بیٹھا ہُوں اور یہ کہ وہ سب زندہ بھی ہوں گے کہ نہیں۔ عجب طرح طبیعت سُن ہُوئی تھی کہ ماضی کا خیال آتا تھا نہ مستقبل کی فکر تھی۔ بس اَب یُونہی عمر کٹ جائے گی۔ مَیں نے اپنے مقدّر اور حال سے بالکل سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ کسی بات اور حالت پر اعتراض نہ تھا۔

پھر ایک دن کیمپ کے ساتھ والے ہینڈ پمپ پر نہاتے نہاتے محسوس ہُوا کہ سر اور بالوں کی روئیدگی اب میری برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔ کیمپ حجّام بھی موجود تھے اور وہ اپنی کسوتیں اُٹھائے، لوگوں کی حجامتیں بناتے پھرتے تھے۔ شاید یہ واحد طبقہ تھا جو خود اپنی روزی کما رہا تھا۔ سب ہی اپنی حجامتیں بنوا رہے تھے۔ ان سے میرا دل ہی نہ اُٹھتا۔ کہاں تو اَمّاں شہر کے سب سے بڑے ہیئر ڈریسر کے ہاں لے جاتی تھیں اور انھی باتوں پر نانی اماں ناراض ہوتی تھیں کہ تم بہت دماغ خراب کر رہی ہو اپنے بچّوں کا۔ بیٹا، ایسا مزاج بناؤ جو ہر سرد و گرم سے گزرنا سکھائے۔

ایک دن میرے کیمپ کے ایک ساتھی نے کہا آؤ چلتے ہیں۔

"کدھر؟" دماغ اتنا گُنگ تھا کہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔

"شہر۔"

"وہاں کون ہے؟"

"ہو گا کون! روزگار تلاش کریں گے۔ کب تک خیرات کھائیں گے؟"

"وہاں کیا روزگار مل جائے گا؟" مَیں حیرت سے اُس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

تمام دن ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ بھلا اس قدر گندے، میلے اور کثیف لوگوں کو شہر کے اس حصّے میں روزگار کون دیتا؟ البتہ بعض خدا ترسوں نے روپیہ دو روپے دینے کی ضرور کوشش کی۔ ہم بدک کر ہٹ گئے۔ اسی لُک چُھپ میں وہ سیلون نظر آگیا۔ دروازے کے طویل شیشے میں سے وہ کچھ نظر آ رہا تھا جسے میری اندرونی خواہش جو کیمپ میں آنے کے بعد میرے اندر سر اُٹھا رہی تھی، ڈھونڈتی تھی۔ شفّاف اور پُرسکون ماحول، چیزیں اُجلی اُجلی، الماریوں میں سجے شیمپو اور اسپرے کی سوندھی سوندھی مہک۔ کیبنوں کے اندر چلنے والی قینچیوں اور مشینوں کی کچاکچ اور بال کٹنے کی کھسکھساہٹ مَیں بند دروازوں میں سے بھی شوق اور تخیّل کے بل پر محسوس کر سکتا تھا۔

میری نظریں سول افسروں اور کرنلوں اور لیفٹیننٹ جرنلوں کے علاوہ چند بُوڑھے انگریزوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کئی بُوڑھے انگریز ہاتھوں میں اپنے خوبصورت صحیح النّسب جبڑے جبڑے کُتّوں کی زنجیریں تھامے ہُوئے، چند ادھیڑ عمر اور بوڑھی انگریز خواتین وائی ڈبلیو سی اے، سالویشن آرمی اور اولڈ ہاؤس کی انچارج ٹائپ۔ سب کبھی کبھار گھڑی کی سوئیوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لینے کے سوا سکوت و صبر سے بیٹھے سراپا انتظار تھے ـــ سپاٹ اور بے فکر چہرے جن سے مجال ہے جو یہ تاثر ملتا ہو کہ برِصغیر میں اُن کی قوم کے ڈالے ہُوئے گھپلوں اور پالیسیوں نے ایک کھلبلی مچا دی ہے ـــ ایسی کھلبلی کہ مَیں جو دریا گنج دہلی میں اتنی بڑی کوٹھی اور کشادہ باغ کا رہنے والا تھا، نائٹ سُوٹ کے نیلے دھاری دار پاجامے اور تقریباً دس گیارہ سال کے بچّے کی بش شرٹ میں ٹھُنسا کھڑا تھا۔ آفرین ہے، اے اہلِ برطانیہ تمھارے اعصاب پر۔ اپنی غلطیوں پر شرمندہ نہ ہونا بھی ایک فن ہے جسے مضبوط اعصاب والے ہی جانتے ہیں۔

اچانک ہی وال کلاک پر چھوٹی بڑی سوئیوں نے زاویہ قائمہ بنایا چار اور بارہ کے درمیان، اور اسی دم ایک ادائے محبوبی کے ساتھ وہ مُسکراتے ہُوئے، دروازے

کے اندر داخل ہُوا۔ ساتھ مَیں بھی نامعلوم طور پر رینگ آیا۔

اُس کی آمد پر گاہکوں میں کھلبلی تو کیا مچتی؛ البتہ سکون اور اطمینان کی ایک لہر ضرور دوڑ گئی اور سب اپنی اپنی جگہ چوکنّے ہو بیٹھے۔

ہماری اس غلیظ و کثیف حالت کے مقابل وہ کتنا چاق و چوبند اور صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ آپ شاید اندازہ نہ لگا سکیں۔ اور لانڈری سے تازہ تازہ آئے تولیے ہینگر پر لٹکے دیکھ کر مجھ پر عجب کیفیّت طاری ہُوئی۔ بس ایک نیند سی تھی، خُنک سی خوابناک نیند۔

اچانک ہی ایک گستاخ سے نوعمر حجّام نے مجھے ٹوکا دیا: "ارے! تو اب تک یہیں کھڑا ہے۔ مَیں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ باہر سڑک پر کھڑے ہو تو جیب بھر جائے گی۔"

"مَیں تو بال بنوانے آیا ہُوں۔"

"تم.. تم.." اُس نے میری طرف اُنگلی اُٹھائی۔ "یہاں اس سیلون میں بال بنواؤ گے؟ وہ دیکھو" اُس نے شیشے کے باہر اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "وہ ڈرائی کلینر کی دُکان کے سامنے پھریا کے درخت تلے جو حجّام چٹائی ڈالے بیٹھا ہے، بہت اچھے بال بناتا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ مَیں (پہلے اُنگلی اپنے سینے پر رکھی اور پھر وہی باہر بیٹھے حجام کی طرف اُٹھا دی) وہاں اُس سے بال بنواؤں!"

"تو پھر حضور کا ارادہ کیا ہے؟"

"یہاں اس دُکان میں بال بنوانے کا۔"

"جیب میں پیسے ہیں؟"

"بالکل ہیں!" مَیں نے بٹوے میں پڑے پیسوں کے بل پر کہا۔

"آئینے میں حُلیہ دیکھا ہے اپنا؟"

اب مَیں کیا جواب دیتا؟ ٹھیک ہے نائٹ سُوٹ کا پاجامہ بھی اُٹنگا تھا اور بُش شرٹ میں بھی دقّت سے

کابل: اسلام کی آغوش میں

طلوعِ اسلام کے وقت افغانستان کا خاصا علاقہ ساسانی سلطنت میں شامل تھا۔ ۶۴۲ء میں ساسانیوں نے شکستِ فاش کھائی اور عرب مسلمان پیش قدمی کرتے ہُوئے قندھار اور غزنی پر بھی قابض ہو گئے۔ کابل پر اُن دنوں ترک نسل سے بُدھ مذہب کا بادشاہ حکمران تھا۔ اُس نے مسلمانوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ آخرکار ایک سال کے مسلسل محاصرے کے بعد ۶۶۴ء میں عربوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصے میں وہ ہرات، سمرقند، کاشغر اور سیستان فتح کر چکے تھے۔

(کشورِ محمود و ایاز ـــ منظور ممتاز)

ٹھُنسا ہُوا تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ جو کیمپ والوں نے دے دیا وہی پہننا تھا اور کیسے نہ پہنتا؟ اسپیشل ٹرین میں ساتھ بیٹھے شخص کو گولی لگی تو وہ بلبلا کر مجھ سے چمٹ گیا۔ تیسرے دن جب گاڑی سے اُترے تو لوگوں نے اُسے کھینچ کر مجھ سے جُدا کیا اور وہ میرا گریبان مُٹھی ہی میں لے گیا۔

میرے یُوں چُپ ہو جانے پر وہ نوجوان فتح مندانہ ہنسا تو وہ شخص جس کا گاہکوں نے بڑا انتظار کھینچا تھا، قریب آگیا۔ اُس نے حجّام کو گھُور کر دیکھا اور بارعب آواز میں کہا: "آگے ایک لفظ نہ بولنا۔ یہ میرا گاہک ہے۔ ان کے بال مَیں بناؤں گا۔"

پھر اُس نے میری طرف اسٹول بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ بیٹھیں۔ بس اگلا نمبر آپ کا ہے۔"

مجھے وہم ہو رہا تھا یہ شخص ہمیں بیوقوف بنا رہا ہے۔ اور جب اُس نے مجھے آئینے کے مقابل کرسی پر بٹھایا۔ تب احساس ہُوا کہ وہ جھوٹ نہ کہتا تھا۔

"جب اتنا شفّاف آئینہ اس عکس کو قبول کر سکتا ہے تو مجھے یا اُسے کیا حق حاصل ہے...؟" اتنی اُونچی آواز

میں بولا تھا وہ کہ میں چونک گیا اور مُڑ کر اُسے غور سے دیکھا۔

"کیا یہ آواز اسی شخص کے اندر سے نکل رہی ہے جس کے ہاتھ میں قینچی ہے، اُسترا ہے؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اُس نے اس قدر نرمی سے، اتنے اہتمام سے میرے بال بنائے کہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اُس نے میرے زخموں پر پھاہے رکھ دیے ہیں۔ پھر اُس نے میرے بالوں میں لِپٹ کیا ــــ ایسے دھیرج سے، ایسی شفقت سے کہ میرے وجود پر جمی ہُوئی ساری برف پگھلنے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسو چل نکلے۔ بار بار وہ تولیے سے ان آنسوؤں کو جذب کرتا رہا۔

باہر آکر میں نے ادائیگی کرنا چاہی تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے بولا: "آج کے دن آپ نے میری مہمانی کی ہے۔ گاہکی پھر دیکھی جائے گی۔"

"ارے بھائی! میں اس پوزیشن میں ہُوں۔"

"مجھے معلوم ہے جبھی تو گاہکی پکّی کر رہا ہُوں۔ آئندہ آؤ گے تو جیب کاٹوں گا۔" اُس نے ملائمت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا: "مجھے یاد رکھیے گا میرا نام سکندر بخت ہے۔"

بہت دنوں بعد جب میں سول سروس میں آچکا تھا تو ایک مرتبہ میں نے سکندر بخت سے سوال کیا: "پہلے دن تم نے مجھ پر رحم کھا کر میرے بال بنائے تھے نا!"

"بالکل نہیں! پہچان کر البتہ بنائے تھے۔"

"وہ کیسے؟"

"میاں! آپ کے سر ہمارے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور ہم آپ کی جیبیں بھی نہ پڑھ سکیں تو لعنت ہے ہم پر!"

۱۹۶۵ء تک میرا اُس کا ساتھ مستقل رہا، پھر اس کے بعد سے تبادلوں کا سلسلہ جو شروع ہُوا تو یہ شہر ہی چھوٹ گیا۔ کبھی کبھار آنا بھی ہُوا تو بال بنوانے کی ضرورت پیش نہ آئی، ویسے ہی واپس چلا گیا اور پھر والد صاحب نے یہاں کی رہائش بھی ترک کر دی اور کراچی ہی میں گھر لے لیا۔ یوں ایک عرصے تک موقع ہی نہ ملا اس سیلون میں جانے کا۔ لیکن جب اور جہاں بھی موقع ملا ہیئر کٹنگ سیلون میں حجّام کے آگے بیٹھ کر میں نے سکندر کو ہمیشہ یاد کیا۔ مشرقی پاکستان میں پوسٹنگ ہُوئے ایک ہی سال ہُوا تھا کہ پابجولاں بھارت کی قید میں جانا پڑا۔ میرا مستقر آگرہ تھا۔ یوں بھی دیوانگی سے اس شہر کا ایک حوالہ موجود تھا میرے ذہن میں۔ ہمارے ایک ساتھی کے تھیلے میں سے ایک شکستہ آئینہ نکل آیا۔ سبھی نے باری باری اپنی صُورت دیکھ کر اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ پچکے ہُوئے گال خالی خالی آنکھیں، بڑھی اور اُلجھی ہُوئی ڈاڑھیاں، بہت خفقان ہُوا بہت کُھجلی ہُوئی بالوں میں۔ باہمی مشورت سے ہم نے وہ آئینہ ہی توڑ دیا تھا۔

بیتے ہُوئے اُن دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہُوئے میں نے کہا تھا: "اور اُس دن تم مجھے بہت یاد آئے تھے، سکندر بخت!"

اور سکندر بخت جو مجھے بہت بُجھا بُجھا نظر آ رہا تھا، میری بات سُن کر مُسکرانے کے بجائے خاموشی سے میری شیو بناتا رہا۔ میں نے محسوس کیا اُس کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش ہوتی ہے۔

قید سے رہائی پانے کے بعد لاہور میں یہ میرا پہلا دن تھا۔ کراچی میں اب کون تھا؟ اماں بھی نہیں رہی تھیں، ابا جان بھی جا چکے تھے۔ میری بیوی صالحہ اور بچّوں کو میرے سُسر اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔ صالحہ وہاں کوئی جاب کرنے لگی تھی۔ میرا استقبال کرنے اور میرے لیے گھر کے کپڑے لینے کون آتا؟ وہی پاجامہ، وہی پیٹھ پر پی او ڈبلیو لکھی ہُوئی قمیص، کینوس کے جوتے اور بڑھی ڈاڑھی میں سیدھا مال روڈ پر اتر پڑا۔ سامنے ہی

میرا مخصوص سیلون تھا۔ شرمندہ سا، دبے دبے قدموں چلتے ہُوئے، مَیں دروازے کے اندر داخل ہونے کی ہمت اپنے آپ میں نہ پا رہا تھا۔

میرے پہلی بار ۱۹۴۷ء کے آنے اور آج کے آنے میں بڑا فرق تھا۔ اُس وقت بھی ٹھیک چار کا وقت تھا۔ بڑی آن بان اور تمکنت سے قدم اُٹھاتے ہُوئے سکندر دروازہ کھولتے کھولتے ٹھٹکا۔

"میاں آپ؟" وہ رُکا۔ "اندر چلیے نا۔"

"سکندر بخت! آنے کا حوصلہ نہیں۔ میری پُشت پر دیکھو کیا لکھا ہے۔"

بغیر ایک لفظ کہے وہ اندر گیا اور بڑا سا نہانے کا تولیہ میرے ہاتھ میں دیتے ہُوئے اُس نے کہا: "یہ اوڑھ کر اندر چلیے۔"

جب بھی مَیں اُسے اپنے تبادلے اور کہیں اور جانے کی بات سُناتا تو وہ کہتا: "مبارک ہو۔ یہ آنا جانا زندگی میں جوانمردی کی علامت ہے۔ ایک ہم ہیں کہ بس مندر کی مورتی بنے بیٹھے ہیں۔" پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہتا: "میاں، سکندر بخت جس دن اس دکان سے نکلے گا، وہ قیامت کا دن ہوگا۔"

پہلی مرتبہ مَیں نے محسوس کیا کہ آج سکندر بخت ناخوش ہے۔ وہ ناخوش بھی تھا اور ایک دبی دبی سی شکایت اُس کے وجود کو چاٹ رہی تھی۔ مگر اُس کا کام اور اُس کا فن ویسا ہی مکمل اور بھرپُور تھا۔

خیر مَیں نے صالحہ کے ساتھ، جو میری واپسی کا سُنتے ہی چلی آئی تھی، پھر وہی گونجوں اور قازوں کی سی زندگی کا آغاز کیا۔ دو بڑے بچوں، لڑکی اور لڑکے کی تو شادیاں بھی کر دی تھیں۔ باقی دو چھوٹے بھی باہر ملازمتوں پر تھے۔ اپرمال پر کوٹھی کے مکمل ہوتے ہی اب ہم مستقل طور پر لاہور آچکے تھے۔

لاہور پہنچتے ہی بڑے صاحبزادے جلال کا خط آ گیا: "فیروزہ کو جاب ملی بھی تو کہاں، الینوائے میں۔ اب کہاں نیویارک اور کہاں الینوائے۔ مَیں جانتا ہُوں ابّی جان کہ اس وقت جبکہ آپ دونوں تمام عمر کی مشقّت اور تگ ودَو کے بعد فرصت سے بیٹھنے ہی والے تھے، میری طرف سے کوئی ذمّے داری آپ کے لیے ایک ناخوشگوار بوجھ بنے گی مگر مَیں یہ بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ بلال کو ابھی سے یہاں کسی بورڈنگ میں ڈال دوں۔ فیروزہ کا کہنا ہے یہ میری قدامت پرستی اور خودغرضی ہے کہ مَیں اپنے بوڑھے والدین کو استعمال کرنا چاہتا ہُوں... مگر مَیں خود غرض، قدامت پرست کہلوانے ہی کو ترجیح دوں گا۔"

مجھے اُس کا خط اور بے ڈھنگی باتیں پڑھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ اپنی زندگی کے ذمّے اور ذمّے داریاں نبٹانے میں احساس ہی نہ ہُوا کہ واقعی ہمارا زمانہ گزر چلا ہے اور زندگی میں عمل اور سوچ کے تغیّرات آچکے ہیں۔

مَیں اور صالحہ نے واپسی خط لکھا: "جس بات کو تم معذرت خواہانہ سمجھتے ہو، وہ تو ہم پر ایک احسان ہے۔ جلال! مَیں سوچتا تھا کہ یہ اپرمال پر گھر بنا کر حماقت ہی کی ہے۔ مَیں اور تمہاری ماں تنہا تنہا، نئے نویلے گھر میں رہتے کیسے لگیں گے! نئے انسانوں کے بغیر نیا گھر ... ہوتا ہے، بیٹا! اب یہ مرحلہ بھی غور طلب تھا کہ زندگی کے سارے ضروری اور دلچسپ کام ختم کر دینے کے بعد ... مشاغل اور مصروفیات کیا ہوں گی... اور، جلال، مَیں ... سمجھ رہا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے، ماضی کا حال سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے... مگر نہیں۔ خیر، باقی باتیں زبانی ہوں گی۔"

اب یہ ساری تمہید اُس اسکول ڈائری کی بنا پر باندھی ہے کہ جس میں بلال احمد کے بال ترشوانے کا ذکر تھا۔

صالحہ جوڑوں کے درد کا شکار ہو کر اینٹی بائیوٹکس قدرے غلو کے ساتھ استعمال کر رہی تھی کہ اُن دنوں وہ چیک اَپ کی سختی سے پابند تھی۔ اور توجہ کا یہ حال ...

... طرف بھی مشکل سے توجّہ کر تی تھی۔ دوسرے ہی ... صاحب نے اپنی ڈائری صالحہ کی ناک کے نیچے ... ہوئے کہا: "دادی جان! مِس نے کہا تھا اپنی ... جان سے کہنا پورے غور سے پڑھ لیں۔" لکھا تھا: "... لال کے بال ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئے ... انہیں ترشوا دیں ____ شکریہ۔"

صالحہ نے اپنی پنڈلیاں آپ دباتے ہُوئے کہا: ... بیٹے! اپنے دادا ابّو کو دکھاؤ۔ مَیں نہ رہی تو یہ تمہلا ... کریں گے۔ اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ بچّہ ریچھ بنا ...

... مَیں نے خود صالحہ کے معاملے میں ایک ہی پالیسی ... رکھی تھی کہ خفگی ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ اور ... کام کر کے واپس آؤ، چنانچہ بلّو کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی ... بیٹھا۔ راستے میں اُس نے اپنی ہی چخ چخ شروع ...

"... ابو! یہ جو آپ کا ہیئر ڈریسر ہے نا ہُوپس پُوپس ... والی تو قینچیاں مجھے چُبھیں گی۔ بوگس آدمی لگتا ہے ..."

"... بیٹا! یہ ہُوپس پُوپس والا میرا باربر نہیں۔ یہ تمہاری ... پسندیدہ حجّام ہے۔"

... ہی سکندر بخت کا چہرہ میری نظروں میں گھوم ... وں سے اُنہی کی سوچ اور زبان میں بات کرتا ... تو اُس کی زیرِ مونچھ مُسکراہٹ ہی پر فدا تھے۔ ... تو چلو، بلّو میاں، تم بھی کیا یاد کرو گے؟ آج سکندر ... بال بنواتے ہیں۔ بڑا فنکار ہے وہ۔" گاڑی ... مال روڈ کی طرف موڑتے ہُوئے مَیں نے کہا۔

"... ابو! فنکار کیا ہوتا ہے؟"

"... فن کار..."

... مَیں اُسے کیا بتاتا! گاڑی لاک کر کے دُکان ... بلّو مجھ سے ایک قدم آگے تھا۔ مگر یہ کیا؟

کلراٹھی زمینوں کی اصلاح

جپسم

سے کیجئے

جپسم کی یومیہ پیداوار اب (۳۰۰۰) تین ہزار میٹرک ٹن سے بھی تجاوز کر گئی ہے، لہٰذا ہم فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ زمینداروں میں جپسم کی بڑھتی ہُوئی مانگ کو ہم ہر لحاظ سے پُورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جپسم سیل بند تھیلوں میں زرعی ترقیاتی و سپلائی کارپوریشن کے پنجاب بھر میں پھیلے ڈپوؤں سے حسبِ خواہش حاصل کریں اور اپنی کلر زدہ زمینوں کی اصلاح کر کے اپنی اور ملکی پیداوار بڑھائیں۔

نرخ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جپسم پتّھر	۱۶۰/-	روپے فی میٹرک ٹن
۲۔ جپسم دانے دار	۱۸۰/-	روپے فی میٹرک ٹن
۳۔ جپسم پاؤڈر کھلا	۲۶۰/-	روپے فی میٹرک ٹن
۴۔ جپسم بند بوریوں میں	۳۶۰/-	روپے فی میٹرک ٹن

نوٹ: (۵۰) پچاس کلوگرام جپسم کا تھیلا صرف ۱۸ روپے میں حاصل کریں۔

پنجاب زرعی ترقیاتی و سپلائی کارپوریشن

۵۔ بینک سکوائر۔ لاہور

پُرانی داستانوں میں سُنا تھا کہ ابھی یہاں سامنے ایک شہر، ایک بستی آباد ہے اور پھر مُڑ کر دیکھو تو صحرا کے سوا کچھ نہیں۔ اگلا قدم اندر ڈال کر عجیب سا احساس ہُوا۔ جیسے کسی قدیم کھنڈر کے اندھے تہ خانے میں اُتر گیا ہُوں جہاں نمی ہے سیلن ہے، دیواروں سے مٹی جھڑتی ہے اور چھتوں سے اُلٹی لٹکتی ابابیلوں نے روشنی کی تاب نہ لاتے ہُوئے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔

اور اس پُورے ماحول کے درمیان جو صُورتیں چلتی پھرتی ہیں وہ اپنی شناخت کھو چکی ہیں۔ ڈسکو دیوانے کہ اس طرز کا یہی نام طے ہُوا، سب کے سب ایک ہی ڈیزائن کی پتلونوں میں گھُسے ہُوئے، زنانے پرنٹس اور رنگوں والی قمیصوں اور کندھوں پر لہراتے بالوں سمیت وہ زمین پر پاؤں مار کر چلنے اور اُونچا بولنے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔ جگہ جیسے سُکڑ گئی ہو۔ کیبنوں کی تعداد کم ہو گئی تھی اور تیز چیختے رنگوں اور ڈیزائنوں والے پردوں اور صوفوں پر منڈھی پلش والی قرمزی مخمل سے ایک عجیب تاثر پیدا ہو رہا تھا، جیسے شب باشی کے مقصد سے بنائے ہوئے ہوٹل کا اندرونی ماحول ہو۔ اندر کیبنوں میں حجاموں کی کرخت شخصیتیں مصروفِ کار تھیں جو اپنے اُسترے قینچیاں اور مشینیں بجاتے ہوئے رکھتے اُٹھاتے تھے۔ وہ آپریشن تھیٹر جیسی خاموشی، وہ برف جیسے پردوں کی بے داغ سفیدی سب معدوم تھی۔ مَیں فریبِ نظر کی کیفیت میں مبتلا، کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

پہلی شخصیت بڑی منکسر اور حلیم تھی مگر اب یہ چکلے سے پچپٹے چپٹے چہرے والی ہستی جیسے کسی نے ربڑ کے تھیلے پر آنکھ، ناک اور دہن چسپاں کر دیے ہوں! بیس بائیس برس کا یہ لڑکا اوّل تو بات پر کان ہی نہ دھرتا تھا، اور اگر جواب بھی دیتا تو تلخی سے۔ آنکھوں کا انداز اور چہرے کے زاویے پکارتے تھے کہ ہم اپنے اور ہی عالمِ نشاط میں ہیں۔

مَیں نے جس سے بھی سکندر بخت کی آمد و رفت کے اوقات کا پُوچھا، وہ کچھ ایسا رویّہ پیش کرتا جیسے اُس کی براہِ راست توہین کی گئی ہو۔ کئی بار یہی سوال کرنے پر ایک دراز قامت اور ڈسکو دیوانے والی پتلون میں ٹھنسے بھاری بھرکم حجّام نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا گویا اُسے میری دماغی صحت پر شُبہ ہو، پھر بڑی کٹیلی اور گستاخ آواز میں بولا: "وہ نمونہ بھی آجائے گا ابھی" پھر بڑے طنزیہ انداز میں اُس نے کہا: "بابا جی ٹھیک چار بجے گھُسیں کے اندر۔ پُرانے آدمی ہیں نا، منٹ منٹ کا حساب رکھتے ہیں۔"

یہ لہجہ، یہ حقارت، یہ بے ہُنری... مَیں وہاں ٹھہر بھی نہ سکا۔ ویسے آج سکندر بخت سے ملنا اور اس تغیّر حال کا ذکر بھی کرنا ضرور تھا۔

مَیں بِلّو کو لے کر بُک شاپ اور پھر آئس کون کی مشین پر لے گیا۔ مارے فرسٹریشن کے بِلّو کے علاوہ مَیں نے خود اپنے لیے بھی آئس کون خرید کر بالکل نوعمر لڑکوں کی طرح چاٹنی اور چُوسنی شروع کر دی۔ یہ فرسٹریشن بھی عجب شے ہے! مجھے معلوم تھا کہ وہ آئے گا تو ایک لمبی قطار گزر کر ہی ہماری باری آئے گی۔

بِلّو کو خوب سیر گشت کروا کر واپس گیا۔ دُکان میں دوبارہ قدم رکھنا... وہ لمحہ تھا جو مجھے ہمیشہ ملال سے دوچار رکھے گا۔ بقیہ تمام عمر یہ لمحہ، یہ ماحول دُھند میں لپٹا میرے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں چھپا رہے گا۔ وہ لمحہ ایک منظر لیے ہُوئے تھا جسے آنے والے نہ جانے کب سے دیکھتے اور نظر انداز کر رہے تھے۔

وہ بالائی کیبنوں کو جانے والے زینے کی محراب تلے ایک اُونچے اسٹول پر اس پوز میں بیٹھا تھا کہ دونوں ہاتھ گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑے ہُوئے تھے۔ اگرچہ ظاہری قد کاٹھ اور وضع میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ تھی لیکن اندرونی ٹُوٹ پھُوٹ چہرے سے آشکارا تھی۔ مجھے یُوں لگتا تھا جیسے تمام آئینے ٹُوٹ پھُوٹ کر کرچ کرچ ہُوئے اور اب وہ انہیں اپنے اندر سنبھالے پھرتا ہو۔ پھر وہ اُس کی غلافی آنکھوں تلے اُبھرتی بلڈ پریشر کی سُرمئی تھیلیاں پیشانی سیاہ گھونگریالے بالوں سے محروم اور رہے سہے بالوں پر وقت کی دھول تہ بہ تہ جمی ہُوئی۔

ستم تو یہ تھا کہ خاصی دیر مَیں نے اُسے ایک ہی جگہ اسی حالت میں بیٹھے پایا۔ پھر مجھے یہ منظر بھی دیکھنا تھا کہ دروازہ کھُلتے ہی وہ بڑی اُمّید سے گاہک کی طرف لپکتا اور گاہک اُسے نظر انداز کرتا ڈسکو دیوانے والی پتلون میں ٹھنسے کسی نو آموز کو پکڑتا ہُوا کیبن میں گھُس جاتا کہ اُس کے اپنے بالوں کا انداز بھی اُسی جیسا ہوتا۔ ویسے عجیب عجیب انداز کے لوگ آجا رہے تھے۔ اس وقت پُوری دُکان میں سکندر بخت واحد حجّام تھا جو سفید کلف لگی یونیفارم اور مونوگرام والی چمڑے کی بیلٹ میں تھا۔

خاصی دیر بعد مَیں نے اُس کے نزدیک جا کر کہا: "سکندر بخت! مجھے پہچانا؟"

"بہت لوگ آتے ہیں، بہت جاتے ہیں۔ نہ وہ مجھے پہچانتے ہیں، نہ مَیں اب کسی کو پہچاننے کا دعوٰی کرتا ہُوں۔"

"لیکن یہ کیا بات ہوئی، سکندر بخت۔ تم نے تو میری شناخت اُس وقت کر لی تھی جب مجھے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ تمھی نے میری پیشانی میں چھپا مقدر پڑھا تھا۔ سکندر بخت! تم نے مجھے بھلا دیا مگر مَیں تم کو نہیں بھُول سکتا۔ میں ۷۴ء کے نومبر کی وہ شام کیسے بھُول جاؤں؟"

وہ اسٹول چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور پھر اُس نے گمبھیر آواز میں کہا: "پہچانتا ہُوں۔ پُورے بارہ برس آپ کی خدمت کی ہے، میاں!"

"اور یہ بھی تمھی نے کہا تھا کہ آپ کی پیشانی پر تو لکشمی دمکتی ہے۔"

وہ مُسکرایا اور پھر سرگوشی میں بولا: "یہ بھی یاد ہے۔"

"ہاں، اور وہ کپلنگ صاحب کے قصّے اور یہ کہنا کہ یہ کپلنگ صاحب بھی عجب تھے جس کے ہُنر سے ٹکر گئے اُس کو سند پکڑا گئے۔"

"بات یہ ہے کہ خود جو ہُنرمند تھے۔" اُس نے پھر سرگوشی کی۔

"سکندر بخت! یہ جلال کا بیٹا ہے۔" مَیں نے بِلّو کو آگے کرتے ہُوئے کہا۔

"جلال میاں کا! کہاں ہیں وہ؟"

"وہ تو بھائی باہر ہے۔ یہ لونڈا میرے سر دے مارا ہے۔"

"میاں! شکر کریں۔ یہ نئی دُنیا ہے، نئی نسل ہے۔ یہ پچھلے ہاتھوں میں سُلجھ کر اور نکھر کر پلے گی۔"

"بِلّو! یہ تمہارے بال بنائیں گے۔ یہ سکندر بخت ہیں۔ یہ ہیں وہ..."

اُس نے اپنا ہاتھ چھُڑایا اور لپک کر ایک ڈسکو دیوانے کے پاس جا کر بولا: "دادا ابّو! ان سے کٹواؤ بال میرے، ڈسکو کٹ بال۔"

سکندر بخت پھر سے اپنے اسٹول پر دوبارہ اُسی پوز میں بیٹھ گیا ـــ ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ گھٹنوں پر جمے ہُوئے۔

مَیں نے بِلّو کو پکڑا۔ "بلال! تم ان سے بال بنواؤ گے۔ تمہارے دادا ابّو کے بال یہ بناتے تھے اور تمہارے ابّو کی حجامت بھی یہی..."

"میرے ابّو کی؟" بلال کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"میاں! اس کو اپنی مرضی سے جانے دیں۔ یہ بچّے کی نہیں، وقت کی آواز ہے۔"

"مگر اسے مَیں بُرے اور بھلے کا فرق بتانا چاہتا ہُوں سکندر بخت! بُرے اور بھلے کے درمیان جو زمانہ ہوتا ہے وہ اسی انداز میں موجود رہتا ہے۔"

بِلّو بسورتا ہُوا اپنی مرضی کے خلاف گیا تھا۔ جب وہ بال بنوا کر نکلا تو دونوں ہی مُسکرا رہے تھے۔ واپسی پر

اُس نے مجھ سے کہا: "دادا ابّا! یہ جو سکندر بخت ہیں، یہ فنکار ہیں نا!"

مَیں حیران رہ گیا۔ پوچھا: "تم سے کس نے کہا؟"

"بس مجھے ایسا لگا! پتہ نہیں کیوں!"

پھر وہ بڑے جوش سے بولا: "اُن کو کام کرنا آتا ہے۔ اُن کی قینچیاں بالکل نہیں ستاتیں۔ مَیں پھر بھی انھی کے پاس آؤں گا۔"

"مگر بیٹے! اب ہم یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔"

کیوں، دادا ابو؟

"اس لیے کہ فرہاد کے ہاتھ سے تیشہ گر گیا ہے۔"

"فرہاد؟ تیشہ؟" وہ حیران ہُوا۔

"ہاں بیٹے! جب فرہاد کے ہاتھ سے تیشہ گر گیا تو پہاڑ بہت رویا۔"

مَیں بہت افسردہ اور ملول تھا۔ ۸۸

❦

رُوس میں ۱۹۱۷ء سے جبر اور خوف پر مبنی جو نظام حکومت مسلّط ہے اُس نے باضمیر رُوسی ادیبوں کو ہمیشہ آزمائش میں ڈالا ہے۔ کتنے ہی رُوسی ادیب سوشلزم کے جہنّم سے جان چُھڑا کر مغربی ممالک میں پناہ لے چکے ہیں۔ بعض نے اسٹالن کے قید خانوں میں سسک سسک کر جان دے دی۔ ممتاز رُوسی نقّاد دیمتری مرسکی جیل خانے کے اندر مر گیا اور عظیم شاعرہ مارینا سویتویا نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکُشی کر لی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں تقریباً پچاس رُوسی ادیب آزاد دنیا میں آ پناہ گزیں ہُوئے اور اب وہ اعلیٰ پائے کے طبعزاد اور تخلیقی کارنامے پیش کر رہے ہیں۔

معروف ناول نگار اسکو نوف اٹھارہ سال تک رُوس میں ادیبوں کی سرکاری انجمن کا رُکن رہا۔ جب اُس نے مسلّمہ رُوسی نظریات سے ہٹ کر مضامین کا ایک مجموعہ 'میٹرو پول' مرتّب کیا تو اُسے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جلاوطنی کے بعد اُس کا انگریزی میں پہلا ناول 'جزیرہ نما کریمیا' شائع ہُوا۔ اُس میں بحیرۂ اسود کے اس جزیرۂ نما کو رُوسی نظریات کی نفی کرتے دکھایا گیا ہے۔ رُوس کے مقابلے میں یہاں دولت کی فراوانی ہے۔ آخر میں کریمیا کے پچاس لاکھ باشندے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اپنے وطن رُوس سے ملاپ کی خواہش کرتے ہیں جس کے جواب میں جزیرہ نما پر بھرپُور حملہ کر دیا جاتا ہے اور رُوسی ٹینک اُنھیں کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک منحرف رُوسی ادیب کی تصنیف 'کنگرو' میں فرضی مقدّموں میں گرفتار ملزموں کے جھوٹے اعترافات بیان کیے گئے ہیں جو اسٹالن کے دَور میں ملزموں سے اُگلوائے جاتے تھے۔ الیگزینڈر سولزے نتسن کو 'گولاگ آرچیپلاگو' کی غیر ممالک میں اشاعت پر چھ سال کی سزا ہُوئی۔ اس پر مغرب میں اُس کے حق میں آوازیں بلند ہُوئیں تو رُوسی حکومت نے اُسے ملک سے نکال باہر کیا۔ سولزے نتسن 'شاہ بلوط اور بچھڑے' میں لکھتا ہے:

"مَیں پندرہ سال تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا۔ مجرموں کے کیمپوں، جلاوطنی اور مفروری سے دوچار ہُوا۔ مَیں نے کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کی اور اب یکایک میری شہرت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔"

خدا کا کرشمہ

آسٹریلوی خاتون کے ناقابلِ شکست جذبے کی ایک سچّی کہانی

جونی ایرکسن / ترجمہ: س۔م سلیمان

دسمبر کا مہینہ تھا اور دُھوپ بے حد خوشگوار تھی۔ جنوبی نصف کُرے میں گرمیوں کا یہ ... بڑا دلکش ہوتا ہے۔ چاروں طرف سنہری دھوپ پھیل ... ہے اور لوگ جوق در جوق تعطیلات منانے ساحل ... کا رُخ کرتے ہیں۔ اسی لیے آسٹریلیا کے اس خوبصورت ساحل پر پکنک منانے والوں کا ایک اژدحام تھا۔ ہر طرف میلے کا سماں تھا۔ لوگ نیم گرم پانی میں پیراکی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہُوئے تھے۔

میرا نام جونی ایرکسن ہے۔ اُس وقت میری عمر سترہ برس ہو چکی تھی۔ مَیں ہجوم سے دُور سُنسان ساحل پر پیراکی کی غرض سے آئی تھی۔ مَیں نے ایک قدرے بلند چٹان سے چھلانگ لگائی۔ چند سیکنڈ کے لیے میرا جسم ہوا میں لہرایا

اور پھر سمندر کے نیم گرم پانی سے ٹکرایا۔ لطف و انبساط کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ اُٹھی اور جسم جل پری کی طرح پانی میں اُترتا چلا گیا۔ پیراکی ہمارا خاندانی مشغلہ تھا۔ میں چھلانگ کے زور میں زیرِ آب اُترتی جا رہی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہُوا کہ میرا سر کسی ٹھوس اور سخت چیز سے ٹکرایا ہے۔ ٹکراؤ بڑا شدید تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے درد کا ہرگز احساس نہ ہُوا۔ میں کسی مُردہ چھپکلی کے مانند سمندر کی تہ میں نرم نرم ریت پر جا پڑی۔ میرے جسم کے اندر جیسے برقی رَو دوڑ رہی تھی۔ مَیں ہلنے جلنے سے بالکل قاصر تھی۔ ہاتھ پاؤں ساکت ہو چکے تھے؛ تاہم میرے ہوش و حواس بحال تھے اور دماغ پہلے کی طرح مستعد اور فعّال تھا۔

مَیں سوچ رہی تھی یہ کیا ہُوا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرا جسم قابو سے باہر کیوں ہو رہا ہے؟ میری سوچوں میں ایک چیخ اُبھری: "بچاؤ! بچاؤ! مَیں ڈوب رہی ہُوں!"

مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ مَیں نے اپنی تمام تر قُوّت ارادی اور جسمانی طاقت استعمال کر کے تیرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ سمندر کی ایک تند و تیز لہر مجھ پر سے گزرتی چلی گئی۔ مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا گویا میرے بازو سینے کے گرد لپٹے ہُوئے ہیں۔

عین اس لمحے میرے کانوں میں ایک کرب آمیز مانُوس چیخ سُنائی دی: "جونی!" لیکن مَیں سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ آواز کس کی ہے۔ ذہن میں بس ایک ہی خوف سمایا ہُوا تھا کہ مَیں مرنے والی ہُوں۔

"اوہ خُدایا! کیا مَیں مرنے والی ہُوں؟ خُدایا! مَیں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ ابھی میری عُمر ہی کیا ہے! پروردگار میری مدد کر، مجھے موت سے بچا لے!"

"جونی!" وہی آواز پھر اُبھری اور اس مرتبہ مَیں پہچان گئی۔ یہ میری بہن کیتھی کی آواز تھی۔ میرے دل نے چیخ کر کہا: "کیتھی! میری مدد کرو، مَیں مرنے والی ہُوں!"

"تم نے یہاں چھلانگ لگائی تھی۔ یہاں تو پانی ... کم ہے اور زیرِ آب چٹانیں بھی موجود ہیں۔" اس مرتبہ ... آواز بالکل نزدیک سے آئی۔ اُس کے سائے کی ... سے مجھے معلوم ہُوا کہ وہ عین میرے سر پر ہے۔ مَیں ... اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ میرے ... میں ہوا بہت کم رہ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے تار... رہی تھی اور ذہن غنودگی میں ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

خدا نے میری دُعا سُن لی تھی اور کیتھی کو میری جان ... کے لیے بھیج دیا تھا۔ کیتھی نے مجھے اپنے بازوؤں ... بھر لیا اور سطح کی جانب اُٹھنے لگی۔ مَیں بار بار صدق ... سے دُعا مانگ رہی تھی: "اے خُدا! میرے پیار... مجھے بچا لے۔ مجھے زندگی کی بھیک دے دے!"

کیتھی سمندر کی موجوں سے نبرد آزما تھی۔ پھر ... آب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مَیں نے ایک ... سانس لیا۔

"جونی! کیا تم ٹھیک ہو؟" کیتھی ساحل کی ... ہُوئے بولی۔

مَیں نے پلکیں جھپکا کر ذہن سے غبار دُور کر... گھبراہٹ پر قابو پانے کی اپنی سی کوشش کی۔ اب ... اس ہولناک خدشے کی تصدیق ہو گئی تھی کہ مَیں ... اور ٹانگیں ہلانے سے قاصر ہُوں۔ عجیب سی بات ... مجھے اپنے بازو کیتھی کے شانوں کے گرد ... میں جھُولتے نظر آ رہے تھے جبکہ احساس یہ ... وہ میرے سینے کے گرد سختی سے لپٹے ہُوئے ...

"کیتھی! مَیں حرکت کرنے سے قاصر ہُوں ..." آواز میں شدید اضطراب تھا اور مَیں بے حد ... ہو چکی تھی۔ کیتھی مجھ سے زیادہ بدحواس ہو رہی تھی ... اثبات میں سر ہلا سکی۔ اُس کی تمام تر توجہ کا مرکز ... تھا۔ بالآخر ساحل پر پہنچ کر اُس نے مجھے نرم گرم ... لٹا دیا۔

"کیتھی! مجھے پکڑ لو!"

"جونی! مَیں تمہیں سنبھالے ہُوئے ہُوں۔" اُس نے میرے بازو اُوپر اُٹھا کر مجھے دکھائے۔

"لیکن مجھے تمہاری گرفت محسوس نہیں ہو رہی۔ مجھے زور سے بھینچ لو۔"

کیتھی مجھ پر جھکی اور اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ مَیں یہ دباؤ بھی محسوس نہ کر سکی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا یہاں تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے؟" اُس نے میری ٹانگ پر چُٹکی بھری۔

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

"یہاں؟" اُس نے میری کلائی پر دباؤ ڈالا۔

"نہیں ..." میرے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ "مجھے یہ بھی محسوس نہیں ہُوا۔"

"شاید یہاں کچھ محسوس ہوتا ہو۔" اُس کا ہاتھ میرے شانے پر رینگنے لگا۔

مَیں خوشی سے چلّا اُٹھی: "ہاں، ہاں۔ یہاں تمہارا ہاتھ محسوس ہو رہا ہے۔" مسرت اور طمانیت سے میرا رُواں رُواں جھوم اُٹھا۔ میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ تھی جہاں مجھے کچھ محسوس ہوتا تھا۔ کیتھی بھی قدرے مطمئن دکھائی دینے لگی۔

ریت پر لیٹے لیٹے مَیں نے حالات کا جائزہ لینا شروع ... سمندر میں غوطہ خوری کرتے ہوئے میرا سر کسی چٹان سے ٹکرایا تھا اور اُس کی وجہ سے کھوپڑی میں کوئی اندرونی ... چوٹ آئی تھی جس نے بازو اور ٹانگیں بے جان کر دی تھیں۔ میرے دماغ نے یہی منطقی نتیجہ اخذ کیا۔ اس کے علاوہ میری اس حالت کا اور کوئی سبب ذہن میں نہ آتا تھا۔

اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بھاگ دوڑ مچی ہُوئی تھی۔ مجھے اسٹریچر کی طرح پہیّوں والی ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ ایک نرس نے جلدی جلدی میرا جسم پٹیوں سے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا اور اُسے دھکیلتی ہُوئی ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ مَیں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ہاتھ پَیر ہلانے کی دیوانہ وار جدّوجُہد کی لیکن پہلے کی طرح ناکام رہی۔ مجھے خود اپنی بے چارگی پر ترس آنے لگا۔ مَیں کتنی بے بس ہُوں، اپنے ہاتھ پَیر بھی نہیں ہلا سکتی۔ مَیں حد درجہ خوفزدہ تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"خدا کے لیے بتاؤ مجھے کیا ہو گیا ہے!" مَیں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں پُوچھا۔

نرس نے لاپروائی سے اپنے شانے اُچکائے: "ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

"مجھے کتنی دیر اسپتال میں رہنا ہو گا؟ کیا رات تک مَیں گھر جا سکوں گی؟"

"مجھے افسوس ہے تمہیں یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحب سے پُوچھنی ہوں گی۔ قواعد و ضوابط ..." اُس کی آواز میں جذبات کا رنگ ہرگز نہ تھا۔ لہجہ پیشہ ورانہ اور سپاٹ تھا۔

ایک درمیانی عُمر کا مرد سیاہ پتلون اور ڈاکٹروں کا مخصوص کوٹ پہنے کمرے میں داخل ہُوا: "میرا نام ڈاکٹر شیرل ہے۔" اُس نے خوشگوار اور دوستانہ انداز میں کہا اور کلپ بورڈ پر لگے ہُوئے کاغذات اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

"تمہارا نام جونائی ہے نا؟"

"میرے نام کا تلفظ جونی ہے۔ یہ میرے ابّو کے نام کا حصّہ ہے۔"

"شکر ہے تمہارا دماغ دُرست حالت میں ہے۔ اچھا جونی! چلو دیکھتے ہیں تمہیں کیا ہُوا ہے۔ ذرا بتاؤ کچھ محسوس ہُوا؟" اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی سُوئی تھی جسے وہ میرے پیروں، پنڈلیوں اور رانوں میں چبھو رہا تھا۔

"نن ... نہیں۔ مجھے کچھ محسوس نہیں ہُوا۔"

"اب؟"

مَیں نے اپنی آنکھیں پُوری قُوّت سے بھینچ لیں اور دانت جکڑ لیے تاکہ پُوری توجّہ اس جانب مبذول کر سکوں۔ نہ معلوم کیوں مجھے گمان تھا کہ شاید اس طرح مَیں کچھ محسوس

کر سکوں مگر کچھ بھی تو نہ ہُوا۔

"کچھ محسوس نہیں ہُوا ڈاکٹر!"

ڈاکٹر نے میرا ہاتھ اُٹھا رکھا تھا اور سُوئی کے بعد دیگرے اُنگلیوں، ہتھیلیوں، کلائیوں اور بازوؤں میں چبھو رہا تھا۔ "کیا وجہ ہے مَیں کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتی؟" مَیں نے سوچا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر نے سُوئی میرے شانے پر چبھوئی جو مَیں نے محسوس کر لی اور فوراً بولی: "یہاں محسوس ہوتا ہے۔"

اس دوران میں اور ڈاکٹر کمرے میں داخل ہُوئے۔ بوتلوں، ٹیوبوں اور طشتریوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ مَیں نے ڈاکٹر شیرل کی آواز سُنی جو کسی دوسرے ڈاکٹر کو اپنے قریب بُلا رہا تھا۔ پھر وہ دونوں آپس میں محوِ گفتگو ہو گئے۔ مَیں گردن موڑنے سے بھی قاصر تھی، اس لیے اُنہیں دیکھ نہ سکی۔ اُن کی ثقیل اور نامانوس طبّی اصطلاحات سے بھرپور باتیں سُنیں لیکن میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ پھر ایک آواز آئی:

"فریکچر اور ڈِس لوکیشن معلوم ہوتا ہے۔"

"مریضہ کے محسوسات پیشِ نگاہ رکھتے ہُوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈّی کا چوتھا یا پانچواں مُہرہ متاثّر ہُوا ہے۔" ڈاکٹر شیرل نے کہا۔

مَیں نے کن اکھیوں سے دیکھا کوئی اسپرٹ میں بھیگی رُوئی سے میرا بازو صاف کر رہا ہے۔ پھر بازو میں ایک سُوئی بھونک دی گئی۔ مجھے انجکشن کا احساس تک نہ ہو سکا۔ مَیں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ ڈاکٹر شیرل کے ہاتھ میں بال مونڈنے والی بجلی کی مشین تھی جسے بالعموم حجام استعمال کرتے ہیں۔ پھر کلک کی آواز کے ساتھ مشین چلنے کی تھرتھراہٹ سُنائی دینے لگی۔ مَیں حیران تھی کہ اسپتال میں اس مشین کا مصرف بھلا کیا ہو گا لیکن پھر اچانک میرے جسم میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مشین میرے سر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"نہیں ...." مَیں چلّا اُٹھی۔ "میرے بال مت مونڈو!"

مَیں سِسکیاں لے رہی تھی۔ مجھے اپنے تانبے کی رنگت والے بالوں پر بے حد ناز تھا مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ مشین میرے سر پر چل رہی تھی اور لمبے گھنے بال اطراف میں گر رہے تھے۔ ایک نرس صابن کا جھاگ بنا رہی تھی۔ اُس نے جھاگ سے میرا سر ڈھانپ دیا اور پھر ایک اُسترا اُٹھا کر میری طرف بڑھی۔ مَیں خوف سے کانپ گئی۔ یہ تو مجھے بالکل گنجا کر رہے ہیں۔ اوہ خدایا! مَیں گنجی ہو جاؤں گی۔ گنجی ہو کر تو میری شکل و صورت بالکل بگڑ جائے گی اور پتہ نہیں بالوں کو اپنی پُوری لمبائی تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے!

اچانک مجھے غنودگی نے آلیا۔ غالباً یہ اُس انجکشن کا اثر تھا جو اُنھوں نے تھوڑی دیر قبل لگایا تھا۔ مجھ پر گہری نیند کا غلبہ ہو رہا تھا اور مَیں ہلکورے لیتے ہُوئے ایک انوکھی دُنیا میں اُترتی جا رہی تھی۔ مَیں اور زیادہ بے چین ہو گئی۔ اگر بے ہوشی ہی میں انتقال ہو گیا تو مَیں اپنے پیاروں کی صُورت دوبارہ نہ دیکھ سکوں گی۔ کیا مَیں ابّو، امّی اور ڈِک کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں گی؟ اے خُدا! میری مدد کر۔ خُدایا! مجھے حوصلہ دے۔ مَیں خلوصِ دل سے خدا کو یاد کر رہی تھی۔

مجھے چہرے نظر آ رہے تھے، آوازیں سُنائی دیتی رہیں لیکن یہ سب کچھ ایک خواب کے مانند تھا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبنے لگا اور آوازیں دھیمی پڑتی گئیں۔ مَیں بے ہوش ہو چکی تھی۔

بعد کے واقعات مجھے گزرے ہُوئے خواب کی طرح یاد ہیں۔ کبھی کبھار مَیں ہوش میں آتی مگر پھر فوراً ہی بے ہوش ہو جاتی۔ تیز اثر دوائیوں نے مجھے خوابناک دُنیا میں دھکیل دیا تھا جو بھیانک اور خون منجمد کر دینے والے خوابوں سے عبارت تھی۔ مَیں کابوس کا شکار تھی۔ اور خواب ایسے عجیب و غریب تھے کہ مَیں سوچتی غالباً مَیں پاگل ہو چکی ہُوں۔

جب مجھے مکمل ہوش آیا تو مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں

کینوس کے ایک فریم میں پیٹ کے بل پیوست ہُوں۔ میرے چہرے کے نیچے ایک سوراخ تھا جس میں سے فرش کا ذرا سا حصّہ نظر آتا تھا۔ مجھے زنانہ جوتوں کا ایک سفید جوڑا اور ٹانگوں کا کچھ حصّہ دکھائی دیا۔ مَیں نے آواز دی:

"نرس!" میری آواز میں دُنیا جہان کی نقاہت سمٹ آئی تھی۔

"مَیں موجود ہُوں۔ کیا بات ہے؟"

"کک ... کک ... کہا ... کہاں؟" میرے مُنہ سے الفاظ پھسل گئے۔

"شش۔ بولو مت۔ تھک جاؤ گی۔" نرس کی آواز آئی۔ "بس تم زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ہو سکے تو سو جاؤ۔ تم اس وقت انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہو۔"

رفتہ رفتہ مَیں اپنے گردوپیش سے واقف ہوتی گئی۔ مجھے معلوم ہُوا کہ جسے مَیں بستر سمجھتی تھی، وہ خصوصی قسم کا اسٹرائیکر فریم ہے۔ دراصل میرے اوپر اور نیچے دونوں طرف کینوس تھا جسے پٹیوں کے ساتھ سختی سے جکڑ دیا گیا تھا۔ بالفاظِ دیگر مَیں اُس میں سینڈوچ بنی پڑی تھی۔

کتنے ہی دن رات اس حالت میں گزر گئے۔ اُف! وہ بھی کتنا دہشت ناک منظر تھا۔ درد سے میرا دماغ ماؤف ہو جاتا اور تیز سے تیز دوا اس کا درماں کرنے سے قاصر رہتی۔ رات سوتے ہُوئے مَیں خوفناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی۔ ایک طویل عرصہ مَیں نے کینوس کے بنے ہُوئے اس بندی خانے میں گزارا لیکن اس وقت بھی اک گونہ اطمینان تھا۔ مجھے تائیدِ ایزدی حاصل تھی اور مَیں اپنی رُوح کی گہرائیوں سے خُدا کو یاد کرتی، دُعائیں مانگتی۔ مجھے احساس تھا کہ خُدا نے مجھ پر عنایت کی ہے اور میری زندگی بچالی ہے۔ وارڈ میں مریض آتے رہے وہ سب موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتے تھے۔ اُن میں کچھ اس جدوجہد میں ناکام رہتے اور باقی بہتر ہونے پر اسپتال کے عام وارڈوں میں منتقل کر دیے جاتے لیکن مَیں یہاں کی مستقل مکین بن چکی تھی۔ میری حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہُوئی۔ مَیں بہتر ہُوئی نہ میری حالت مزید بگڑی۔

خوفناک خواب مجھے رات کے وقت جگا دیتے اور مَیں پسینے میں شرابور ہوتی۔ اس ذہنی کرب سے نجات حاصل کرنے اور اپنا ذہن بٹانے کی خاطر مَیں نے جاگتے میں خوابوں کے جال بُننے شروع کر دیے۔ مَیں اپنی زندگی کی خوشگوار یادیں ذہن کے دامن میں سمیٹتی اور خُدا کی حمد و ثنا کرتی۔ حادثے سے قبل میری زندگی خوش باش، پُرسکون اور طمانیت سے عبارت رہی تھی۔ سب لوگ مجھ پر اپنی عنایات نچھاور کرتے تھے اور مجھے زندگی میں بھرپُور توجہ ملی تھی۔ ہمارے خاندان کو اتنے خوفناک حادثے سے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔ خدا نے ہمیں وہ سب کچھ عطا کر رکھا تھا جس کی انسان کو تمنّا ہوتی ہے۔ ابّو بے انتہا حلیم الطبع انسان تھے اور مَیں نے اُنہیں کبھی غصّے میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے بچّوں پر فدا رہتے تھے اور اُن کی شفقت بے کراں سمندر

پشاور کا رنگین تحفہ
سُلطانی مہندی
رنگین و خوبصورت بند پیکٹوں میں
فون : 62530 پشاور

کی طرح وسیع و عمیق تھی۔

مختصر ملاقات کی اجازت ملنے پر ابّو اسپتال آتے تو مجھے ہمیشہ خُدا کی عنایات پر کامل اعتقاد رکھنے اور اُس سے دُعا مانگنے کی تلقین کرتے۔ زبان سے وہ مجھے پُورا یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔ لیکن اُن کے چہرے کا کرب اور آنکھوں کی بے چینی ظاہر کرتی کہ وہ مجھے بہلانے کی خاطر، انتہائے ضبط سے کام لیتے ہُوئے خُونِ جگر خاموشی سے پی رہے ہیں۔ اندرونی طور پر بھی وہ ٹُوٹ پھُوٹ کا شکار تھے۔ اُن کی چہیتی بیٹی اُن کی آنکھوں کے سامنے اسپتال کے ایک عجیب و غریب بستر پر لاچار پڑی تھی اور ہاتھ پیر ہلانے سے قاصر تھی۔

ابّو نے زندگی میں کبھی اسپتال کا رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ باقاعدہ اتھلیٹ تھے اور امّی بھی اُن کھیلوں میں ابّو کا پُورا پُورا ساتھ دیتی تھیں۔ دونوں کی صحت قابلِ رشک تھی۔ درحقیقت امّی ہی نے ہمیں ٹینس اور پیراکی سکھائے۔ ہم لوگ کوہ پیمائی کے بھی شوقین تھے۔ ان جسمانی کھیلوں نے ہمارے پُورے خاندان کو خوب چاق چوبند رکھا ہُوا تھا۔ ہم خُدا کی عبادت میں بھی دلچسپی لیتے اور مذہبی اجتماعات میں والدین کے ساتھ شریک ہوتے۔

ہم چار بہنیں تھیں لیکن خُدا نے ہمیں کوئی بھائی نہیں دیا تھا۔ کیتھی عُمر میں مجھ سے چھوٹی تھی۔ اُسی نے مجھے سمندر سے نکالا تھا۔ جے کی عمر تیئیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اُس کی ایک پیاری سی بچّی تھی۔ تمام بہنوں میں جے سے زیادہ مَیں ہی بے تکلف تھی۔ سب سے بڑی بہن ہزی کے چھوٹے چھوٹے تین بچّے تھے اور وہ اپنے شوہر کے ہمراہ دوسرے شہر میں خوش و خرّم زندگی بسر کر رہی تھی۔

ماضی کی یہ تمام خوشگوار یادیں میرے ذہن کو اذیت ناک خوابوں سے نجات دلانے میں بڑی معاون ثابت ہُوئیں۔ مَیں اپنے اسکول کے دن یاد کرتی جو اپنی انمول اور انمٹ یادیں چھوڑ گئے تھے۔ مجھے اپنا کلاس فیلو ڈِک بھی یاد آتا۔ اُس سے میری گہری دوستی تھی جس میں رومانیت اور سستے جذبات کو دخل نہیں تھا۔ ہم اچھے، قریبی دوست تھے۔

مَیں فارغ اوقات میں گھر پر گٹار بجاتی، موسیقی سُنتی اور مذہبی کُتب کا مطالعہ کرتی۔ یہ میرے مشغلے تھے۔ والدین بچپن سے ہمیں مذہب پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے آئے تھے۔ اور اُنھوں نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ خُدا بے حد مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

نوجوانی کی عمر شوریدہ سری کے لیے آفاقی شُہرت رکھتی ہے۔ مَیں بھی عُمر کے اسی دَور سے گزر رہی تھی۔ اکثر میرے ذہن میں خیال آتا کہ کھیل کُود، پارٹیوں اور پکنک میں شرکت اور زندگی سے مکمل حظ اُٹھانا ہی مقصدِ حیات ہے۔ بعض اوقات میرے ذہن میں یہ خیال بھی آتا کہ ہم خُدا کی عبادت کیوں کریں جبکہ وہ ہمیں نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن اب اِس حادثے سے دوچار ہونے کے بعد میری آنکھیں کھُلیں کہ واقعی خُدا ہر جگہ موجود ہے اگرچہ ہماری ظاہری آنکھ اُسے نہیں دیکھ سکتی۔ اُس نے میری زندگی بچالی تھی۔ مَیں اُس کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔ مَیں اپنے ماضی کے شیطانی خیالات پر لعنت بھیج کر خُدا کے وجود کی دلی طور پر قائل ہو چکی تھی۔

اور نوازشاتِ خداوندی کی انتہا دیکھیے، جس دن مَیں یہ سب کچھ سوچ رہی تھی، اُس رات مجھے زندگی کا خوشگوار ترین خواب نظر آیا۔ مجھے خواب ہی میں تندرستی عطا کیے جانے کی بشارت ہُوئی۔ صبح بیدار ہونے پر خلافِ معمول بے حد ہشاش بشاش اور پُرسکون تھی۔ مَیں خُدا کی حمد و ثنا کرتی رہی۔ "اے خُدا! تو میری کوتاہیاں معاف کر دے!"

دوپہر سے ذرا قبل ڈاکٹر شیرل مجھے دیکھنے آیا تو مَیں نے اُس سے پُوچھا: "ڈاکٹر صاحب! مجھ میں کیا خرابی ہے؟"

"جونی! تمہاری ریڑھ کی ہڈّی کا چوتھا اور پانچواں مُہرہ ...ٹ گیا ہے۔"

"یعنی میری گردن ٹُوٹ گئی ہے؟"

"ہاں، عام فہم زبان میں یہی کہتے ہیں۔"

"لیکن اس طرح تو مجھے فوراً مر جانا چاہیے تھا۔"

"خُدا جس کو چاہے، زندگی بخش دے۔ خود ہمارے ... تم بڑا انوکھا اور تاریخی کیس ہو۔ دیکھو نا جونی! زندگی اور ...وت تو خُدا کے اختیار میں ہے۔ تمہارا حادثہ بے حد خوفناک ...ا لیکن مشکل مرحلے سے ہم گزر آئے ہیں۔ اگر تم قوّتِ ارادی ...وئے کار لاؤ تو جلد بہتر ہو جاؤ گی، اور جب تم بہتر ہو جاؤ گی، ...یں ایک آپریشن کر کے تمہاری ہڈّیاں جوڑنے کی کوشش ...وں گا۔"

"میری گردن کی ہڈّیاں جُڑ جائیں گی!" مسرت اور ...ت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اتنے دنوں بعد یہ ...ی خوشخبری تھی جو میں نے سُنی تھی۔ رات کا خواب سچ ثابت ...و رہا تھا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں خُدا کا شکر گزار تھا۔ اب ...یں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میرے ہاتھ پاؤں کام کرنے لگیں ...گے اور میں پھر زندگی کی رعنائیاں دیکھ سکوں گی۔

دھڑکتے دل سے میں نے پُوچھا: "ڈاکٹر صاحب! یہ ...یشن کب ہو گا؟"

"...جتنی جلد ممکن ہُوا۔"

"ڈاکٹر صاحب! آج نہیں ہو سکتا یہ؟" میں نے بیتابی ...ے پُوچھا۔ مجھے اس آپریشن کی پیچیدگیوں اور نزاکت ...ے بارے میں کچھ علم ہوتا تو ایسا احمقانہ سوال ہرگز نہ کرتی۔ ...ڈاکٹر نے بڑی شفقت سے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بتایا کہ ...ابتدائی تیاریوں کے بعد چند دنوں میں آپریشن ہو جائے گا۔

آپریشن کے بعد مجھے انتہائی نگہداشت کے یُونٹ سے ...ارج کر کے اسپتال کے عام وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ مجھے ...خوشی تھی کہ یہ بہتری کی علامت ہے اور مَیں خدائے بزرگ و ...برتر کا شکر ادا کرتی رہی۔

آپریشن تھیٹر سے واپسی پر ابّو اور امّی مسکراتے ہُوئے میرے پاس آئے۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر شیرل بھی تھا۔ اُس نے ہمارے سوالات بھانپتے ہُوئے کہا: "سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آپریشن مکمل طور پر کامیاب رہا۔"

پُورے خاندان نے طویل عرصے بعد سُکھ کی سانس لی۔

"تاہم میں چاہتا ہُوں کہ اب آپ لوگ اگلے اقدام پر توجہ مرکوز کریں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں جانتی ہُوں کہ زخم ٹھیک ہونے اور ٹانکے کھُلنے میں کچھ وقت لگے گا اور پھر مجھے آرام بھی کرنا ہو گا۔" مَیں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ "آپ نے کہا تھا کہ ان باتوں میں وقت لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں، ڈاکٹر صاحب!" ابّو نے کہا: "اندازاً کتنا وقت اور لگ جائے گا؟"

امّی بولیں: "ڈاکٹر صاحب! ہم نے تو اس سمیسٹر کے لیے کالج میں جونی کی فیس بھی جمع کرا دی تھی۔ کیا ہم اگلے سمیسٹر تک انتظار کر لیں؟"

ڈاکٹر کچھ سوچ میں پڑ گیا، پھر آہستگی سے بولا: "ہاں فیس تو واپس لے ہی لیں۔"

"سچ!" مَیں نے مسرت سے بے قابو ہو کر چیخ لگائی۔

اس وقت تک ڈاکٹر سنبھل چکا تھا۔ بڑے محتاط لہجے میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہُوئے اُس نے امّی کو مخاطب کیا: "مسز ایرکسن! میرے خیال میں آپ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ فیس واپس لے ہی لیں کیونکہ جونی اب کبھی کالج نہیں جا سکے گی۔" وہ افسردگی سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"ڈ... ڈ... ڈاکٹر صاحب... آ... آپ کا مطلب ہے آپ کو یقین نہیں جونی کب تک اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے گی؟" امّی نے گھبراہٹ سے پُوچھا۔

"مسز ایرکسن! آپ لوگ میری بات نہیں سمجھے۔ بات یہ ہے کہ جونی کی چوٹ مستقل ہے۔ کوئی آپریشن اسے قدرتی حالت میں واپس نہیں لا سکتا۔"

کمرے میں سوگوار سنّاٹا طاری ہوگیا۔ ہر ایک اپنے اپنے خیالات میں گم تھا۔ کسی کو بولنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اور پھر کہنے کو اب رہ بھی کیا گیا تھا؟

ڈاکٹر شیرل نے ہماری ہمت بندھانے کی کوشش کی: "اتنی بھی مایوسی ٹھیک نہیں۔ جونی خاصی حد تک ٹھیک ہو جائے گی۔ اپنے پاؤں پر تو وہ کبھی نہ چل پھر سکے گی، تاہم تھوڑے عرصے بعد اس کے دست و بازو پہلے کی طرح کام کرنے لگیں گے۔ دیکھیں نا، دُنیا میں کروڑوں افراد ایسے موجود ہیں جو پاؤں استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے لیکن بڑی فعّال اور خوش و خرّم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زندگی میں پُوری دلچسپی لے رہے ہیں اور بڑے تعمیری کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بآسانی کار چلاتے ہیں، اپنی روزی کماتے ہیں، گھریلو کام کاج کرتے ہیں۔ صورتِ حال مایوس کُن تو نہیں ہے نا۔ خُدا نے اپنا کرشمہ دکھایا کہ جونی کی زندگی بچ گئی ورنہ اس چوٹ والے عموماً بچا نہیں کرتے۔ یہ خدا کا آپ پر خاص کرم ہے۔ اب ہمیں پُوری اُمید ہے کہ تھوڑا عرصہ بعد جونی اپنے ہاتھوں سے وہیل چیئر چلاتی گھر رخصت ہو گی۔ ٹھیک ہے نا جونی؟"

ڈاکٹر نے ہر طرح سے تسلّی دی۔ ابّو سے ہاتھ ملایا اور میری طرف دیکھ کر مُسکراتا ہُوا واپس چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی ہم میں سے کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہُوئی۔ آج ہمارے خواب ہمیشہ کے لیے بکھر گئے تھے۔ ہم سب اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ کسی میں اتنی جُرأت نہ تھی کہ اس خاموشی کو توڑتا۔ امّی اور ابّو تھوڑی دیر بیٹھ کر اُٹھ گئے۔ شاید اُن میں اس سے زیادہ برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔

مَیں اپنے کروڑوں وسوسوں کے درمیان اکیلی رہ گئی۔ رفتہ رفتہ مَیں نے روشن پہلو پر غور کرنا شروع کیا تو مجھے خوشی ہُوئی کہ اوّل تو میرا آپریشن کامیاب رہا اور خدا نے میری دُعائیں سُن لیں اور اب میری حالت تیزی سے بہتر ہو جائے گی۔ مَیں اپنے ذاتی کمرے میں منتقل ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اُمید دلائی تھی کہ میرے دست و بازو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود دل میں ایک نامعلوم سی خلش تھی۔

اگلے چند ہفتے میری حالت میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ ہُوئی اور مجھ میں وہ قُوّت عود نہ کر سکی جس کی مَیں آس لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے اب بھی نس یا مُنہ کے ذریعے مائع غذا دی جاتی۔ میرا وزن گھٹتا جا رہا تھا۔ ٹھوس غذا کے لیے دل بے حد للچاتا لیکن مہیا ہونے پر مَیں کھانے سے قاصر رہتی۔ زیادہ تر انگور کے رس پر گزارا کرتی۔

ایک دن اسکول کی دو سہیلیاں میری عیادت کو آئیں۔ ہماری آخری ملاقات حادثے سے خاصے دن قبل ہُوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُنہیں بے حد صدمہ ہُوا بلکہ وہ کچھ سے کچھ خوفزدہ سی نظر آنے لگیں۔ مجھ سے اُن کا یہ ردِّعمل پوشیدہ نہ رہ سکا۔

ہُوا یُوں کہ وہ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہُوئیں اور پھر اُنہوں نے حیرت زدہ نظروں سے اسٹرائیکر فریم اور کمرے کا دیگر ساز و سامان دیکھنا شروع کیا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھیں اور خوفزدہ سی میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔ مَیں اُنہیں کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی کیونکہ مَیں اپنا سر ہلانے سے بدستور قاصر تھی۔

"آؤ، آؤ"، مَیں نے بڑی خوش دلی سے اُن کا استقبال کیا: "مجھے افسوس ہے کہ مَیں اپنا سر ہلا نہیں سکتی لیکن اگر تم ذرا سامنے آ جاؤ تو ..."

"اوہ جونی!" اُن میں سے ایک نے سِسکی لی۔

"اوہ خُدایا!" دوسری خوفزدہ سی آواز میں بولی۔

چند لمحوں کے لیے کمرے میں پُرہول سنّاٹا طاری ہو گیا۔ یہ خاموشی مجھے بے حد تکلیف دہ لگ رہی تھی۔ پھر کمرے میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ بھاگتی ہُوئی یُوں کمرے سے نکلیں جیسے اُنہوں نے کوئی بھوت پریت دیکھ لیا ہو۔

باہر سے مجھے اُن کے باقاعدہ بلند آواز سے رونے کی آوازیں سُنائی دیں۔

میرے جسم میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہیں کیا ہو گیا تھا؟ یہ کس بات سے اتنی خوفزدہ ہُوئیں؟ اس سے قبل تو کسی نے ایسے ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کیا باقی تمام لوگ کوئی خاص بات چُھپانے کی کوشش کر رہے تھے؟ ضرور یہی بات ہو گی! مَیں نے ذہن سے اس واقعے کے تمام نقوش مٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس خلش نے مجھے بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ مَیں جتنا بُھلانے کی کوشش کرتی، اُتنا ہی یہ واقعہ میرے ذہن میں جڑ پکڑتا گیا۔

چند روز بعد جب میری ایک اور سہیلی جیکی عیادت کو آئی تو مَیں نے اُس سے فرمائش کی: "جیکی! ذرا مجھے آئینہ دینا۔"

وہ قریبی میز پر رکھے ہُوئے حوصلہ افزائی کے کارڈ اور دیگر ڈاک دیکھ رہی تھی۔ ایک دم چونک پڑی: "کیوں خیریت ہے؟ یہ آئینے کی ضرورت کیا آ پڑی تمہیں؟"

"مجھے ایک آئینہ لا کر دو"، مَیں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اوں ...." وہ سوچتی ہُوئی بولی۔ "ٹھیک ہے، وعدہ رہا۔ آئندہ جب آؤں گی تو اپنے ساتھ آئینہ ضرور لاؤں گی۔"

"نہیں ... مجھے ابھی آئینہ لا کر دو۔"

"پیاری جونی! اس وقت آئینہ کہاں سے ملے گا جب میں اگلی مرتبہ ...."

مَیں نے اُس کی بات کاٹ کر اُسے ڈانٹ دیا: "مَیں کہتی ہُوں مجھے ابھی آئینہ لا کر دو۔ جاؤ کسی نرس سے مانگو۔ ہم اتنے سارے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور وہ ایک آئینہ بھی نہیں دے گی۔ مَیں اُس کو دیکھ لُوں گی۔ جاؤ، جا کر کہو اُس نرس کی بچّی سے۔" میرا غُصّہ بامِ عروج پر تھا۔

"جونی! تھوڑا سا انتظار کر لو۔ مَیں گھر سے تمہارا پیارا سا ڈریسنگ سیٹ لا دوں گی۔"

"جیکی!" مَیں حلق میں سے دہاڑی: "مجھے آئینہ لا کر دو۔ اسی وقت ... ابھی!!"

وہ بادلِ ناخواستہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اور جب واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ہاتھ کانپ رہے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ جب اُس نے آئینہ میرے چہرے کی طرف بڑھایا، مَیں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔

میری فلک شگاف چیخ سُن کر جیکی خوف سے اُچھل پڑی۔ آئینہ اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"اُف! مَیں تو بُھتنی بن چکی ہُوں"، میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

آئینے میں نظر آنے والی صورت انسانی تو ہرگز نہ تھی۔ کیا واقعی مَیں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا، یا یہ فریبِ نظر تھا۔ جو کچھ نظر آیا، وہ بڑے بڑے جیالوں کا پتہ پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ گہرے، بہت گہرے غاروں میں دھنسی ہُوئی دو بے رونق آنکھیں، جو کبوتر کے خُون سے زیادہ سُرخ اور جھیل کے پانیوں سے زیادہ نم تھیں، مجھے ڈراؤنے انداز میں گھور رہی تھیں۔ جہاں کبھی میرا تر و تازہ خوبصورت چہرہ ہُوا کرتا تھا، وہاں میڈیکل کالجوں والا ایک ڈھانچہ رکھ دیا گیا تھا جس کی ہڈیوں پر پیلی زرد، یرقان زدہ سی کھال منڈھ دی گئی تھی۔ میرا گنجا سر مجموعی تاثر کو مزید بھیانک اور کریہہ بنا رہا تھا۔ مَیں نے اپنے دانت دیکھے۔ دوائیوں کے استعمال سے وہ کالے سیاہ ہو رہے تھے۔

جیکی نے آئینہ ہٹا لیا اور ہم دونوں بڑی خاموشی سے آنسو بہانے لگیں۔ پھر وہ بولی: "جونی! مجھے افسوس ہے مَیں کیا بلکہ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ تمہیں تکلیف پہنچے اور تم اپنی یہ حالت دیکھو۔"

"خدا کے واسطے آئینہ ہٹا لو جیکی! مَیں اب کبھی آئینے میں نہیں دیکھوں گی۔ بس بہت ہو چکی۔ مَیں نے بہت تکلیفیں اُٹھالی ہیں۔ اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا

جا رہا ہے۔ جیکی! میں مر رہی ہوں۔ میری طرف دیکھو۔ میں نیم مُردہ تو ہو ہی چکی ہوں۔ جیکی! یہ ظالم مجھے اتنی اذیتیں کیوں دے رہے ہیں؟ مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے؟ مجھے مار کیوں نہیں دیتے؟"

"ایسی باتیں نہیں کرتے پیاری بہن! خُدا پر کامل یقین رکھو۔ وہ شفا دینے والا ہے۔ تم تندرست ہو جاؤ گی۔"

"جیکی! میری مدد کرو۔ وہ مجھے زبردستی زندہ رکھ رہے ہیں۔ یہ میرے ساتھ انصاف نہیں زیادتی ہے۔ آخر کار میں مر ہی جاؤں گی۔ پھر وہ مجھے مر جانے کیوں نہیں دیتے؟ میری مدد کرو جیکی! مجھے مرنے دو۔" میرا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا اور میں اول فول بک رہی تھی۔

"لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں جونی؟ میں ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔"

"جیکی! مجھے زہر لا دو۔ خواب آور گولیوں کی شیشی لا دو۔ جیکی! میری مدد کرو۔"

"جونی! تم پاگل ہو رہی ہو۔ جانتی ہو میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ اگر میری جگہ تم ہوتیں تو کیا ایسا کام کر سکتی تھیں؟ نہیں ہرگز نہیں! خُدا پر یقین رکھو جونی! اُس سے دُعا مانگو۔ وہ تمہاری مشکلات آسان کرے گا۔ تمہیں دیکھ کر میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ تم تو میری عزیز سہیلی ہو۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ میں تمہارے لیے دُعا کرتی رہتی ہوں لیکن جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ میں ہرگز نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں..." وہ خاموش ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پاگل پن کا دورہ ختم ہو چکا تھا اور اب میں اپنی حرکت پر شدید پشیمان تھی۔ جیکی کے ساتھ مجھے ایسا رویّہ اختیار کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ "جیکی! مجھے معاف کر دینا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "بیماری نے ذرا مجھے چڑچڑا بنا دیا ہے۔ مجھے اپنے رویّے پر شدید ندامت ہے۔ میری اس تکلیف میں بھی خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی۔ براہِ کرم میرا ایک کام کرنا۔ ڈِکی سے مل کر اُسے میرا پیغام دے دینا کہ وہ آج کی رات مجھ سے ملاقات کرے۔"

جیکی نے یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی۔

رات ڈِکی آیا۔ اُس نے مجھے بے حد تسلّی دی اور خُدا کی مصلحتوں اور انسان کی ناسمجھی کے بے شمار واقعات سُنائے۔ شاید جیکی نے اُسے میرے دَورے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے میری بے حد ڈھارس بندھائی اور مجھے زندگی کی طرف لَوٹ آنے کی ترغیب دیتا رہا۔

اُس دن کے بعد سے میں نے اپنے حادثے کے متعلق مثبت سوچ اختیار کر لی۔ اب میں ڈاکٹر، نرسوں اور عیادت کے لیے آنے والوں کے ساتھ اسی موضوع موضوع پر گفتگو کرتی کہ خُدائے عزّوجل نے میری ایمان کی مضبوطی اور عقیدے کی پختگی پرکھنے کے لیے مجھے اس امتحان میں ڈالا ہے۔ میں خوش تھی کہ تمام لوگ میری اس بات سے پُوری طرح متفق ہیں۔ میں اُن سے کہا کرتی: "اب جبکہ مجھے حقیقت کا ادراک ہو گیا ہے اور صحیح صورتِ حال سے واقفیت ہو گئی ہے، میں اپنے ایمان کی پختگی ثابت کر کے اس امتحان میں کامیاب و کامران اُتروں گی۔ دیکھنا وہ دن دُور نہیں جب میں معمول کی زندگی بسر کر کے خُدا کا شکر ادا کرنے کے قابل ہو جاؤں گی۔"

اور پھر واقعی میں بہتر ہونے لگی؛ چنانچہ ایک دن ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اب میری حالت اتنی سنبھل چکی ہے کہ مجھے اُس ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے جہاں مجھ ایسے مریضوں کے ہاتھوں، پیروں وغیرہ کو فزیکل تھراپی سے قابلِ استعمال بنانے میں اُن کی مدد کی جاتی ہے۔ میں خود کو ایک ماہ تک وہاں منتقل ہونے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرتی رہی۔ میرے ذہن میں وہاں کا تصوّر کچھ ایسا تھا کہ اُونچی لمبی چوڑی پُرانے طرز کی قلعہ نما عمارت ہو گی جس کے چاروں طرف وسیع و عریض ہرے بھرے خوش رنگ پھولوں سے ڈھکے لان ہوں گے اور پُورے علاقے میں دُور دُور تک ہرے بھرے درخت سرسرا رہے ہوں گے۔ کمرے بھی بڑے بڑے اور اُونچی چھتوں والے ہوں گے جیسے پرانے قلعوں یا حویلیوں میں ہوتے تھے۔

لیکن جب ایمبولینس گیٹ کے اندر داخل ہُوئی تو میرے خیالی محل دھڑام سے زمیں بوس ہو گئے۔ یہ جگہ میرے تصورات کے عین برعکس تھی۔ کئی بلاکوں پر مشتمل یہ ایک عام سی یک منزلہ عمارت تھی جو دیکھنے میں سرکاری دفاتر کا مجموعہ نظر آتی تھی۔

"لو بیٹی! ہم یہاں پہنچ گئے۔" ایمبولینس کا ڈرائیور بڑے پیار سے بولا۔

"ہُوں۔" میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"کوئی گڑبڑ ہے کیا؟"

"اُوں... نہیں۔ میرا خیال ہے سب ٹھیک ہے۔ دیکھو نا، کسی جگہ یا کسی چیز کے بارے میں انسان کی توقعات کچھ ہوتی ہیں جبکہ حقیقت میں وہ عین برعکس ہوتی ہے۔"

ڈرائیور اثبات میں سر ہلا کر بولا: "ہاں یہ بات تو ہے۔" پھر وہ مجھے تسلّی دینے لگا: "بہرحال، بیٹی! گھبراؤ مت۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ یہاں کے لوگ اپنے کام میں منجھے ہُوئے ہیں۔ وہ تمہیں تندرست کر کے یہاں سے بھیجیں گے۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔"

"اُمید تو یہی ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ میرے اسٹریچر کو ایمبولینس سے اُتار کر دھکیلتے ہُوئے مقررہ وارڈ میں لے گیا۔ راستے میں جب وہ مختلف راہداریوں سے مجھے لیے جا رہا تھا تو میں نے کن اکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کُھلے دروازوں سے مجھے مختلف وارڈ نظر آئے۔ یہاں بھی دیگر اسپتالوں کی طرح سناٹے کا راج تھا لیکن حیرت ناک بات یہ تھی کوئی بھی مریض چلتا پھرتا نظر نہ آیا۔ مجھ پر پھر قنوطیت اور افسردگی سایہ فگن ہونے لگی اور میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔

ڈرائیور مجھے میرے وارڈ میں چھوڑ کر واپس ہو گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے اپنے اردگرد کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا جہاں میرے علاوہ چار اور لڑکیاں بھی پہلے سے موجود تھیں۔

"ہیلو ساتھیو! میرا نام جونی ایرکسن ہے۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"جونی ایرکسن۔" اُنھوں نے باری باری میرا نام دُہرایا۔ ایک لڑکی کی باتیں بڑی تلخ و ترش تھیں۔ اُس نے مجھ پر کئی نازیبا جُملے کسے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی؛ تاہم ماحول کو خوشگوار کرنے کے لیے میں نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ یہاں اتنی ساری پیاری پیاری سہیلیوں کی محفل نصیب ہُوئی ہے۔"

لڑکیاں ہنس پڑیں۔ اُن میں سے ایک کی آواز آئی: "جونی! اس این کی بچّی کو معاف کر دینا۔ یہ بھی یہاں نئی نئی آئی ہے اور ابھی زبان دراز اور تلخ مزاج ہے۔ اسپتال میں اس نے بڑا بھیانک وقت گزارا ہے نا۔ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گی۔ میرا نام بیٹی ہے، بیٹی جانسن اور یہ اِدھر ڈینیسی والٹرز ہے۔"

"میں معافی چاہتی ہُوں کہ تمہارے احترام میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔" ڈینیسی جانسن کی آواز آئی۔

"یہی حال اپنا بھی ہے دوست!" میں نے مُسکرا کر کہا۔ "بہرحال، بیٹی اور ڈینیسی! تم دونوں سے مل کر بے حد مسرت ہُوئی۔ اب تو تمہارے ساتھ ہی محفل رہا کرے گی۔"

"اور وہ جو اُدھر ہے نا، اُس کا نام بھی بیٹی ہے۔ بیٹی گلمور۔" بیٹی جانسن نے تعارف جاری رکھا۔ "چنانچہ مجھے یہاں بی جے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بی جے یعنی بیٹی جانسن۔"

اُس رات جب میں اپنے اسٹرائیکر فریم میں سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، مجھ پر ایک مرتبہ پھر گہری یاسیت اور قنوطیت کا دورہ پڑا۔ میں نے خدا کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ذہن بھٹک بھٹک جاتا تھا اور توجہ مرتکز نہ ہو پاتی تھی۔ ذہن میں بے انتہا انتشار تھا۔ میں لگاتار خدا کی صفات کا وِرد کرتی رہی: "اے خُدا! تُو غفور ہے، رحیم ہے، کریم

ہے۔" اس سے دل نے کچھ سکون پایا۔

دوسری لڑکیاں حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھیں۔ وہ دبی دبی آواز میں باہم باتیں کر رہی تھیں اور بتی بند ہونے کی منتظر تھیں۔ صرف این ہی واحد لڑکی تھی جو باآوازِ بلند ترش و تند لہجے میں رو پیٹ رہی تھی۔ اُس کی عادت سے مجھے اتنی چڑ ہوئی کہ مَیں نے فیصلہ کر لیا خواہ مجھے باقی ساری عمر کسی اسپتال ہی میں کیوں نہ گزارنی پڑے، مَیں ہمیشہ خوش اخلاق اور نرم گفتار رہوں گی اور این کی طرح خود کو تماشہ نہیں بناؤں گی۔ مَیں نے اُس کا یہ انداز سخت ناپسند کیا تھا۔

اُس کے ساتھ ایک نفسیاتی مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ شروع ہی سے ذرا بد دماغ قسم کی لڑکی تھی؛ چنانچہ پہلے بھی اُس کا کوئی دوست نہیں تھا اور یہاں بھی اُس کی تلخ کلامی کے سبب لوگ اُسے ناپسند کرتے اور اُس سے کتراتے تھے۔ کوئی بھی اُس کو سمجھنے یا اُس سے دوستی کرنے کا خیال دل میں نہیں لاتا تھا۔

لیکن مجھے تو دوستوں اور بہی خواہوں کی شدید ضرورت تھی، ورنہ مَیں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتی؛ لہٰذا مَیں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ہر کس و ناکس سے مُسکرا کر بات کروں گی اور اپنا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھوں گی۔ امّی، ابّو اور دوسرے لوگ ملنے آئیں گے تو اُن سے نہایت خوش دلی سے پیش آؤں گی۔ اپنا دُکھ درد اور اپنی تلخیاں سب کچھ دل میں چھپا کر رکھوں گی اور زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ لاؤں گی، ورنہ مَیں اپنے بزرگوں اور سہیلیوں سے محروم ہو جاؤں گی۔

میری بہن جے اکثر و بیشتر ملاقات کرنے آتی رہی۔ وہ میری ہم جماعت لڑکیوں کو بھی مجھ سے ملنے کے لیے تیار کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور میری ہم جماعت لڑکیاں اکثر عجیب و غریب فینسی ڈریس پہن کر آتیں اور میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔

میرے شب و روز بے مزہ اور یکسانیت سے عبارت تھے جن سے مَیں اُکتا جاتی۔ صرف ملاقاتیوں کی آمد اس بے کیف زندگی میں کچھ رنگ بھرتی۔ طویل مُدت سے بستر پر محصور رہنے سے میرے جسم کی ہڈیاں تک دُکھنے لگی تھیں اور جسم طرح طرح کے دانوں سے بھر گیا تھا۔ میری معمول کی مصروفیات بے حد محدود تھیں۔ صبح ایک نرس آ کر مجھے ناشتہ کراتی اور بول و براز سے بھری ہوئی تھیلیاں اُتار کر اُن کی جگہ نئی تھیلیاں چڑھا دیتی۔ پھر وہ میرے سر پر لگا آئینہ چیک کرتی کہ اس کا رُخ کمرے میں رکھے ٹی وی کی جانب دُرست ہے یا نہیں تاکہ مَیں طرح طرح کے پروگراموں سے جی بہلا سکوں۔ شروع میں تو ایک عرصہ بعد ٹی وی دیکھنا مجھے بے حد دلچسپ لگا مگر اب مَیں اس سے بھی اُکتا سی گئی تھی۔

دوپہر کو مجھے پھر خوراک دی جاتی اور "خالی" کیا جاتا۔ اسی طرح رات کے کھانے کے بعد تھیلی تبدیل کی جاتی۔ اور یوں دن ختم ہو جاتا۔ کچھ یہی حساب ٹی وی پروگراموں کا تھا۔ ناشتے کے بعد کھیلوں کے پروگرام دکھائے جاتے۔ دوپہر کے بعد رقص و موسیقی اور رات بجلی بند ہونے تک ٹی وی کی باقاعدہ نشریات دکھائی جاتیں۔ ان تمام باتوں میں اس قدر یکسانیت اور بے رنگی پیدا ہو گئی تھی کہ دل اُچاٹ رہنے لگا۔ زندگی کا چرخہ کچھ یوں چلتا تھا۔ صبح اُٹھو، ناشتہ کرو، ٹی وی دیکھو، دوپہر کا کھانا کھاؤ، ٹی وی دیکھو۔ رات کا کھانا کھاؤ، ٹی وی دیکھو اور پھر سو جاؤ۔ آخر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔

مجھے کھانا تیز رفتاری سے کھانے کی عادت ڈالنا پڑی، کیونکہ یہاں کا اسٹاف بڑا مصروف رہتا تھا۔ اُن کے پاس انفرادی توجہ کے لیے مناسب وقت نہ تھا۔ خصوصاً آہستہ آہستہ کھانے والوں سے تو یہاں کے اسٹاف کو خدا واسطے کا بَیر تھا۔ بعض اوقات تو وہ مُنہ میں چند نوالے ٹھونس کر ہی ٹرے کھینچ لے جاتے۔ یوں تیز رفتاری سے کھانے والے ہی پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔

پھر یہاں کا اسٹاف اتنا مصروف تھا کہ وہ ہماری جسمانی ضرورتوں کا بھی مناسب خیال نہ رکھتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر کبھی میرے چہرے پر کوئی مکھی بیٹھ جاتی، یا کہیں خارش محسوس

ہوتی تو کسی ملاقاتی کا انتظار کرنا پڑتا یا اسٹاف کے کسی من موجی کی آمد کا۔

میرے بال خاصے بڑھ چکے تھے اور میلے چکٹ اور حد سے زیادہ غلیظ ہو رہے تھے۔ میرا سر خشکی سے بھرا رہتا اور ہر وقت اُس میں خارش ہوتی رہتی۔

ایک دن میری بہن جے مجھے ملنے آئی تو وہ ناک سکیڑ کر بولی: "اُف توبہ! یہ اتنی غلیظ بدبُو کہاں سے آ رہی ہے؟"

"کونسی بدبُو؟" مَیں نے حیران ہوتے ہُوئے لمبی سانسیں کھینچ کھینچ کر سُونگھنے کی کوشش کی لیکن میرے نتھنوں میں کوئی بدبُو نہ آ سکی۔

"اوہ ___ یہ تو تمہارے بالوں سے آ رہی ہے۔" وہ جھرجھری لے کر بولی: "تمہارے بال کب سے نہیں دھوئے گئے؟"

"میرا خیال ہے جب سے میرا سر مونڈا گیا ہے۔" مَیں نے سوچتے ہُوئے کہا۔ "اسٹاف کو ایسے کاموں کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"کتنی افسوس ناک بات ہے! تمہارے سر سے تو سڑاند اُٹھ رہی ہے۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" اُس نے دوڑ دھوپ کر کے واش بیسن اور صابن کا بندوبست کیا، اور میرے بال دھونے کا ایک طریقہ ایجاد کر ڈالا۔ بال دُھلنے کے بعد میرا سر بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا۔ "آہ! کتنی فرحت محسوس ہو رہی ہے۔" مَیں خوشی سے چلّائی۔ "میرا دماغ بھی تر و تازہ ہو گیا ہے۔"

"میرے بال بھی دھو دو۔" ڈینیسی نے چلّا کر کہا۔ "پلیز جے! اب میری باری ہے۔"

"اور پھر میری۔" بی جے اور بیٹی گلمور دونوں بیک وقت چلّائیں اور ہم سب ہنس پڑے۔

الغرض ہم پانچوں کے بال دھونے اور بُرش کرنے کا فریضہ جے نے سنبھال لیا۔ ہر ہفتے وہ بڑی محبت اور مہارت سے ہم سب کے بال دھوتی، خشک کرتی اور اُن میں بُرش کرتی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد "قواعد و ضوابط" نے فلورنس نائٹ اینگیل کی اس بے لوث خدمت پر پابندی عائد کر دی۔

اب جبکہ میرے بال خاصے بڑھ چکے تھے اور باقاعدگی سے دُھلتے اور بُرش ہوتے تھے، مجھے خود کو سنوارنے کا شوق چرایا۔ تیز دوائیوں کے مضر اثرات بڑی حد تک زائل ہو چکے تھے اور مَیں پہلے کی طرح محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی نہیں رہی تھی۔ میرے جسم پر قدرے گوشت چڑھ آیا تھا؛ تاہم اس وقت بھی مَیں خاصی دُبلی تھی اور میرا وزن معمول سے چالیس پونڈ کم تھا۔ میری ہڈیاں بدستور کھال سے جھانکتی تھیں اور ان میں درد ہوتا رہتا تھا۔

اسکول کی ایک اور سہیلی ڈیانا کو علم ہُوا تو وہ باقاعدگی سے میری عیادت کو آنے لگی۔ وہ بے حد حساس لیکن محبت کرنے والی لڑکی تھی اور اُسے مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ خوش باش اور ہشاش بشاش نظر آتی۔ اُس نے میرا حوصلہ بڑھانے میں گہرا کردار ادا کیا۔ وہ مجھے پیغمبروں کے حالاتِ زندگی سُناتی جنہیں خُدا نے بڑے کڑے امتحانوں میں ڈالا اور جن سے وہ سُرخرو ہو کر نکلے۔ ڈیانا یہ بات میرے ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ خُدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے اور وہ اپنی مخلوق میں انسانوں سے بیش از بیش محبت کرتا ہے۔ اُس نے مجھے یقین دلا دیا کہ خُدا جلد ہی صحت دے گا اور وہ دن دُور نہیں جب معمول کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاؤں گی۔ میرا خدا پر ایمان مستحکم اور غیر متزلزل ہو چکا تھا۔ اور مَیں وہ مناجات پڑھتی رہتی جو ڈیانا نے مجھے سکھائی تھی۔ وہ مجھے مذہبی کتب بھی پڑھ کر سُنایا کرتی۔ مَیں اُس کی محبت کبھی فراموش نہ کر سکوں گی۔

وہ میری زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا جب اتنی تکلیف دہ زندگی بسر کرنے کے بعد خُدا نے مجھے ایک سچّی اور بیش بہا خوشی نصیب کی۔ ایک روز مُسکراتے ہُوئے امّی نے میرے

کان میں سرگوشی کی: "ڈک نے تمہارے ابّو سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

مَیں خوشی سے جھوم اُٹھی اور شرم سے میرا چہرہ لال گلال ہوگیا۔ امّی نے مُسکراتے ہُوئے کہا: "وہ تمہیں ہر حالت میں قبول کرنے پر بضد ہے۔"

خدائے بزرگ و برتر نے میری دعائیں سُن لی تھیں اور مجھ پر اپنی عنایات کی بارش شروع کر دی تھی۔ مَیں خود کو انوکھی، ان جانی فضاؤں میں تیرتے ہُوئے محسوس کرتی۔ مجھے دُنیا کی تمام خوشیاں نصیب ہو چکی تھیں۔ اے خُدا! مَیں تیرا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اس کے چند ماہ بعد میرا علاج شروع کیا گیا۔ یہ پی ٹی یعنی فزیکل تھراپی کہلاتا تھا۔ روزانہ بیس منٹ تک ڈاکٹر مختلف مشینوں کے ذریعے میرے بے جان بازوؤں کو حرکت میں لاتے تاکہ رگیں، پٹھے اور اعصاب دوبارہ کام شروع کریں۔ یہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ روزانہ کی بوریت سے نجات ملی تھی اور زندگی میں کچھ تنوع پیدا ہو چلا تھا۔ مَیں اس ورزش میں خوب خوب دلچسپی لیتی اور بعد میں بھی اپنے بازوؤں کو حرکت میں لانے کی کوشش کرتی۔ رفتہ رفتہ میری حالت اتنی بہتر ہوگئی کہ اسٹرائیکر فریم سے نجات مل گئی اور مجھے عام بستر پر لٹا دیا گیا۔

اس تمام عرصے میں ڈیانا بڑی باقاعدگی سے آتی رہی۔ وہ اپنی مسحور کُن باتوں سے میرا حوصلہ بڑھاتی اور مجھ میں قوّتِ ارادی اُجاگر کرتی رہی۔ امّی، ابّو اور بہنیں میری سنبھلتی ہُوئی کیفیت پر بے حد خوش تھے۔ ڈک بھی کبھی کبھار امّی، ابّو کے ساتھ آتا لیکن شرمایا شرمایا سا، بستر کے کنارے کھڑا رہتا۔ ہمیں ایک دوسرے کو چوری چوری کن اکھیوں سے دیکھنا بہت بھلا لگتا۔

رفتہ رفتہ میری اُنگلیوں میں احساس کی ذرا ذرا رمق پیدا ہونی شروع ہُوئی اور مَیں بازوؤں میں سنسناہٹ بھی محسوس کرنے لگی۔ سب لوگ میری ہمت بڑھاتے رہے اور مَیں خدا سے دُعائیں کرتی رہی۔ اِدھر ڈاکٹر بھی علاج سے مطمئن [illegible] اور نتائج سے پُرامید۔

بالآخر تین برس کی فزیکل تھراپی کے بعد میرے [illegible] بازو اور تمام اُنگلیاں پُوری طرح کام کرنے لگیں؛ تمام [illegible] ہمیشہ کے لیے بے کار ہو چکی تھیں۔ تین برسوں پر [illegible] طویل انتظار کے بعد وہ دن آیا جس کا خواب مجھے ڈاکٹر [illegible] نے دکھایا تھا۔ مَیں دوستوں اور رشتے داروں کے [illegible] میں اپنے ہاتھوں سے وہیل چیئر چلاتی ہسپتال سے باہر آئی۔ اُف خُدایا! آسمان کس قدر نیلا اور شفاف تھا اور سورج [illegible] تھا! درخت اور گھاس کتنے ہرے بھرے تھے اور [illegible] پھول کیسی بہار دکھا رہے تھے! زندگی واقعی خدا کی [illegible] ہر چیز سے زیادہ قیمتی اور انمول ہے۔ زندگی بے حد حسین چیز ہے۔

میری صحت یابی کی خوشی میں ابّو نے ایک بڑی [illegible] ضیافت کا اہتمام کیا جس میں تمام دوستوں، سہیلیوں اور عزیزوں کے علاوہ ہسپتال کے ڈاکٹر شیرل نے بھی شرکت کی۔ اسی موقع پر میری اور ڈک کی منگنی کا اعلان کیا گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنائیں۔

اور چند ماہ بعد ہم دونوں اٹوٹ ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔

مَیں کس زبان سے خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کروں [illegible] مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی مَیں صرف تمنا ہی کر سکتی تھی؛ موت [illegible] اور پھر زندگی کی یہ حسین خوشیاں خُدا کا بے پایاں کرشمہ [illegible] اب مَیں نے مصوّری سیکھ لی ہے اور اپنے [illegible] بڑی مشہور مصوّرہ ہُوں۔ ہماری ازدواجی زندگی مثالی [illegible] اور مَیں ایک گول مٹول سے بچّے کی ماں ہُوں۔

میری آپ سے بس ایک ہی درخواست ہے۔ اگر آپ پر کوئی مُصیبت ٹوٹ پڑے تو خلوصِ دل سے خدا کو یاد کرتے رہیے۔ وہ آپ کی مشکل ٹال دے گا اور آپ کو کامیابی [illegible] عطا کرے گا۔ خدا بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ ■■

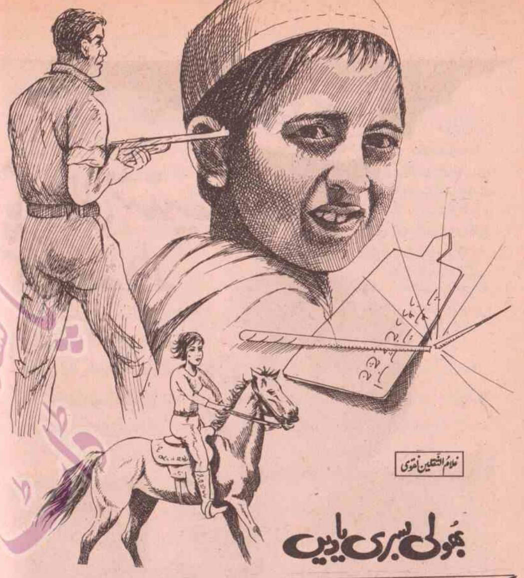

غلام الثقلین نقوی

بھولی بسری یادیں

گورے فوجیوں اور فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس منڈلانے والے پُرمزاح اور پُراسرار واقعات۔

میرا گاؤں دوسرے دیہات سے کچھ اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ اسے چھاؤنی کا قُرب حاصل ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جہاں ملک کی آبادی میں روز افزوں ترقی ہُوئی ہے، وہاں اب چھاؤنی بھی خاصی گنجان آباد ہو گئی ہے۔ جہاں کبھی کُھلی پریڈ گراؤنڈ تھیں، وہاں اب کوٹھیاں اور فلیٹ نظر آتے ہیں۔ پُرانے بنگلے ڈھا دیے گئے ہیں اور اُن کی جگہ نئی طرز کی کوٹھیاں اُبھر آئی ہیں۔ پُرانے بنگلے دو دو چار چار ایکڑ زمین پر آباد تھے، اس لیے اُن کی فضا میں کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔ اب کشادگی کا یہ احساس مفقود ہو کر رہ گیا ہے؛ تاہم چھاؤنی کی آبادی ہمارے گاؤں کی طرف اُس سڑک سے آگے نہیں بڑھی جہاں آخری بنگلے تھے۔ ان بنگلوں میں جے سی او رہتے ہیں۔ میرے بچپن میں یہ بنگلے نان کمیشنڈ انگریز افسروں کے لیے مخصوص تھے۔ پہلا بنگلہ ہمارے گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ چھاؤنی کی سرحد کم و بیش دو فرلانگ دُور نالہ پلکھو کے دوسرے کنارے پر ہے۔ انگریز کے زمانے میں چھاؤنی کے اندر چند مخصوص علاقوں میں سول آبادی تھی یعنی صدر بازار، رجمنٹ بازار، توپ خانہ بازار اور لال کُرتی بازار میں۔ اب چھاؤنی میں سول آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔

چھاؤنی کا قُرب ہمارے گاؤں کے لیے فائدے کا باعث بھی تھا اور نقصان کا بھی۔ مَیں انگریز کے زمانے کی بات کر رہا ہُوں۔ ہمارے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو چھاؤنی میں آسانی سے روزگار مل جاتا تھا۔ نقصان اس بات کا تھا کہ گورے فوجیوں کی وجہ سے گاؤں کے لوگ مسلسل خوف میں مبتلا رہتے تھے۔ اگرچہ چھاؤنی کے دیہات ٹامیوں کے لیے آؤٹ آف باؤنڈ تھے؛ تاہم نالہ پلکھو کے دوسرے کنارے پر انگریز ٹامیوں کو ٹہلنے اور سیر کرنے کی اجازت تھی۔ پلکھو کے اس کنارے پر گاؤں کے کھیت تھے۔ اُن میں کسان عورتیں کام کرتی تھیں؛ مثلاً نلائی، کٹائی وغیرہ۔ گورے، پلکھو کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر انہیں فحش اشارے کرتے رہتے۔ گورا فوج کے پرائیویٹ سپاہیوں کو ہندوستان میں اپنی بیویاں ساتھ لانے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے اُن کی جنسی بُھوک کسی بُھوکے بھیڑیے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی تھی؛ چنانچہ گاؤں کی عورتیں پلکھو کے کنارے، کھیتوں میں، کسی مرد کی موجودگی کے بغیر کام نہیں کرتی تھیں۔ انگریز افسروں کی نسبت ان ٹامیوں سے کہیں زیادہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ چھاؤنی میں اسکول آتے جاتے اگر کوئی اکیلا دُکیلا ٹامی نظر آ جاتا تو ہم کنّی کترا جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں میں عین دوپہر کے وقت پلکھو کے کنارے غلیل والے ٹامی سے اکثر ہماری ملاقات ہوتی تھی جو درختوں کی گھنی شاخوں میں چُھپے پرندوں کا شکار کرتا تھا۔ وہ ایک آنکھ بھینچ کر ہم سے کہتا: ”لال بی بی۔“

ہم سب مل کر کہتے: ”نو صاحب نو۔“

وہ پتلون کی جیب سے چاندی کے روپے نکال کر ہمیں دکھاتا: ”بخشیش!“

ہمیں معلوم تھا کہ ’لال بی بی‘ سے کیا مراد ہے اور بخشیش کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایسی کئی کہانیاں مشہور تھیں کہ گورے ’لال بی بی‘ کی تلاش میں گاؤں تک آ پہنچے اور گاؤں کے من چلے جوانوں نے اُن کی خوب پٹائی کی۔

’لال بی بی‘ کی اس طلب نے چھاؤنی کے نزدیکی دیہات میں کئی ’لال بیبیاں‘ بھی پیدا کر دی تھیں۔ وہ چُھپ چُھپا کر کاروبار کرتی تھیں۔ ہمارے گاؤں میں صرف ایک عورت اس کاروبار کے لیے بدنام تھی۔ اُس کی دو لڑکیاں تھیں جو نہایت خوش شکل تھیں۔ جب مَیں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا، گاؤں والوں نے انہیں گاؤں سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد مَیں نے اُن ماں بیٹیوں کی صُورت نہیں دیکھی۔ ایک نزدیکی گاؤں کی عورتیں اس کاروبار میں بہت بدنام تھیں۔ میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک لمبی تڑنگی عورت کو گاؤں کی ایک گلی میں بے تحاشا بھاگتے ہُوئے دیکھ کر مَیں حیران رہ گیا تھا۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اُن کی باتوں سے پتہ چلا کہ فوجی اس عورت کے پیچھے لگے ہُوئے ہیں۔ یہ ملٹری پولیس کے آدمی ہوں گے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہُوا کہ اُس کے گاؤں والوں نے اُس کی چُٹیا کاٹ کر اُس کے مُنہ پر کالک مل تھی اور اُسے گاؤں کی گلیوں میں رُسوا اور ذلیل کیا تھا۔

اسی گاؤں کی ایک اور عورت کا قصّہ مشہُور تھا کہ اُس نے چھاؤنی کے ایک انگریز انجینئر سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت کے بطن سے جو لڑکیاں پیدا ہوئیں، جوانی میں اُن کے حُسن و جمال کی دُھوم مچ گئی تھی۔ دو انگریز افسر ایک ہی لڑکی پر فریفتہ ہو کر ڈوئل لڑے جن میں سے ایک مر گیا جہاں اُن لڑکیوں کو خواتین نے اغوا کر لیا اور وہ حرم کی چار دیواری کے پیچھے ایسی گُم ہُوئیں کہ پھر اُن کا نام و نشاں بھی نہ ملا۔ ہمارے

خاندان کے ایک دل پھینک بزرگ بھی اپنی جوانی کے زمانے میں اُن میں سے ایک لڑکی پر فریفتہ ہُوئے لیکن وائے حسرت کہ گوہرِ مقصود پا نہ سکے، البتہ بعدازاں عرصے تک اپنے ہم چشموں کے مذاق کا نشانہ بنے رہے۔

انگریز کے زمانے میں فوجی مشقیں ہوتیں تو وہ ہمارے لیے خوف واذیت کا باعث بن جاتیں۔ اکثر اردگرد کے دیہات کو آگاہ کردیا جاتا تھا۔ گاؤں کا چوکیدار گھر گھر پہنچ کر اطلاع دیتا۔ دن کی مشقوں سے ہمیں زیادہ خوف محسوس نہ ہوتا۔ جب سُنتے کہ فوجی مشق رات کو ہوگی تو سارا گاؤں ہِل جاتا۔ جیساکہ آج بھی دستور ہے، گاؤں کے لوگ گھروں میں بیت الخلا تعمیر نہیں کرتے۔ ہر فرد صُبح سویرے رفعِ حاجت کے لیے کھیتوں میں جاتا ہے۔ عورتیں مُنہ اندھیرے اس سے فراغت حاصل کرلیتی ہیں۔ جب فوجی مشقوں کا اعلان ہوتا تو عورتوں کا گھروں سے نکلنا محال ہو جاتا۔

بچپن کے کئی دن ایسے یاد آتے ہیں کہ ہم رات کو سوکر صُبح اُٹھے تو معلوم ہُوا کسی حملہ آور فوج نے گاؤں کو اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ درختوں کے نیچے، گڑھوں میں کماد کی اوٹ میں گورے ہی گورے نظر آتے۔ کہیں پیدل کہیں گھڑ سوار۔ ایسی ہی ایک ٹھٹھری ہُوئی یخ بستہ صُبح کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آرہی ہے۔ اُس سے پہلے رات کو یہ اعلان بھی نہ ہوسکا تھا کہ آج رات فوجی مشق ہے۔ کوئی باہر نہ نکلے لیکن آدھی رات گاؤں کی گلیوں میں دبڑ دبڑ کی آواز آنے لگی تو ہماری آنکھ کھُل گئی۔ معلوم ہُوا کہ گاؤں پر نقلی حملہ ہوچکا ہے۔ جب دن چڑھے مَیں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ گاؤں واقعی پیدل اور گھڑ سوار فوج کے نرغے میں تھا۔ گندم کے پودے ابھی اتنے بلند نہیں ہُوئے تھے کہ گورے اُن میں چھُپ سکتے؛ البتہ وہ دو کھیتوں کے درمیان بینڈوں پر لیٹے ہُوئے تھے۔ بینڈوں پر گھاس تھی اور گھاس پر کُہرا جما ہُوا تھا۔ کچھ گورے سڑک کے دونوں کناروں کی نالیوں میں پوزیشن لیے ہُوئے تھے۔ یہ نالیاں بہت گندی

شاعری کی لاش

ہال کے اندر مشاعرہ ہورہا تھا کہ اچانک ایک آدمی باہر نکلا اور بولا: "ان لوگوں نے تو شاعری کا خُون کر دیا ہے"

پولیس کا ایک سپاہی یہ سُنتے ہی فوراً ہال میں جا گھسا اور اُس نے چیخ کر حکم دیا: "جلدی سے شاعری کی لاش بتادو، ورنہ سب کو جیل بھجوادُوں گا"

(مُرسلہ: راؤ ذوالفقار علی سُوترا۔ مٹھن کوٹ)

تھیں اور گاؤں کا گندا پانی اُنہی میں سے ہوکر نالے میں گرتا تھا۔

ان گوروں کی لت پت وردیاں دیکھ کر مجھے جھُرجھُری آرہی تھی۔ کماد کے کھیتوں کی اوٹ میں گھڑ سوار فوج کھڑی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُنہیں صبح کا ناشتا ملا۔ ایک مگ میں چائے اور بسکٹ جو اُنھوں نے اپنے تھیلوں سے نکالے۔ ناشتے سے پہلے ہر ٹامی زمین سے اُٹھتا اور پتلون کے بٹن کھول کر گاؤں کی طرف مُنہ کرکے پیشاب کرنے لگتا۔ اکثر اوقات تو بینڈ پر گوروں کی ایک پُوری قطار کھڑی ہو جاتی۔ وہ پیشاب بھی کرتے، چائے بھی پیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مذاق بھی کرتے۔ ہم لوگ منہ پھیر لیتے۔ لوگ کہتے کتنی بے حیا قوم ہے!

صُبح شام کئی انگریز افسر اور اُن کی میمیں گھوڑوں پر بیٹھ کر سیر کے لیے گاؤں کے پاس سے گزرتے۔ ان افسروں سے ہمیں خوف تو محسوس نہ ہوتا لیکن وہ دبدبہ ضرور محسوس ہوتا جو ایک حاکم قوم کا خاصہ ہوتا ہے۔ اُونچے طبقے کے انگریز اکثر بااخلاق تھے لیکن اُن کے بے نیازانہ رویے میں حاکمیت کی شان کے علاوہ محکوم سے نفرت کا بھی صاف

ہوتا۔ اُس زمانے میں انگریز عورتیں عام طور سے گھوڑے پر دونوں ٹانگیں ایک طرف لٹکا کر سواری کرتیں۔ نوجوان میمیں مردوں کی طرح سواری کرتیں تو ہمیں حیرت ہوتی۔

ایک پوپلے سے مُنہ والا انگریز بھی کبھی کبھار گھوڑے پر سوار ہوکر آتا تو سڑک پر کھیلنے والے بچّے اِدھر اُدھر بھاگ جاتے۔ اس بُوڑھے انگریز کو بچّوں کے پیچھے گھوڑا دوڑانے میں مزہ آتا۔ اُسے لوگ 'بیٹی صاحب' کہتے تھے۔ وہ ٹامی سے ترقی کرتے کرتے کوئی چھوٹا موٹا افسر بن کر ریٹائر ہُوا تھا کیونکہ اس کے طور طریقوں میں خاندانی افسروں والی کوئی بات نہ تھی۔ مَیں نہیں جانتا کہ بچّوں کو خوفزدہ کرنے میں اُسے کیوں مزہ آتا تھا۔ اکثر اوقات وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا گاؤں کے گرد چکّر لگاتا۔ اس طرح گاؤں میں بھگدڑ مچ جاتی۔ ایک دن دس سال کی لڑکی اُس کے گھوڑے کے آگے خوفزدہ ہوکر بھاگ اُٹھی تو وہ خوشی سے چیخنے لگا ___ لڑکی ٹھوکر کھا کر گری تو وہ گھوڑا روک کر بے تحاشا ہنستا رہا۔ لوگ لڑکی کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ اُس بے چاری کو خوف سے پھُونک کر بخار چڑھا اور بے ہوشی میں وہ چیخیں مارتی تھی۔ لوگوں نے چھاؤنی میں جاکر اس گورے کی شکایت کی۔ چوتھے روز 'بیٹی صاحب' گاؤں آیا، اُس لڑکی کے گھر پہنچا اور اس کے ماں باپ کو علاج کے لیے پانچ روپے دیے۔ اس کے بعد ہم نے 'بیٹی صاحب' کو گاؤں کی سڑک پر آتے کبھی نہ دیکھا۔

اسکول آتے جاتے گھڑ سوار ٹامیوں سے سامنا ہوتا تو ہم سڑک کے کنارے سے بھی دُور ہٹ کر چلتے۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی ٹامی اپنا گھوڑا ہمارے اتنا قریب سے گزارتا کہ جان لبوں پر آجاتی اور ڈر لگتا کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی سُموں تلے کچلا جائے گا۔ اس شرارت کے پیچھے نہ جانے کونسا جذبہ کارفرما ہوتا۔ یہ حاکمیت کا اظہار تھا یا اذیت رسانی کی لذت تھی جو جنس زدہ آدمی کا خاصہ ہوتی ہے۔

ایک بار ایسا ہُوا کہ ہم میں سے کسی کی حرکت سے ایک گھوڑا بدک گیا۔ یہ گھوڑا سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس کے پیچھے چار چار کی قطاروں میں گھڑ سوار دستہ چلا آرہا تھا۔ اس گھوڑے کے سوار نے، جو اُس دستے کا سارجنٹ تھا، یہ سمجھا کہ ہم نے جان بُوجھ کر شرارت کی ہے؛ چنانچہ اُس نے دستے کو کھڑا کردیا اور خود گھوڑا دوڑاتے ہُوئے ہماری طرف لپکا۔ ہم اُس کے آگے آگے بھاگنے لگے لیکن وہ ہمیں بھاگنے بھی نہ دیتا۔ گھیر گھار کر وہیں لے آتا جہاں سے ہم چلے تھے۔

آخر بھاگتے بھاگتے تھک گئے تو ہم نے بستے پھینک دیے اور سڑک کے کنارے ایک بڑے سے گڑھے میں کُود گئے۔ اس گڑھے میں ببول کا ایک کُبڑا درخت تھا جس کی شاخیں ظالم کانٹوں سے بھری ہُوئی تھیں۔ وہ گڑھے کے گرد گھوڑے کو چک پھیریاں دیتے دیتے اپنا حلقہ تنگ کرتا چلا جارہا تھا اور ہم ببول کے کُبڑے درخت کے تنے سے پٹتے چلے جارہے تھے۔ اُس ظالم نے جی بھر کر ہمیں اپنی غلامی کا احساس دلایا اور جب اُس نے ہمارے جان چھوڑی تو ہم دیر تک کانٹوں سے اپنے کپڑے چھُڑاتے رہے۔ ہمارے ہاتھوں اور مونہوں پر خراشیں تھیں ہتھیلیوں میں کئی کانٹے ٹوٹ گئے تھے۔ ہم نے بستے اُٹھائے اور اسکول کی طرف چل دیے۔ اُس دن ہم مارننگ اسمبلی میں شریک نہ ہوسکنے کی بنا پر دیر سے آنے والے لڑکوں کی صف میں کھڑے ہوگئے۔

اسکاچ مشن مڈل اسکول سیالکوٹ چھاؤنی کے ہر دلعزیز ہیڈ ماسٹر سنت رام ڈھینگرا کا دستور تھا کہ وہ دیر سے آنے والوں کو خود سزا دیتے۔ ہماری باری آئی تو ہم نے اُنھیں اپنے ساتھ بیتا ہُوا پُورا واقعہ سُنایا اور چہرے کی خراشوں اور ہتھیلیوں میں چبھے ہُوئے کانٹے ثبوت کے طور پر پیش کیے لیکن اس پر بھی بید کی ضربوں سے نہ بچ سکے۔ وہ ہر ضرب پر کہتے: "جنگلیو! تم نے ضرور شرارت کی ہوگی، ورنہ انگریز افسر ایسی حرکت نہیں کرتے۔ انگریز

"بڑی شریف قوم ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ یہ واقعہ سرما کی نہایت سرد، ٹھٹھری ہُوئی اور کُہر آلود صبح رُونما ہُوا تھا اور اُنگلیاں مدت تک پنسل یا قلم کا لمس محسوس نہ کر سکی تھیں۔ اسکول میں کون ہے جس نے مار نہ کھائی ہو؟ مَیں نے بہت کم مار کھائی ہے لیکن یہ مار یاد آتے ہی اس کی اذیت اب بھی ہتھیلیوں پر غلامی کی تحریر بن کر اُبھر آتی ہے۔

یُوں ہم شرارتیں بھی کرتے تھے۔ مکتب کے لونڈوں سے تو شیطان نے بھی پناہ مانگی ہے۔ جب دو چار بچے اکٹھے ہو جائیں تو اُن کی سرشت ہی بدل جاتی ہے۔ مَیں ایک شریف اور سیدھا سادا سا لڑکا تھا اور میری فطرت شرارت سے کوسوں دُور تھی، تاہم اجتماعی شرارت کے موقع پر میری سرشت بھی بدل جاتی تھی۔ ایک بنگلے میں ایک نہایت کالی سی عورت ہمیں ہر صبح لان میں بیٹھی نظر آتی۔ ہم سوچتے کہ یہ عورت کون ہے اور اس بنگلے میں اس کا کیا کام۔ کسی نے کہا کہ یہ بچوں کی آیا ہو گی لیکن اُس بنگلے میں ہمیں کوئی بچہ نظر نہ آیا۔ یوں بھی سارجنٹ لوگوں کے بنگلوں میں کبھی کوئی آیا دکھائی نہ دی تھی۔ ایک دن اُسے سڑک سے ذرا قریب لان میں ٹہلتے پایا تو جھٹ سے سب نے مل کر کہا: "میم صاحب سلام!" وہ ہمارے سلام پر خوش ہُوئی تو ہم چڑ سے گئے۔ "چوہڑی کہیں کی۔ میم بن کر سلام کرواتی ہے۔" ہم میں سے کسی نے کہا۔ اور دوسرا بولا: "کالی چڑی۔ کالی چڑی۔" پھر تو ہمارا دستور بن گیا کہ اُس بنگلے کے پاس سے گزرتے ہُوئے اُسے کالی چڑی، کالی چڑی کہہ کر چڑاتے اور وہ ہمیں دیکھتے ہی بنگلے کے اندر چھپ جاتی۔

ایک دن ہم کالی چڑی، کالی چڑی کے نعرے لگاتے بنگلے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ایک ہاتھی کا ہاتھی گورا اچانک شیشم کے ایک بڑے درخت کی اوٹ سے نکل کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک نالی والی شاٹ گن تھی اور ہم میں سے سب سے زیادہ لمبے تڑنگے لڑکے کا اُس نے نشانہ لے رکھا تھا۔ یہ لڑکا ہمارا لیڈر تھا۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ گورے کا بل ڈاگ کا سا چہرہ ہمیں بہت خوفناک لگا۔ اُس کی آنکھیں لال بھبوکا تھیں۔ اُس نے جو انگریزی ملی اُردو بولی، اُس کا ایک لفظ بھی ہمارے پلّے نہ پڑا لیکن تھی بڑی خوفناک زبان کہ دل دہل دہل جاتے تھے۔

ہمارے لیڈر نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "صاحب! معاف... پارڈن۔" اُس نے بندوق کی نالی نیچی کر لی اور کہا: "ڈیم آدمی! تم میم صاحب کو چھیڑتا ہے۔ کالی چڑی کہتا ہے۔"

"صاحب! اب نہیں چھیڑے گا۔" لیڈر بولا۔

"ویل! کالی چڑی کیا ہوتا ہے؟" گورے نے پوچھا۔

مَیں بے ساختہ بول اٹھا: "بلیک سپیرو۔"

میرے اس ترجمے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ تو جنگلیوں کو فہمائش کر رہا تھا اور سارے ڈرامے کا تاثر اچانک بگڑ گیا ہے تو اس نے آنکھوں میں لہو بھر کر کہا: "جاؤ! اب اِدھر سے گزرا تو اَم گولی مار دے گا۔ ہم میم صاحب کو بلیک سپیرو دکھنا نہیں مانگتا۔"

ہم انگریز کو بچپن سے دیکھنے کے عادی تھے لیکن اس قوم سے کبھی مانوس نہ ہو سکے۔ انگریز بچے بھی ہمیں کسی اَور سیارے کی مخلوق نظر آتے۔ انگریز کا رویہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ اُس سے وہ یگانگت بھی پیدا نہ ہو سکی جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہوتی ہے ـــــ اس رویے کو کپلنگ کے ناولوں اور افسانوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا ہے، گاؤں سے چھاؤنی کے اسکول جاتے ہُوئے راستے میں جو پہلے بنگلے پڑتے تھے اُن میں سارجنٹ رہتے تھے۔ ان بنگلوں میں ہمیں کبھی کوئی نوکر نظر نہ آیا۔ میم صاحب گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ کھانا پکاتی تھیں، برتن اور کپڑے دھوتی تھیں۔ صحن میں تنی ہُوئی رسیوں پر کئی بار میم صاحب کو سکھاتے

کپڑے ڈالتے ہُوئے دیکھا۔ ہم کہتے کہ یہ میم کتنی غریب ہے، اپنے کپڑے خود دھوتی ہے بلکہ ہمیں اُس پر رحم بھی آتا۔ یہی میم جب ہمیں سڑک پر ملتی تو اُس کا انداز ہی بدلا ہوتا۔ مثلاً ایک میم دو بچّوں کو انگلی لگائے ہُوئے ہمارے آگے آگے چل رہی ہیں۔ ہمیں چونکہ اسکول پہنچنے کی بہت جلدی ہے، ہم پانچ سات لڑکے ذرا تیزی سے اُن کے پاس سے گزرتے ہیں تو ایک بچّہ چونک جاتا ہے اور ڈری ہوئی آواز میں کہتا ہے: "ماما! جنگلی!" ماما ہماری طرف غصّے سے دیکھتی ہیں تو ہم سب مل کر بول اُٹھتے ہیں: "میم صاحب، سلام!" اس پر میم صاحب خوش ہو جاتی ہیں اور ہمارے سلام کا جواب بڑے شاہانہ انداز میں سر ہلا کر دیتی ہیں اور پھر بچّے کی طرف متوجّہ ہو کر نہایت دھیمی آواز میں اُس سے کچھ کلام کرتی ہیں۔ یہی کہا ہو گا: "دیکھو! یہ جنگلی ضرور ہیں لیکن ہمارے محکوم ہیں۔ ان سے ڈرنا حاکم قوم کو زیب نہیں دیتا۔"

اب پتہ نہیں، یہ وہی بچّہ تھا یا کوئی اور کہ اگلے دن وہ ہمارے انتظار میں سڑک کے بیچ میں کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی نوکدار چھڑی تھی۔ ہمارے آگے آگے اسلم بیگ تھا۔ اُس کے پیٹ میں نوک چبھو کر اُس نے کہا: "جنگلی مین! سٹاپ۔" اسلم بیگ انگریز کے معاملے میں ہماری نسبت بہت کم مرعوب ہُوا کرتا تھا کہ اُس کے ابّا ایک گورا رجمنٹ کی بیرک میں سٹال لگاتے تھے اور اکثر گورے اُن کے مقروض رہا کرتے تھے۔ اُس نے کہا: "بابا لوگ! آگے سے ہٹ جاؤ۔ دیکھو ہمیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔" بابا لوگ نے چھڑی کی نوک دبائی تو اسلم بیگ کے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی؛ تاہم وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اس پر بابا لوگ کو شہ جو ملی تو وہ چھڑی لہراتے ہُوئے باقاعدہ تلوار بازی کے پینترے دکھانے لگا۔ کبھی ایک پر حملہ آور ہوتا کبھی دوسرے پر۔ ہم چاہتے تو بھاگ جاتے لیکن ہمارا ابھی بچپن تھا۔ ہم نے اسے ایک کھیل سمجھا یا پیٹھ دکھانے میں ہتک محسوس کی اور اُس کی چھڑی کے وار باقاعدہ تختیوں پر روکنے لگے حتّٰی کہ کسی بچّے کی تختی پر لگ کر چھڑی ٹوٹ گئی تو بابا لوگ خوفزدہ ہو کر اپنے بنگلے کی طرف بھاگنے لگا۔ "ماما جنگلی! ماما جنگلی" کی ڈری سہمی چیخ دیر تک ہم سنتے رہے ــــ چونکہ ہم بے قصور تھے، اس لیے اگلی صبح بغیر کسی خوف خدشے کے حسبِ معمول اُس سڑک پر پہنچے تو دیکھا کہ اردگرد کے بنگلوں کے سارے بچّے ہمارے انتظار میں سڑک پر صف باندھ کر کھڑے ہیں اور سب کے ہاتھ میں نوکدار چھڑیاں ہیں۔ یہ ایک جیسی چھڑیاں یقیناً اُنہیں کسی کارپینٹر سارجنٹ نے بنا کر دی تھیں۔ اس دستے کی کمان جو بچّہ کر رہا تھا، وہ دس بارہ سال کی عمر کا تھا اور خاصے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ہم ابھی ان انگریز بچّوں کی صف آرائی کا مقصد بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ کمانڈر نے حملے کا حکم دے دیا۔ اس اچانک حملے پر ہم بوکھلا گئے۔ بہرحال ہم نے تختیوں اور بستوں سے اپنا دفاع کیا۔ ہم چاہتے تو اُن انگریز لڑکوں سے چھڑیاں چھین کر اُن کی پٹائی کر دیتے لیکن وہی حاکم و محکوم کا سوال آڑے آیا۔ ہم نے پسپائی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ہم نے دیکھا تو نہیں لیکن ہمیں یقین تھا کہ ان بچّوں کے پاپا اور ماما کھڑکیوں کی جالیوں کے پیچھے چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور ہماری پسپائی پر خوش بھی ہو رہے ہوں گے۔ ہم اُنہیں اس خوشی سے محروم کیوں کرتے، بچپن کے اُس دور میں تو ہم نے اس واقعے کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اب سوچتا ہُوں تو اس نتیجے پر بڑی آسانی سے پہنچ جاتا ہُوں کہ یہ صرف بچّوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز والدین اُس بچّے کا مورال بحال کر رہے تھے جو ہم "جنگلیوں" سے ڈر کر بھاگ اُٹھا تھا۔ ان حملہ آور بچّوں میں وہ بھی شریک تھا۔

اس سڑک پر آگے جا کر افسروں کے بنگلے آتے تھے ان بنگلوں میں نوکروں کی بھرمار تھی۔ اصطبلوں میں گھوڑے بندھے ہوتے اور صاحب اور میم اکثر گھوڑوں کی پیٹھ پر

سیر سے واپس آتے ہُوئے ملتے۔ ہم انہیں سلام کرتے اور وقت ضرور پُوچھتے۔ ایک انگریز افسر کا معمول بن گیا تھا کہ وہ ہمارے انتظار میں سڑک پر گھوڑا کھڑا رکھتا۔ جب ہم اُس کے قریب پہنچتے تو وہ کہتا: "بھاگو! بھاگو! دیر ہو رہا ہے۔ پندرہ منٹ باقی ہیں۔" ہم کہتے ــــ "یہ کتنا اچھا انگریز ہے!" اسی سڑک پر کبھی کبھار ایک شوخ و شنگ انگریز لڑکی سائیکل پر سوار ہو کر نکلتی اور ہمارا پیچھا کرنے لگ جاتی۔ اب بتایے کہ سائیکل سوار لڑکی سے ڈرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؛ تاہم ہم اُس کے آگے آگے بھاگتے اور وہ ہماری بے بسی پر قہقہے لگاتی۔ ایک دن پہیّا میری ایڑی پر چڑھ ہی آیا تھا کہ اتفاق سے میں ایک طرف کو ہو گیا ورنہ شاید موچ آ جاتی۔ ایک بار اُس لڑکی نے ہمیں بہت تنگ کیا تو اسلم بیگ غچّا دے کر اُسے سڑک کے کنارے کی طرف لے گیا۔ یہاں نالی کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ پہیّا جو پھسلا تو لڑکی قلابازی کھا کر نالی میں جا گری۔ ہم سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اُس دن ہمیں اسکول سے دیر ہو گئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے سزا دینے سے پہلے دیر کی وجہ پُوچھی۔ ہم نے قصّہ سُنایا تو وہ بپھر کر کہنے لگے: "بزدلو! تم ایک لڑکی سے ڈر جاتے ہو؟"

اسلم بیگ نے کہا: "جناب! وہ انگریز لڑکی ہے۔"

اس پر اُنہوں نے سر جُھکا لیا اور کہا: "ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

اُس دن ہم "ڈنڈے" کی تواضع سے بچ گئے۔

ہم کئی دنوں تک ایک چور راستے سے اسکول جاتے رہے۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ لڑکی اس واقعے کو بُھول چکی ہو گی تو ہم نے پھر مین روڈ کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس سڑک سے جُدائی ہمیں بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ سڑک بھی بہت نہایت خُوبصورت تھی۔ اُس کے دونوں طرف سفیدے اور پیپڑے کے خُوبصورت درخت قطار باندھے کھڑے تھے اور اُن کے نیچے سبز گھاس کا فرش بچھا تھا۔ گرمیوں کی بھری دوپہر کو بھی ہمیں یہاں سائے کی خُنکی نصیب ہوتی اور

مسنر ڈوروتھی ایلیسن نیوجرسی کی رہنے والی ہیں۔ قدرت نے اُنہیں چند باطنی قوّتوں سے نوازا ہے۔ وہ گُمشُدہ اور مقتول افراد کے بارے میں صحیح معلُومات دے سکتی ہیں۔ موقعِ واردات کے علاوہ مجرموں کا مکان نمبر بھی بعض اوقات بتا دیتی ہیں۔ امریکہ کی ریاستی پولیس اب تک اُنہیں اعلٰی کارکردگی کے پانچ تمغے دے چکی ہے۔ وہ ایک سیاہ فام خاتون ہیں۔

سردیوں میں سڑک کے عین درمیان دُھوپ کی گرمی گرمیوں کی چُھٹیوں کے بعد جب ستمبر میں اسکول کُھلتا تو اس سڑک پر بہت جوبن ہوتا۔ سڑک کے دو رویہ کشادہ بنگلوں میں تو گھاس کا فرش بچھ جاتا۔ بنگلوں کے اندر آم اور جامن کے درخت تھے۔ اُن میں چھپی ہُوئی کوئلیں کُوکتیں اور ہم اُن کی کُوک کا جواب دیتے۔ اس پر وہ اور بھی زیادہ جوش میں آ کر گاتیں۔ کبھی کبھار یُوں ہوتا کہ پپیہے "پی کہاں، پی کہاں" کا شور مچاتے اور اچانک ایک کالی گھٹا اُمڈ آتی۔ کبھی تو ہمارے سروں پر سے گزر جاتی اور اُس کا پیچھا کرتی ہُوئی دُھوپ، ہمیں درختوں کے سایوں تلے لے آتی اور کبھی ہمارے سروں پر پہنچتے ہی تڑ تڑ برسنے لگتی۔ اُس وقت ہمیں قریب کے کسی بڑے درخت کے نیچے پناہ لینی پڑتی۔ پھر درخت ٹپکنے لگتا تو ہمیں بستے کی کتابوں اور کاپیوں کی فکر پڑ جاتی کہ کہیں بھیگ کر گارا نہ بن جائیں۔ ایسے میں ہمیں کسی بنگلے کے برآمدے میں گُھسنا پڑتا۔ صاحبوں کے نوکر ہمیں برآمدے تلے کھڑا ہونے کی اجازت بھی نہ دیتے۔ ان لمحوں کی یاد ایک میم کا سراپا بن کر اُبھر آتی ہے۔ دُور سے اُس کا چہرہ کسی جوان عورت کا چہرہ لگتا۔ قریب پہنچنے پر جُھریوں کا مہین جال تنا نظر آتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی جوان چہرے کو باریک جالی دار نقاب اوڑھا

دیا گیا ہو۔ یہ میم ہمیں نہ صرف مُسکرا کر ملتی بلکہ نوکر کو بھی روکتی کہ ہمیں کچھ نہ کہے۔ اُس نے ہمیں ایک بار ایک ایک بسکٹ بھی دیا تھا۔ اُس کی اس مہربانی پر ہمیں حیرت ہُوئی تھی اور ہم نے کہا تھا: "کتنی اچھی میم ہے!" ہم میں سے ایک اور بولا تھا: "بڑھیا پھوسٹ جو ہُوئی، اس لیے اچھی ہے۔"

ان بنگلوں میں جو نوکر تھے، وہ اکثر پُوربیے ہُوا کرتے تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد انگریز کے ساتھ اُس وقت آئے تھے جب یہ چھاؤنی قائم ہُوئی تھی۔ اب اُن کی اُردو (پُوربی) میں پنجابی الفاظ بھی داخل ہو چکے تھے۔ ہم جو اُردو اسکول میں پڑھتے تھے، اُس سے قطعی مختلف اُردو، ہمیں بہت مضحکہ خیز محسوس ہوتی تھی۔ انگریز کے ساتھ وفاداری ان نوکروں کی گھُٹی میں پڑی ہُوئی تھی۔ صاحب کی عدم موجودگی میں وہ اپنے آپ کو صاحب کی ہر چیز کا وارث جانتے تھے۔ اگر بنگلے کے اندر لگے جامن، آم یا بیری کے درخت کا کوئی پھل باہر سڑک پر گرا ہوتا تو اُسے بھی اُٹھانے نہیں دیتے تھے۔

ایک بنگلے کے اندر لگی کاٹھی بیری کی کچھ شاخیں چاردیواری سے باہر سڑک پر پھیل گئی تھیں۔ اس بیری پر نہایت سُرخ گول گول اور میٹھے بیر لگتے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر ہمارا جی للچا جاتا۔ ایک بُوڑھا پُوربیا گرا پڑا بیر بھی نہ اُٹھانے دیتا۔ وہ روکتا تو ہم اور بھی بپھرتے۔ ہم میں سے ایک لڑکا دوڑتا ہُوا جاتا اور دو تین ڈھیلے پھینک کر آگے نکل جاتا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے وہاں تک پہنچتے اور جُھک کر بیر چُن لیتے۔ ہماری اس حرکت پر وہ بھجنگ پُوربیا پُوربی لہجے میں ہمیں پنجابی گالیاں دیتا تو مزہ آ جاتا۔ پُوپلا مُنہ، لہجہ پُوربی اور گالی پنجابی میں۔ گالی ایک بے ہنگم سا ملغوبہ بن جاتی۔ اُس کا جواب ہمارا لیڈر دیتا جو قد بُت میں ہم سب سے کہیں بڑا نظر آتا تھا۔ شُدھ پنجابی میں اُسے وہ وہ مغلظات سُناتا کہ اللہ کی پناہ۔ بعد میں کہتا: "اوئے پُوربیے! آیا مزہ؟ انہیں کہتے ہیں گالیاں!" اُس کی گالیاں سُن کر ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ ہمارا یہ لیڈر جو ہمیں خاصا بُلی (   ) بھی کرتا تھا، پولیس میں سپاہی بھرتی ہُوا اور انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہُوا۔ اُس کی ترقی میں یقیناً گالیاں ایجاد کرنے کی قابلیت کو بھی کچھ دخل ضرور ہو گا۔

اسی سڑک پر ایک جوان اور صحت مند میم تقریباً ہر روز ہمیں گھوڑے پر سوار ملا کرتی تھی۔ ہم اُسے بلاناغہ سلام کرتے تھے پر اللہ کی بندی نے کبھی ہمارے سلام کا جواب نہ دیا تھا۔ یُوں بلاناغہ ملنا اور سلام لینا اُس کا وطیرہ بن چکا تھا۔ پتہ نہیں اس رویّے میں غرور کی تسکین کا سامان تھا یا وہی حاکمانہ ذہنیت کہ سلاموں سے کبھی سیر نہ ہوتی اور اُن کے اعتراف کا بار بھی قبول نہ کرتی۔ ہمارا لیڈر جس کا ذکر اُوپر ہُوا ہے، اُس کے اس رویّے سے بڑی ہتک محسوس کرتا تھا۔ اس کی تلافی وہ اُس کے متعلق گندی گندی جنسی باتیں کر کے کرتا تھا جن سے مجھے بہت وحشت ہوتی تھی۔ اتنی خُوبصورت میم کے متعلق ایسی باتیں سُن کر مجھے اپنے لیڈر پر غصّہ بھی آتا۔ مَیں نے ہلکا سا احتجاج کیا تو اُس نے پہلے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر میرے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "اس سے پُوچھو بھلا اُس سے کیا رشتہ ہے؟" یہ بھی ایک قسم کی گالی تھی، جو آج تک مجھے نہیں بھُولی کہ مَیں اس کا جواب نہ دے سکا تھا۔ بچپن اور بلوغت کے سنگم پر خوبصورت چہرے کے دفاع میں گالی کھا لینا ظاہر کرتا ہے کہ رُخِ نکو کا شوق صرف میر صاحب کا خاصا نہیں تھا اور نائٹ ایرنٹری صرف ڈان کہوٹے ہی کو ودیعت نہیں ہوئی تھی۔

ایک میم صاحب، ہمیں سردیوں کے موسم میں اسکول سے واپس آتے ہُوئے سہ پہر کو بلکھو کے کنارے کنارے سیر کرتے ملتی تھیں ——— وہ نہایت مضبوط قد کاٹھ کی خاتون تھیں اور مردانہ لباس پہنتی تھیں یعنی قمیص پتلون۔ ہاتھ میں ایک ہنٹر رکھتیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہنٹر چلاتیں تو یُوں لگتا جیسے فضا میں کسی سرسراتے ہُوئے سانپ کے بل کھُلتے چلے جا رہے ہوں۔ ہم میم صاحب سے دس پندرہ

گز کے فاصلے پر ہوتے۔ ہنٹر پٹاخ سے ہمارے قدموں میں آ کر زمین پر لگتا۔ ہم آواز پر اُچھل پڑتے۔ اس پر میم صاحب بے اختیار قہقہہ لگاتیں۔ ہمارا لیڈر اس میم صاحب سے اتنا خائف ہوتا کہ اُسے گالی بھی نہ دے سکتا۔ مجھے اس میم صاحب کا چہرہ کبھی اچھا نہ لگا۔ یُوں معلوم ہوتا جیسے لکڑی کا بنا ہُوا ہو اور اُس پر روغن کر دیا گیا ہو۔

اسلم بیگ بتایا کرتا تھا کہ یہ میم صاحبہ گوروں کی ایک بیرک میں بار (شراب خانہ) چلاتی ہیں اور مردانہ لباس اس لیے پہنتی ہیں کہ اتنے گوروں میں اکیلی عورت ہیں۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے ذکر کیا ہے، اس بیرک میں اسلم بیگ کے والد بھی ایک ریڑھی پر سٹال لگاتے تھے۔ ایک چلتا پھرتا سٹال۔ اتوار کے روز کئی بار مَیں اسلم بیگ کے ساتھ اس بیرک میں آیا۔ اسلم بیگ کے والد ہمیں کھانے کو بہت کچھ دیتے تھے۔ پھر بھی وہ اُن کی نظر بچا کر اپنی اور میری جیب اچھی اچھی چیزوں سے بھر دیا کرتا تھا۔ گاؤں واپس آتے ہوئے مَیں اسلم بیگ کو اس رویّے پر ڈانٹتا تو وہ کہتا: "یہ چوری ہے تو چیزیں نکال کر مجھے دے دو۔" اس پر مَیں آمادہ نہ ہوتا اور چنے چبینے کا ایک پھکا مار لیتا۔ بادام اور اخروٹ کی گریاں، کشمش اور کھوپا بھلا اتنی لذت سے کون دستبردار ہوتا ہے۔ یُوں بھی چوری کا چنا چبینا کچھ زیادہ ہی لذیذ ہوتا ہے۔ خیر یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ جن ٹامیوں سے ہم اکیلے دُکیلے ملتے ہُوئے ڈرتے تھے، اُنہیں بیرک میں بیسیوں کی تعداد میں گھومتے پھرتے دیکھ کر ایک عجیب سی عمومیت کا احساس ہوتا۔ یہ سٹال پر آ کر چیزیں خریدتے اور چلے جاتے۔ یہ منظر بھی عجیب لگتا۔ نزدیک سے دیکھنے پر ٹامیوں کے چہرے بھی عجیب لگتے۔ جن چہروں کو ہم دیکھنے کے عادی تھے، اُن کے خدوخال میں ہمیں کوئی بات اچنبھا معلوم نہ ہوتی۔ یہاں ہر ٹامی کا چہرہ ایک اچنبھا تھا۔ اکثر چہرے 'بُل ڈاگ' قسم کے چہرے تھے۔ بعض چہروں میں بوزنیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ کچھ چہروں کے لمبوترے پن میں گھوڑوں کے خدوخال نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ کچھ اس قسم کی مشابہتیں اُن گوروں کو ہم 'جنگلیوں' کے چہروں میں بھی نظر آتی ہوں گی۔ اسلم بیگ کے والد ہر گورے کو پہچانتے تھے اور اُس کے نام سے بھی آگاہ تھے۔ وہ نہایت عجیب سی انگریزی بولتے تھے، مثلاً 'نو رُوپی۔ نو تھنگ' یعنی روپیہ نہیں ہے تو چیز بھی نہیں ملے گی۔ اس پر گورا اپنی کلائی سے گھڑی اُتار کر اُن کے سپرد کر دیتا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ یہ گھڑی اگلے جمعے تک اُن کے پاس گروی رہے گی۔ کیونکہ اُنہیں جمعے کو تنخواہ ملتی ہے۔ گوروں سے اُدھار وصول کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُن کی کوئی چیز گروی رکھ لی جائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گورے ہفتے کے پہلے تین دن شاہی کرتے ہیں اور آخری تین دن گدائی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی ہر چیز اُدھار میں کھا جاتے ہیں اور پھر بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مَیں نے دوپہر کو ٹامیوں کو میس میں کھانا کھاتے بھی دیکھا ہے۔ اتنی بدتمیزی سے کھانا کھاتے تھے کہ اُن سے گھِن آتی تھی۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ گوشت کے بڑے بڑے بوٹ ہاتھ میں لے کر نوچتے کھسوٹتے تھے اور میس سے باہر آ کر ہڈیوں کو فضا میں اُچھال دیتے تھے۔ اُوپر سینکڑوں چیلیں منڈلا رہی ہوتیں۔ وہ ہوا ہی میں ہڈیوں کو اُچک لیتیں اور ایک ہڈی پر کئی کئی چیلیں بیک وقت جھپٹ پڑتی تھیں۔ غرض یہ نظارہ ٹامیوں کو بہت لُبھاتا تھا اور اسلم بیگ اور مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں دیسی سپاہیوں کی بیرکوں میں کھانا نہایت تمیز سے کھایا جاتا تھا۔ گورا بیرکوں اور دیسی بیرکوں میں صرف ایک سڑک کی چوڑائی کا فاصلہ تھا۔ یہاں دیسی گھُڑسوار فوج (کیولری) میں میرے ایک عزیز سیّد محبوب حسین شاہ اور اسلم بیگ کے بہنوئی مرزا منظور بیگ ملازم تھے۔ دونوں جوانِ رعنا تھے۔ وردی پر ایک خاص قسم کی طُرّہ دار پگڑی پہن کر گھوڑے پر سوار نظر آتے تو ہمارے دل فخر سے بھر جاتے۔ اُن کے مقابلے میں گھُڑسوار گورے

نہایت بے رنگ اور حقیر نظر آتے۔ کبھی کبھار ہم دوپہر کا کھانا کھانے اُن کی بیرک میں چلے جاتے۔ عام طور پر چپاتی اور سبزی گوشت کھانے کو ملتا لیکن بڑے سلیقے سے۔

ٹامی مونگ پھلی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اسلم بیگ کے والد نے مونگ پھلی کے پیکٹ بنا رکھے تھے۔ ایک پیکٹ دوئی سے کم میں نہیں ملتا تھا۔ اتنی مونگ پھلی ہمیں ریڑھی والے سے پیسے دھیلے میں مل جایا کرتی تھی۔

ہنٹر والی میم کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی ... نہیں... ہنٹر والی کے ساتھ اتنا ہی رابطہ قائم تھا جتنا میں نے پہلے بیان کر دیا ہے؛ تاہم بعد کی زندگی میں میں نے بچپن کی اس میم کو پردۂ سکرین پر ایکٹرس ناڈیا کے رُوپ میں دیکھا تو حیران رہ گیا تھا۔ وہی قد بُت، وہی پتلون، وہی چوبی چہرہ اور وہی ہنٹر۔ اس ہنٹر کی لپیٹ میں جو آیا، اُس کی خیر نہیں تھی صرف ڈمی بلیموریا کو اس ہنٹر سے بچنا آتا تھا۔ اسی میم کو میں نے کئی سرکسوں میں دیکھا کہ شیروں کے حلقے میں چٹاخ چٹاخ ہنٹر چلا رہی ہے اور شیر بڑی عاجزی سے جبڑا کھول کر احتجاج کرتے ہیں لیکن کرتے وہی ہیں جو سرکس کی یہ مس ناڈیا چاہتی ہے۔

کبھی کبھار ہم انگریز افسروں اور اُن کی میموں سے بخشیش بھی مانگتے تھے، حالانکہ جانتے تھے کہ بخشیش نہیں ملے گی۔ بخشیش مانگنا ایک کھیل تھا۔ اس کے جواب میں انگریز لوگوں کی جھڑکیاں سُننا بھی ایک کھیل تماشے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ انگریز خاصی کنجوس قوم واقع ہُوئی تھی مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں کہ کسی انگریز نے ہمیں بخشیش دی ہو۔ انگریز کے ہاں کام کرنے والے دیسی بھی اس بات کے شاکی تھے کہ تنخواہ کے سوا انگریز اور کسی لین دین کا قائل نہیں۔ سال میں کرسمس یعنی بڑے دن پر نوکروں کو کچھ بخشیش ملا کرتی تھی۔ میمیں نوکروں پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں۔ خانساماں اور بیرے کی کیا مجال کہ سودے سلف میں ذرا سی بھی بے ایمانی ہو سکے۔ ہمارے گاؤں کے ایک خانساماں بتایا کرتے تھے کہ کچن میں ہر چیز ڈبّے میں بند ہوتی ہے اور میم صاحب ناپ تول کر ہر روز کا راشن دیتی ہیں۔ اُس زمانے میں چھاؤنی کے اندر میں نے کسی بھکاری کو بھیک مانگتے ہُوئے نہیں دیکھا۔

ایک بار ایک میم نے ہماری خدمت کے صلے میں ہمیں کچھ دینا چاہا تھا جو ... چلیے پُورا قصّہ سُن لیجیے۔ اسکول سے واپسی پر ہم ایک چھوٹے سے خستہ حال بنگلے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ایک یُوریشین نے ہمیں روک لیا۔ یہ بنگلہ نہایت ویران سا تھا۔ اُس کے باغیچے میں گھاس اُگ آئی تھی اور درخت بھی سُوکھ سَڑ گئے تھے۔ دیواروں پر سے پلستر بھی جھڑ رہا تھا۔ یہ بنگلہ خالی ہو رہا تھا اور فرنیچر ایک ریڑھے پر لادا جا رہا تھا۔ یُوریشین نے کہا "ادھر آؤ، میم صاحب کا سامان ریڑھے پر لدوا دو۔" "کیوں! ہم کسی کے نوکر لگے ہیں؟" ہمارے لیڈر نے جواب دیا۔ ایک باریک سی آواز ہمارے کانوں میں آئی: "بچّو! ٹھہر جاؤ! تم ایک بُوڑھی عورت کی مدد نہیں کرو گے؟" یہ ایک چھوٹے قد کی نہایت ضعیف اور پتلی دُبلی میم تھی۔ ہمیں اُس پر ترس آ گیا۔ ہم نے منٹوں میں پُورا سامان ریڑھے پر لاد دیا تو میم صاحب نے ایک دوئی ہمیں دکھائی۔ ہمارا لیڈر دوئی پر جھپٹنے والا تھا کہ اسلم بیگ نے کہا "نہیں میم صاحب!"

میم صاحب نے جلدی سے دوئی مُٹھی میں دبا لی۔

دوئی کے آٹھ پیسے ہوتے تھے اور اُس زمانے میں ایک پیسے کی بھی بڑی قدر و قیمت تھی؛ چنانچہ ہمارے لیڈر نے اسلم بیگ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اُس نے کہا: "غریب کسی اسکول کی اُستانی معلوم ہوتی ہے۔" اُس دن میں نے بھی اسلم بیگ کی فیاضی کی تعریف نہیں کی تھی۔ آج سوچتا ہُوں تو مجھے وہ بڑا عظیم آدمی نظر آتا ہے کہ اُس نے ایک بُوڑھی اُستانی پر ترس کھا کر نہ صرف مشرقی روایات کی لاج رکھ لی بلکہ اپنے نیک عمل سے حاکم قوم کے ایک فرد سے اپنی محکومیت کا کچھ انتقام بھی لے لیا۔

کرسمس کے تہوار پر چھاؤنی میں بہت رونق ہوتی۔ نئے سال کے پہلے دن کے استقبال کے لیے اب بھی یورپی اقوام بہت طمطراق سے کام لیتی ہیں۔ اُن دنوں بھی چھاؤنی کے انگریز پُرانے سال اور نئے سال کے سنگم کا انتظار بڑے ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ میں نے خود ایسی کوئی تقریب نہیں دیکھی لیکن سُنا ہے کہ اُس دن چھاؤنی کی رقص گاہوں میں رات کے بارہ بجے تک بال روم ڈانس ہوتا اور نئے سال کے پہلے لمحے کو روشنی، شراب اور حُسن و جوانی کے سیلاب میں ڈبو دیا جاتا۔ انگریز اس تقریب کے بعد بے سُدھ ہو کر گھروں کو لوٹتے۔

ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے کہ ہمارے گاؤں کا ایک نوجوان خاکروب اپنے گاؤں سے نزدیک ترین چھاؤنی کی پکی سڑک پر مُنہ اندھیرے ایک بنگلے کے سامنے جھاڑو دے رہا تھا کہ بنگلے سے ایک انگریز لڑکی نکلی اور سڑک پر آ کر اُس کے پاس آ کھڑی ہُوئی۔ بیچارہ خاکروب بہت حیران ہُوا اور ڈر بھی گیا۔ لڑکی نے پُوچھا "بخشیش مانگتا؟"

"ہاں میم صاحب!" خاکروب نے ڈر کر کہا۔

اُس نے اشارے سے اُسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ جب وہ برآمدے میں پہنچے تو اُس لڑکی نے سخت سردی کے باوجود شب خوابی کا جُبّہ اُتار کر فرش پر ڈال دیا۔ اب وہ نیم عریاں لباس میں تھی۔ اُس نے کہا: "ویل کم۔ لٹ اس ڈانس۔"

اُس لمحے خاکروب کو احساس ہُوا کہ یہ انگریز لڑکی اُسے کونسی بخشیش دے رہی ہے۔ وہ اتنا خائف ہوا کہ اُس کے پاؤں زمین سے چمٹ گئے۔ اچانک اُس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا۔ وہ جھاڑو بھی سڑک پر بھول آیا۔

وہ بیان کیا کرتا تھا کہ لڑکی شراب کے نشے میں چُور تھی، اس لیے اُسے نیک و بد کی تمیز نہ رہی تھی۔ میں افسانہ نگار سوچتا ہُوں کہ اُس رات بال رُوم میں اُس لڑکی کو کوئی ڈانسنگ پارٹنر نہیں ملا ہوگا یا جس سب آل ٹرن (کیڈٹ)

متحدہ عرب امارات کی آبادی پندرہ لاکھ ہے جس میں اڑھائی لاکھ بھارتی اور دو لاکھ پاکستانی ہیں۔ شیخ زید کا ذاتی پائلٹ اور ڈاکٹر، فوج کا کمانڈر انچیف اور العین کا میوزیم ڈائریکٹر پاکستانی ہیں۔ متحدہ عرب امارات کی سالانہ فی کس آمدنی چونتیس ہزار ڈالر ہے جبکہ پاکستان میں یہ آمدنی محض ۳۵۰ ڈالر ہے۔

نوجوان افسر کے ساتھ وہ ڈانس کرنا چاہتی ہوگی، اُس نے اُسے اس لیے قابلِ اعتنا نہ سمجھا ہو گا کہ یہ ایک سارجنٹ کی بیٹی ہے اور اُس نے اس توہین کا انتقام ایک دیسی باشندے کو اپنے ناآسودہ جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا کر لینا چاہا ہو گا۔ نہ جانے اس حرکت کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما تھا۔ جس زمانے کی یہ بات ہے، میں انٹر میں پڑھتا تھا اور افسانہ نگاری کا وائرس مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا لیکن یہ توجیہہ بعد کی بات ہے۔ اُن دنوں ہم اُس خاکروب کو نشانۂ مذاق بنا کر اُسے بزدلی کا طعنہ دیا کرتے تھے۔

بعد میں جب میں نے ن۔م راشد کی نظم 'انتقام' پڑھی تو مجھے فوراً یہ خاکروب یاد آ گیا جو اپنی بے بسی کا انتقام ایک اجنبی حاکم قوم کی لڑکی سے نہ لے سکا تھا۔

سردیوں میں اسکول سے فارغ ہو کر ہمیں گھر پہنچنے کی کچھ زیادہ جلدی نہ ہوتی۔ صبح ہم ایک نمکین پراٹھا بستے میں رکھ کر لے آتے تھے اور تفریح میں چھاؤنی کے گھنٹہ گھر کے لان میں بیٹھ کر کھا لیتے تھے اور نل سے پانی پی لیتے تھے۔ اس لیے چھٹّی پر زیادہ بھوک نہ ہوتی۔ ہم سہ پہر کی نرم نرم دُھوپ میں سڑک کے عین درمیان آہستہ خرامی کا لطف اُٹھاتے۔ کبھی راستے میں پڑنے والی پریڈ گراؤنڈ کے کنارے کھڑے ہو کر کسی صاحب کو گاف کھیلتے ہُوئے دیکھنے لگتے۔ ایک ایسے

ہی موقع پر ایک خوفناک مونچھوں والے اردلی نے ہم سے پُوچھا: "تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"یونہی!"

اُس نے ہمارے لیڈر سے کہا: "اِدھر آؤ! تمھیں صاحب بُلا رہا ہے۔"

ہمارے لیڈر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "کیوں مَیں نے کیا کیا ہے؟"

"اپنا بستہ کسی ساتھی کو دے دو۔ مَرے کیوں جاتے ہو؛ تمھیں صاحب کھا تو نہیں لے گا۔ اُسے گاف کھلانے کے لیے کوئی کیڈی نہیں مل رہا۔" وہاں سے کچھ دُور ایک صاحب ایک چھتر کے نیچے بینچ پر بیٹھا تھا۔ ہمارے لیڈر نے ہم میں سے کسی کو بستہ دے کر کہا: "میرا انتظار کرنا۔" اور خود ڈرتا کانپتا اردلی کے پیچھے ہو لیا۔ اردلی نے چھڑیوں کا تھیلا اُس کے شانے پر ڈالا اور ہمارا لیڈر صاحب کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہم پہلے گراؤنڈ کے کنارے بیٹھے رہے اور وہ نہ آیا تو ہم نے گاؤں کی طرف قدم بڑھا لیے۔ بستہ اُس کے گھر پہنچا دیا۔

ڈر یہ تھا کہ ہمارا لیڈر بعد میں بہت گالیاں دے گا لیکن اگلی صبح جب وہ بہت خوش خوش ملا تو ہم بہت حیران ہوئے۔ اُس دن تفریح کے وقفے میں اُس نے بڑی شاہ خرچی سے کام لیا تو ہماری حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر کبھی کبھار چھٹی پر وہ کسی بہانے ہم سے پیچھے رہ جاتا۔ کچھ عرصہ بعد مُعمّہ حل ہو گیا۔ معلوم ہُوا کہ کیڈی کو گاف کھلانے کی اٹھنّی ملتی ہے اور گاف کی کوئی بیکار گیند جھونگے میں۔ تب ہمیں اُس پر رشک بھی آیا اور ترس بھی۔ ترس اس بات پر کہ اب اُس بیچارے کی لیڈرشپ میں دراڑ پڑ گئی تھی اور ہمارے دلوں سے اُس کا خوف اُٹھ گیا تھا۔

انگریز کے زمانے میں چھاؤنی میں رونق بہت ہُوا کرتی تھی۔ کسی پریڈ گراؤنڈ میں کوئی میچ ہو رہا ہوتا اور کسی میں کسی رجمنٹ کے سالانہ کھیل۔ کبھی کبھار انگریز رجمنٹوں کے مینا بازار بھی لگتے۔ نیو ایئر ڈے یعنی یکم جنوری کو چھاؤنی میں مقیم پُوری فوج کی پریڈ ہوتی اور یونین جیک کو سلامی دی جاتی۔ پولو کے میچ اکثر روٹی گودام پریڈ گراؤنڈ میں ہوتے جو ہمارے راستے میں نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی ہم میچ کا سُن کر وہاں ضرور پہنچ جاتے۔ گھر پہنچنے میں خاصی دیر ہو جاتی لیکن یہ میچ اتنے دلچسپ ہوتے کہ گھر والوں کی زجر و توبیخ کی بھی ہمیں پروا نہ ہوتی۔ کبھی کبھار ریاست جموں کشمیر کے ڈوگرا راجہ کی پولو ٹیم چھاؤنی کی ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنے آتی تو تماشائیوں کا خاصا ہجوم ہوتا۔ راجہ کی ٹیم کے کھلاڑی سر پر زرد رنگ کی راجپوتی پگڑی باندھتے اور بہت اچھے لگتے۔

سُنا ہے کہ اُس ٹیم کا کپتان ایک مسلمان نواب خسرو جنگ تھا جو حیدر آباد دکن کا رہنے والا تھا اور راجہ ہری سنگھ کا بڑا معتمد تھا۔ کہتے ہیں کہ اُسے اُس کے 'زنواس' میں کُھلے بندوں آنے جانے کا اِذن حاصل تھا۔ جیسا کہ انسان کی فطرت ہے، اس بات سے لوگوں نے بڑے عجیب و غریب افسانے گھڑ لیے تھے۔ اُن کا ہیرو نواب خسرو جنگ تھا۔ مَیں نے خسرو جنگ کو دُور سے دیکھا ہے۔ نہایت پُھرتیلے متناسب جسم اور گہرے سانولے رنگ کا خوش شکل نوجوان تھا اور پولو بہت اچھی کھیلتا تھا۔ لوگ راجہ کی ٹیم کو جی کھول کر بک اَپ کرتے تھے؛ حالانکہ جس زمانے کا مَیں ذکر کر رہا ہُوں، اُس سے دو چار سال قبل راجہ کے ظلم و ستم کے خلاف مسلمانوں نے بغاوت کی تھی اور لوگ اُس سے نفرت کرتے تھے لیکن انگریز کے مقابلے میں اُس کی ٹیم کو اپنا سمجھ کر اُس کے حق میں نعرے لگاتے تھے۔

کبھی راجہ ہری سنگھ خود بھی پولو کا بڑا اچھا کھلاڑی رہا تھا۔ پولو کھیلتے ہُوئے اُس کی ٹانگ ٹُوٹ گئی تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہُوں، وہ پولو نہیں کھیلتا تھا؛ البتہ میچ دیکھنے ضرور آیا کرتا تھا اور کار میں بیٹھ کر میچ دیکھتا تھا اور گاڑی سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اُس کی کار کے گرد اتنا زبردست پہرا لگا ہوتا کہ اُسے نزدیک سے دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ اُس کا

ایک لطیفہ مشہور تھا۔ کار کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اُس نے اپنے ایک محافظ سے پوچھا تھا: "یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟" اُس نے جواب دیا: "مہاراج! آپ کو دیکھنے کے لیے۔" راجہ نے کہا: "مجھے کیوں دیکھتے ہیں؟ انگریزوں کو کیوں نہیں دیکھتے؟" اس فقرے کا ڈوگری میں ترجمہ کیا جائے تو زیادہ مزہ دیتا ہے۔ ڈوگری راجہ ہری سنگھ کی مادری زبان تھی۔

اس لطیفے سے انگریزوں کے مقابلے میں دیسی راجوں مہاراجوں کے احساسِ کمتری کا نہایت پُرلطف اظہار ہوتا ہے۔

کسی رجمنٹ یا بٹالین کے سالانہ کھیل ہوتے تو ہم وہاں بھی پہنچ جاتے۔ ان کھیلوں میں رُکاوٹ کی دوڑ اور رسّہ کشی کا زیادہ لطف آتا۔ گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر رسّہ کشی کا مقابلہ اور بھی زیادہ پُرلطف ہوتا۔ کوئی جوان گھوڑے سے گرتا تو ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

پولو کے میچوں اور سالانہ کھیلوں سے بھی زیادہ بارونق مینا بازار ہُوا کرتے تھے۔ یہ بازار بہار کے موسم میں لگا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک تو موسم خوشگوار، دوسرے انگریز عورتوں اور بچوں کے رنگا رنگ لباس۔ فضا میں خوشبو اور دھوپ میں سنہری رنگ رچا ہُوا۔ گویا رنگ، خوشبو اور سرور کا ایک سیلاب اُمنڈ آتا۔ لال کُرتی رجمنٹ کا مینا بازار سب پر بازی لے جاتا تھا۔ سیالکوٹ چھاؤنی میں اب بھی لال کُرتی نام کا بازار موجود ہے۔ ہمارے گاؤں سے صرف پونے میل کے فاصلے پر۔ اس بازار کا نام ایک گورا بٹالین کے لباس سے منسوب ہے۔ اس بٹالین کے گورا سپاہی سُرخ رنگ کا چھوٹا چُست کوٹ 'ٹیونک' پہنتے تھے جسے ہم لوگوں نے لال کُرتی کا نام دے دیا تھا۔ اسی بازار کے قریب ہائی لینڈرز یعنی سکاٹ لینڈ کے سپاہیوں کی ایک بٹالین کی بیرکیں بھی تھیں جو گھا گھرا پلٹن کے نام سے مشہور تھی۔ یہ سپاہی 'کلٹ' پہنتے تھے جو عورتوں کے گھگھرے (لہنگے) سے ملتا جلتا لباس ہے؛ چنانچہ لال کُرتی بازار کے قریب جو مینا بازار لگتا، اُس میں ہائی لینڈرز اپنا مخصوص ساز بیگ پائپ بجاتے تھے اور سماں باندھ دیتے۔ اگرچہ مردوں کو گھگھرا پہنے دیکھ کر ہنسی بھی آتی تھی لیکن اس لباس کی مضحکہ خیزی بیگ پائپ کی دلکش موسیقی میں گم ہو جاتی۔ مینا بازار میں جو دُکانیں اور سٹال لگے ہوتے، اُن میں مویشیوں کا گزر نہیں تھا؛ البتہ مینا بازار کے آخری دن جو کھیل تماشے ہوتے، انہیں دیکھنے کا اِذنِ عام تھا۔ اُس دن کئی قسم کے کھیل ہوتے مثلاً کاوٹوں کی دوڑ، بوری ریس اور بوڑھی میموں اور بُوڑھے صاحبوں کی دوڑ۔ ان کھیلوں میں کچھ گورے مسخروں کا رُوپ بھی دھارتے تھے۔ کوئی گدھے پر بیٹھ کر آتا، کوئی بھینسے پر۔ کوئی اُلٹا بیٹھا ہوتا، کوئی اکڑوں۔ مونہوں پر انہوں نے ماسک چڑھائے ہوتے یا کالک ملی ہوتی۔ گدھے دولتّیاں جھاڑتے اور بھینسے سوار کو اپنی پیٹھ سے اُتار پھینکنے کے لیے بڑی بے ہنگم حرکات کرتے۔ یہ مسخرے رسّے کے پیچھے بیٹھے ہُوئے عوام کے ساتھ عملی مذاق بھی کرتے تھے اور کوئی گدھا یا بھینسا رسّہ پھاند کر عوام میں گُھس جاتا تو بھگدڑ مچ جاتی۔ جب یہ مسخرے انگریز میموں، لڑکیوں اور بچّوں کے پاس سے گزرتے ہُوئے اُن کا مُنہ چڑاتے یا کوئی مسخری کرتے تو وہ ڈر کر یا خوش ہو کر چیخیں مارتے۔ چیخیں مار کر مسخروں کی ان شرارتوں کی داد دینے کا یہ طریقہ ہمیں عجیب معلوم ہوتا۔ اُن کی چیخیں بھی ہماری چیخوں سے بہت مختلف ہوتیں۔ مَیں سوچتا تھا کہ جب یہ لوگ روتے ہوں گے تو ان کے رونے کا انداز کیا ہو گا اور ہم سے کتنا مختلف ہوتا ہو گا۔

نئے سال کے پہلے دن یعنی یکم جنوری کی صُبح چھاؤنی میں بہت بڑا فوجی اجتماع ہوتا تھا۔ ہمارے اسکول کے بچّوں کو حکم تھا کہ وہ کرسمس کی چُھٹّیوں کے فوراً بعد اس دن ضرور اسکول حاضر ہوں؛ چنانچہ علی الصبح گھر سے اسکول کو روانہ ہوتے وقت نئے سال کا یہ نیا دن ہمیں کبھی اچھا نہ لگا۔ پھر یہ سالانہ تقریب ہمارے گاؤں سے آدھ میل سے بھی کم فاصلے پر ایک پریڈ گراؤنڈ میں ہوتی تھی۔ ہم اپنے گھر کی چھت پر بھی

کھڑے ہو کر اسے دیکھ سکتے تھے، تاہم ہمیں دو میل چل کر پہلے اسکول جانا پڑتا۔ وہاں ہمارے ہاتھوں میں لال جھنڈیاں پکڑا دی جاتیں۔ ہم دو دو کی قطار بنا کر سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پریڈ گراؤنڈ میں پہنچتے۔ پی ٹی ماسٹر لالہ پرمانند کی سفید مونچھوں سے نکلی ہوئی بے جواز گالیاں بھی سُننی پڑتیں اور کبھی کبھار اُن کے پتلے سے بید کی سرسراہٹ جسم کو آگ سی بھی لگا جاتی ـــــ چنانچہ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ قدم سے قدم ملا رہے اور قطار ٹیڑھی نہ ہو۔ اتنا سنبھل کر چلنے سے اُس صُبح کی تلخی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

خدا خدا کر کے یہ مارچ ختم ہوتی اور ہمیں ایک اینکلوژر میں چُپ چاپ بٹھا دیا جاتا۔ ساتھ کے اینکلوژر میں کسی اسکول کے انگریز بچے بھی بیٹھے نظر آتے۔ کئی بچوں کی سُرسُر ناک بہہ رہی ہوتی تو ہم حیران ہوتے کہ انگریزوں کی ناک بھی بہتی ہے۔ ایک بچے کو مَیں نے قمیص کے کف سے ناک صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا اور بہت حیران ہُوا۔ سردیوں کی دُھوپ میں بھی تمازت آجاتی اور کُہر آلود ہوا میں شیر گرم سانسوں کا احساس ہوتا۔ اس کے بعد جو منظر ہم دیکھتے، اُس کی وجہ سے اُس صُبح کی ساری کوفت دُور ہو جاتی۔ پیدل اور گھُڑسوار فوج کے دل کے دل اس خُوبصُورتی سے قدم ملاتے ہُوئے آتے کہ یُوں لگتا جیسے دیواریں چلی آرہی ہیں۔ اس فوج میں گورے بھی ہوتے اور دیسی بھی۔ گورکھے بھی ہوتے اور پٹھان بھی اور کالے بھجنگ مدراسی بھی۔ مدراسی جس زبان میں بات کرتے تھے، اُس کا صوتی تأثر ہمیں عجیب معلوم ہوتا جیسے کوئی غُرغُر کر رہا ہو، چنانچہ ہم مدراسیوں کو انڈا گُڑگُڑ کہتے تھے۔ گھُڑسوار فوج کی مارچنگ میں جو گریس ہوتی، اُس کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ خاص طور پہ پنجابی گھُڑسوار فوج کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔

ہمارے سامنے یونین جیک لہرا رہا ہوتا۔ اُس کے نیچے کھڑے ہو کر ایک جرنیل صاحب سلامی لیتے تھے۔ توپوں کی سلامی بھی ہوتی اور توپ کی ایک ایک ضرب دیر تک چھاؤنی کے مختلف گوشوں میں گونجتی رہتی۔ بیگ پائپ بینڈ اور براس بینڈ سماں باندھ دیتے۔ اس پریڈ کی شان و شوکت میں دُنیا کے سب سے زیادہ خُوبصُورت جانور گھوڑے کو بہت عمل دخل تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں ٹینک اور آرمڈ کور نے گھوڑے کو میدانِ جنگ سے نکال باہر کیا تو جنگ و جدل سے شولری (شانِ شجاعت) کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۱ء کے آغاز میں سیالکوٹ چھاؤنی سے گھوڑا یکسر غائب ہو گیا تھا۔ صرف چند بڑے بڑے بنگلوں کے اصطبلوں میں سواری یا پولو کے گھوڑے باقی رہ گئے تھے۔

فوجی گھوڑوں کی نگہداشت اور پرورش پر انگریز دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اتنا خرچ اُس سوار پر نہیں ہوتا تھا جو اُس کی پیٹھ پر بیٹھ کر انگریز حکومت کا دفاع کرتا تھا۔ خاص طور پر دیسی سوار کو تو اُس کے گھوڑے پر اُٹھنے والے خرچ کے عشرِ عشیر کے برابر بھی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ گھوڑوں کا ہسپتال ہمارے گاؤں سے بہت قریب تھا۔ اس ہسپتال سے ملحقہ پریڈ گراؤنڈ میں ان گھوڑوں کا مقتل بھی تھا۔ ایک خاص عمر کے بعد جو گھوڑے فوجی خدمت کے قابل نہیں رہتے تھے، انہیں نیلام نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ وہ جس ناز و نعم کے عادی تھے، وہ انہیں کسی دیسی کے ہاں کیسے مل سکتا تھا۔ بڑے بڑے زمیندار بھی اُن کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یُوں بھی ہر پھر کر ہمارے ہاں گھوڑے کا صرف ایک ہی مصرف باقی رہ گیا تھا کہ اُسے تانگے میں جوتا جائے اور انگریز کو اپنے فوجی گھوڑوں کا یہ حشر منظور نہیں تھا؛ چنانچہ انہیں اس پریڈ میں لا کر گولی مار دی جاتی۔

مَیں نے قتل کا یہ منظر کئی بار دیکھا ہے۔ گھوڑے کی آنکھ پر پٹی باندھ کر اُسے مقتل میں لایا جاتا۔ دو دو آدمی اُس کے گلے میں رسا ڈال کر دائیں اور بائیں سے تھامے ہوتے۔ گھوڑے کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ موت کی بُو سُونگھ کر قدم آگے بڑھانے سے انکار کر دیتا۔ الف ہو جاتا اور غُصّے اور

کرب سے ہنہناتا تو کلیجہ مُنہ کو آجاتا۔ کئی بار گھوڑا رسا تُڑوا کر بھاگ نکلتا۔ کئی کئی دنوں تک اُس کا پیچھا کیا جاتا۔

ایک آدمی گھوڑے کے ماتھے پر ایک پستول نما ہتھیار کی نالی رکھتا اور اُس کے سرے پر ہتھوڑی سے ضرب لگاتا۔ ٹھاہ کی آواز کانوں میں پہنچ بھی نہ پاتی کہ گھوڑا گھُٹنوں کے بل زمین پر گر پڑتا۔ ایک آدمی چھُرا لیے تیار ہوتا اور جلدی سے اُس کی گردن پر پھیر دیتا۔ خون کی دھار اُچھل کر کئی فٹ دُور جا گرتی۔ اتنے پلے پلائے، چکنی تھرتھراتی ہُوئی حسّاس جلد کے خُوبصُورت زندہ جانور کو یُوں ایک لمحے کے اندر اندر مرتے ہوئے دیکھ کر میری طبیعت بہت خراب ہوتی۔ ایک دن میں کئی کئی گھوڑوں کی جان لی جاتی۔ اُس دِن ہمارے ارد گرد کے دیہات میں خانہ بدوش لوگوں مثلاً لگڑوں اور سانسیوں کی عید ہوتی۔ گوشت کے اچھے اچھے ٹکڑے بھی وہ لے جاتے اور اُس کی کھال بھی۔ ہمارے گاؤں کی خاکروب برادری کے لوگ بھی شروع شروع میں گھوڑے کا گوشت کھاتے تھے۔ بعد میں پادریوں نے انہیں منع کر دیا تھا۔ میرے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ گھوڑے کا گوشت مکروہ ہے حرام نہیں، چنانچہ تاتاری مسلمان گھوڑی کا دُودھ پیتے ہیں اور اس کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔

مَیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بات ہو رہی تھی چھاؤنی اور دیہات کی اور مَیں گھوڑوں کے مقتل میں جا پہنچا۔

اس مقتل سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کمپنی باغ ہے۔ جب میں اِنٹر میں پڑھتا تھا تو اکثر سہ پہر کو اس باغ کی سیر کو چلا جاتا تھا۔ اُس کے چار بڑے پھاٹک ہیں۔ ہر پھاٹک کے دائیں بائیں دو ببر شیر بیٹھے ہیں۔ زرد رنگ، کھُلے خوفناک جبڑے، سُرخ زبان گردن پر شاہانہ ایال۔ اتنے زندہ اور حقیقی کہ جب بھی اُن پر نظر پڑی، ایک تھرتھراہٹ سی جسم میں دوڑ دوڑ گئی۔ کسی بہت بڑے مجسمہ ساز نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ اُس کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ بہار کے موسم میں کمپنی باغ اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے۔

ہیسل بلیڈ کیمرہ سویڈن کی ایجاد ہے۔ ناسا کے خلانورد سفر کے دوران میں اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں مائیکل کولنز نے خلا میں چہل قدمی کی تو اس کیمرے کا ایک پُرزہ اچانک ڈِھیلا ہو کر باہر نکل پڑا اور پھر فضا میں تیرنے لگا۔ خلانورد نے جلد ہی سویڈن کے اس ننّھے سیارچے پر قابو پا لیا۔

مجھے یاد ہے کہ مَیں انٹر کا آخری پرچہ دے کر مرے کالج سے واپس گاؤں آرہا تھا کہ ایک موڑ پر میری سائیکل خود بخود کمپنی باغ کی طرف مُڑ گئی۔ اس لمحے میں موسمِ بہار کی سُنہری دُھوپ کو سڑکوں سے سمٹ کر درختوں کے گہرے سیاہ سایوں تلے چھُپتے ہُوئے دیکھ رہا ہوں۔ سایوں میں ایک عجیب سی نرمی بھی تھی۔ کمپنی باغ میں ایک مقام پر جہاں سنہری دُھوپ سایوں کی زد سے ابھی باہر تھی، پھُولوں کا میلہ لگا ہُوا تھا۔ اس میلے میں سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کنگ کی بہت ہی موٹی میم صاحبہ انعامات تقسیم کر رہی تھیں۔ رنگ برنگی کُرسیوں پر گوری اور کالی جینٹری براجمان تھی۔ رنگا رنگ پھُولوں اور خوش رنگ لباسوں میں ملبوس گوری اور کالی خُوبصُورت عورتوں کا یہ اجتماع آخری نظّارہ تھا جو یادوں کی متحرک فلم پر منعکس ہو کر محفوظ ہو گیا ہے۔ اس تقریب میں جو براس بینڈ بج رہا تھا، اُس کی قیادت ایک انگریز کر رہا تھا۔ مَیں ایک عام تماشائی تھا۔ بینڈ کی ایک دُھن ختم ہُوئی تو تماشائیوں کا ایک ریلا سا آیا۔ مَیں عوام اور خواص کو جُدا کرنے والے رَسّے سے لگ کر کھڑا تھا۔ دھکا جو لگا تو رسّا پھاند کر خواص کے حلقے میں جا گرا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بینڈ والے کھڑے تھے۔ انگریز بینڈ ماسٹر نے اپنا بیٹن میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہُوئے کہا، "گیٹ بیک!"

"کیوں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اب مَیں

نہیں جانتا کہ کیوں وہ انگریز میرے جواب پر ایک دو لمحوں کے لیے ٹھٹکا، پھر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہُوا وہاں سے ٹل گیا؛ تاہم میں رَستا پھاند کر پھر عوام میں شامل ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۱ء کے موسمِ بہار تک انگریز کا رُعب ہمارے دلوں سے خاصا اُٹھ چکا تھا ورنہ میں اتنی جرأت سے کام نہ لیتا اور 'آئی ایم سوری!' کہہ کر پیچھے ہٹ آتا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں پے در پے شکستوں نے انگریز کے رُعب داب کے قلعے میں نقب لگا دی تھی اور آزادی کی وہ تحریکیں جو ہندوستان میں اُٹھ رہی تھیں، اُنھوں نے ہمیں جرأت بخش دی تھی۔

اس 'کیوں' والی دلیری کے پیچھے ایک اور عامل بھی کارفرما تھا اور وہ خالص ذاتی سا عامل تھا کہ میں اُس بینڈ ماسٹر کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں سے قریب ایک درمیانے درجے کے بنگلے میں رہا کرتا تھا۔ اُس نے یقیناً سپاہی سے ترقی کی تھی اور زیادہ سے زیادہ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ اُس کے اصطبل میں ایک گھوڑا تھا اور ایک پونی (ٹٹو)، ایک دو نوکر بھی نظر آتے تھے۔ یہ اکثر گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو نکلتا تھا اور ہمارے گاؤں کے پاس سے گزرتا تھا۔ میں نے اُسے کبھی سلام نہیں کیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ میں اُسے اُس کی دو بیٹیوں کے حوالے سے جانتا تھا۔ یہ دونوں لڑکیاں چھاؤنی میں خاصی بدنام تھیں۔ اُن میں سے ایک بھرے بھرے جسم کی نہایت گرما گرم قسم کی لڑکی تھی جو زنانہ فوج میں ملازم تھی یعنی 'ویکائی' تھی۔ خاکی وردی میں ملبوس مجھے اکثر سائیکل پر سوار ملا کرتی تھی۔ میں نے اُس لڑکی کو اپنے بنگلے کے لان میں اکیلے بیٹھے ہُوئے بھی کئی بار دیکھا تھا اور اُس کے اردگرد ٹامیوں کا ایک ہجوم بھی۔ دوسری لڑکی نہایت دھان پان سی تھی اور بڑے شوخ رنگ کے کپڑے پہنتی تھی۔ اُس لڑکی کو ہمارے گاؤں کے کھیتوں میں پونی (ٹٹو) دوڑانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

اسی موسمِ بہار کی ایک سہ پہر کا ذکر ہے کہ میں پلکھو سے گزر کر چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہُوا۔ یہاں ایک پُرانا غیر آباد بھٹہ تھا۔ اُس کے اردگرد گڑھے تھے اور اُن کے کناروں پر شیشم کے بڑے پرانے تناور درخت تھے۔ ان گڑھوں میں سے ایک گڑھا مجھے بہت پسند تھا۔ اُس میں نرم و نازک گھاس کا دبیز فرش بچھا تھا اور کنارے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے میں بہت لطف آتا تھا۔ یہاں اتنی تنہائی اور خاموشی تھی کہ کتاب کے لفظ بولتے ہُوئے سُنائی دیتے اور مشکل سے مشکل مسئلے بھی خود بخود حل ہو جاتے۔ اُس سہ پہر کو میں اسی گڑھے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے غیر آباد بھٹے کے کنارے پر خاکی وردی میں ملبوس کئی ٹامیوں کو کھڑے دیکھا۔ اُن کے نرغے میں اُسی بینڈ ماسٹر کی ویکائی بیٹی تھی۔ میں حیران ہُوا کہ ایک لڑکی کس طرح اتنے ہجوم کا دل بہلا رہی ہے۔ قہقہوں کی آواز دُور سے سُنائی دے رہی تھی۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اُن سے پچاس گز دُور گزرنے والی سڑک پر لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے رُک جاتے ہیں۔ میں بھی اس نظارے میں محو تھا اور اسی حالت میں اپنے پسندیدہ گڑھے کے کنارے پہنچ گیا۔ گڑھے کے اندر سے اچانک غرّانے کی آواز آئی۔ "ہُو ہُو ہُو۔" میں چونک گیا، جُھک کر دیکھا تو دو جسموں کو بوس و کنار کی کیف آمیز یا ہیجان انگیز کیفیت میں ایک دوسرے سے متّصل پایا۔ میں اتنا ڈر گیا۔ اس حالت میں مردِ مستی میں آئے ہُوئے بھینسا سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا: "آئی ایم سوری!" اور وہاں سے ٹل گیا۔ یہ بینڈ ماسٹر کی دوسری بیٹی تھی جو چھاؤنی کے اس ہائیڈ پارک میں کورٹ شِپ کی نہایت نازک منزل سے گزر رہی تھی۔

میں ابھی پلکھو میں سے گزرنے والی سڑک پر بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ اپنے گاؤں کی طرف سے بینڈ ماسٹر کو گھوڑے پر آتے ہُوئے دیکھا۔ وہ میرے پاس سے گزرا۔ انہی گڑھوں میں سے گزرتا ہُوا وہ بھٹے کے قریب پہنچا تو اُس

[illegible] بیٹی ٹامیوں کے ہجوم کے ساتھ بھٹے میں غڑاپ [illegible] گئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہُوا تو یہ فرمانبردار بیٹی [illegible] کے گروہ کے ساتھ پھر کنارے پر آ کھڑی ہُوئی [illegible] مارنے اور چہلیں کرنے لگی۔ بینڈ ماسٹر نے یقیناً [illegible] کو دیکھ لیا ہو گا۔ اب بتائیے کہ اس قسم کے باپ کی [illegible] میں کیا وقعت باقی رہ گئی تھی؛ چنانچہ یہ جانتے [illegible] کہ وہ انگریز ہے، میں اُس کے بیٹن سے ذرا [illegible] دبکا۔

[illegible] کے کینوس پر یہ آخری تصویر تھی جو میں نے کاغذ [illegible] اس کے بعد میرا گاؤں اور چھاؤنی سے تعلق [illegible] کا رہ گیا۔

[illegible] کی ملاقاتوں میں میں نے چھاؤنی [illegible] آہستہ آہستہ خارج ہوتے ہُوئے محسوس کیا۔ [illegible] انگریز نہایت مضمحل اور غیر مرئی سا ہو گیا تھا۔ [illegible] زمانے کی کوئی ایسی تصویر نہیں جسے میں صفحۂ [illegible] کر سکوں؛ البتہ آزادی کے بعد چند سالوں تک [illegible] حالت میں نے دیکھی، وہ عجیب سی نظر آئی۔ چند [illegible] کے علاوہ ہر بڑا بنگلہ مجھے غیر آباد سا نظر آیا۔ اس کے [illegible] گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کا قبضہ دیکھا۔ پھر کچھ [illegible] کے ہرے بھرے کھیت اور گندم کی فصل [illegible] دیکھا۔ اصطبلوں سے گھوڑا قطعاً غائب ہو [illegible] اور پھر یہ اصطبل سڑک کے متوازی دیوار کے ساتھ [illegible] تھے۔ اُن کے روشندانوں سے بھینسوں کی [illegible] نظر آنے لگیں۔ بہت کم لان تھے جہاں پھول

[illegible] گاؤں سے نزدیک ترین ایک بنگلے میں انگریز [illegible] کے بجائے جو جے سی او سردار صاحب رہتے [illegible] بیگم صاحبہ برآمدے میں پیڑھے پر بیٹھی چاٹی میں متھنی ڈالے گھمگ گھوں گھمگ گھوں دہی بلوتی نظر آتیں۔ ایک دیوار پر اُپلے بھی لگے ہُوئے تھے۔ ہمارے گاؤں کے لیے یہ نظارہ عجیب و غریب نوعیت کا تھا؛ چنانچہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا تو اس کا تذکرہ سُنا۔ ایک صُبح میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس سے لطف اندوز ہُوا۔

مجھے سارجنٹ کی وہ میم یاد آ گئی جو اس بنگلے میں الگنی پر گیلے کپڑے لٹکایا کرتی تھی اور سڑک پر آ کر شہزادی بن جاتی تھی اور سلام کا جواب سر کی خفیف سی حرکت سے دیا کرتی تھی۔

خدا بھلا کرے جنرل شیر علی خاں کا کہ اُنھوں نے ان بنگلوں کو گائے بھینسوں اور اُپلوں سے پاک صاف کیا اور چھاؤنی کو پھر صحیح معنوں میں چھاؤنی بنایا۔ اب پُرانے بنگلوں کی جگہ جو نئے بنگلے تعمیر ہُوئے ہیں، وہ نہایت موزوں اور متناسب رقبے کو گھیرے ہُوئے ہیں۔ اُن کے لانوں میں پھول لہراتے ہیں۔ اصطبلوں کی جگہ گیراج بن گئے ہیں جہاں بانکی چھبیلی کاریں نظر آتی ہیں۔

اب بھی چھاؤنی میں ہر رجمنٹ اپنی سالانہ تقریبات منعقد کرتی ہے اور یقیناً مینا بازار بھی لگتے ہوں گے مگر میرا بچپن گزر چکا ہے اور بڑھاپے میں تو میرا رابطہ چھاؤنی سے مطلقاً ٹوٹ چکا ہے۔

لیکن میرے گاؤں کا چھاؤنی سے رابطہ بدستور قائم ہے۔ نالہ پلکھو پر پُل بندھ چکا ہے؛ چنانچہ یہ حدِ فاصل ہی نہیں بلکہ اُس لکیر کا درجہ اختیار کر گیا ہے جو زندگی کے نقشے پر چھاؤنی کو چھاؤنی اور گاؤں کو گاؤں رکھے ہُوئے ہے ورنہ کتنے گاؤں ہیں جو بڑے بڑے شہروں نے ہڑپ کر لیے ہیں اور کتنے ہیں جو جھیلوں اور بیراجوں میں ڈوب چکے ہیں کہ اب اُن کا کھوج بھی نہیں ملتا! ◘◘

بے نماز کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ —— (غوثِ اعظمؒ)

پاکستان ریلویز

ٹنڈر نوٹس

چیف آفیسر / کنکریٹ سلیپر فیکٹریز پی آر ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور کو ریلوے کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے سپلائی ریت اور پتھر بابت کنکریٹ سلیپر فیکٹری واقع سکھر، تھرو ریٹس پر سربمہر ٹنڈرز مطلوب ہیں۔ اندازاً مقدار / لاگت سپلائی حسبِ ذیل ہے۔

نمبر شمار	لوکیشن	اندازاً لاگت	زرِ ضمانت
۱	**کنکریٹ سلیپر فیکٹری سکھر** ۱۔ سپلائی ریت ۱،۲۰،۰۰۰ مکعب فٹ ازاں مچھ۔ ۲۔ سپلائی ہارڈ سینڈ سٹون ۳" تا ۶" سائز ۳،۵۰،۰۰۰ مکعب فٹ ازاں مچھ۔	۲۳۵۰،۰۰۰/- روپے	۴۷،۰۰۰/- روپے

مُدّت تکمیل سپلائی چھ ماہ ہے۔

ٹنڈر ۲۳/۶/۸۵ تک دفتر چیف آفیسر (کنکریٹ سلیپر فیکٹریز پی آر ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور اور ورکس مینجر / کنکریٹ سلیپر فیکٹری سکھر سے کسی روز ۴۰/- روپے فی سیٹ کے نقد ادا کرنے پر خریدے جا سکیں گے۔ ٹنڈر ۲۴/۶/۸۵ کو ۱۲ بجے دوپہر تک دفتر سینئر فنانس آفیسر / ریلوے مینوفیکچرنگ پی آر ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور میں وصول کیے جائیں گے اسی روز اسی وقت کھول دیے جائیں گے۔

برائے چیف آفیسر سی ایس ایف
پی آر، لاہور

پی آئی ڈی (لاہور) ۵۱۵۲

چاچا سلطان

سادگی اور قناعت میں اللہ سے لَو لگانے والا ایک سچّا کردار

محمد اکرم رانجھا

گاؤں جاتے ہُوئے جیسے ہی کار نے لوئر جہلم کی پٹڑی کو چھوڑا اور پگڈنڈی پر ہو لی، ملکا مسلم شیخ نے سامنے آ کر ہاتھ سے گاڑی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ میں بھی گھبرا گیا، کیونکہ مخصوص علاقائی اور خاندانی پس منظر کے باعث اطمینانِ قلب سے تہی دامن ہی چلا آ رہا ہُوں۔ اُس نے انگشتِ شہادت کے سامنے پھیلے ہُوئے پُرانے قبرستان کی طرف اشارہ کیا اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہا: "چاچا سلطان فوت ہو گیا ہے اور وہ سامنے دفن ہو رہا ہے۔"

مَیں قبرستان میں پہنچا۔ ایک طرف چند مرد نئی قبر پر تازہ مٹی ڈال رہے تھے اور ذرا پرے دو چار سوگوار عورتیں بیٹھی آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ مَیں نے حسرت بھری نظروں سے چاچا سلطان کی آخری آرام گاہ کو دیکھا۔ منوں سُرخ بھربھری تازہ مٹّی کے نیچے وہ اپنے منحنی چھریرے بدن کے ساتھ ابدی نیند سو گیا تھا۔ اُس کے عزیز و اقارب اور گنتی کے دوست احباب اُس کی قبر پر مزید مٹّی کے غلاف چڑھا رہے تھے۔ ملکے نے غمزدہ لہجے میں کہا: "چاچا سلطان اپنے حصّے کی مرلہ بھر زمین لیے وہ لیٹ گیا ہے۔"

چاچا سلطان کی زندگی کے مختلف پہلو اُبھر کر میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ وہ مسلم شیخ برادری سے تعلق رکھتا تھا جو دیہات یعنی جہلم اور دریائے چناب کی اس وادی میں سب سے کثیر التعداد برادری ہے۔ ملکیتِ زمین کے لحاظ سے یہاں کی سیادت رانجھوں اور گوندلوں کے حصّے میں آئی ہے لیکن آبادی، قوّتِ کار اور طمانیتِ قلب کے لحاظ سے یہاں

مسلم شیخ برادری کی برتری مسلّم ہے۔ اگر آج مسلم شیخ اس علاقے سے ہجرت کر جائیں تو خوشوں بھری لہلہاتی گندم کھیتوں میں کھڑی کی کھڑی رہ جائے اور اُسے بھُوسے سے الگ کرنے اور سنبھالنے والا کوئی نہ ملے گوندلوں کی خوبصورت بھینسیں دوہنے والا بھی کوئی نہ رہے۔

زمینوں کو سیراب کرنا اور اندھیری راتوں میں راجباہوں کے کنارے پھُنکارتے ناگوں سے آنکھ مچولی کھیلنا اس برادری کے بچّوں کا معمول ہے۔ زیادہ سے زیادہ محنت اور کم سے کم معاوضے کے ساتھ جہالت، بیماری اور فاقوں کا مقابلہ ہنسی خوشی کرنا اس قبیلے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سخت کوشی، بلند حوصلگی اور اطمینانِ قلب کی دولت کا وافر حصّہ انہیں ملا ہے۔ فصل اُترنے کا جانگسل مرحلہ جیسے ہی طے پا جائے مسلم شیخ ہاتھوں میں چھٹے تھامے "توشو پیر" توشوہادی ہے یعنی شاہ کوٹ کے بابا نولکھ ہزاری کے گیت ضرور گاتے ہیں۔ پاؤں میں گھنگھرو باندھے، کانوں پر ہاتھ دھرے یہ اپنے مُرشد اور پیر کے گیت والہانہ انداز میں الاپتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں مسلم شیخوں کو وسائلِ رزق سے کم کم نوازا ہے، وہیں اُنہیں کثرتِ اولاد، ازدواجی ہم آہنگی اور شاداں و فرحاں اور پُر قناعت زندگی سے بڑھ چڑھ کر بہرہ ور کیا ہے۔

چاچا سلطان اسی برادری کا ایک گمنام سا فرد تھا۔

اُسے میاں محمدؒ کی مثنوی سیف الملوک، وارث شاہ کی ہیر اور پیلو شاعر کی مرزا صاحباں سے والہانہ محبت تھی۔ مَیں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میانہ قد، پتلا پھرتیلا جسم، ستواں ناک، بلند پیشانی، مخموری مہین آنکھیں، پیلے دانت جو سدا بہار مُسکراہٹ کی بدولت ہمیشہ نمایاں نظر آتے۔ بالشت بھر ڈاڑھی جس کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ خستہ سا تہبند، پھٹا پرانا لمبا کُرتہ، میلی کچیلی پگڑی اور ٹوٹی پھوٹی دیسی جُوتی۔ کندھے پر ایک میلی سی چادر۔ ہاتھ میں لمبا سا عصا، گلے میں سبز پتھر کی تسبیح جو کبھی کبھی وظیفہ کرتے وقت ہاتھ میں نظر آتی اور فراغت کے موقع پر گلے میں۔ یہ تھا چاچا سلطان کا پہلا سراپا جو میرے ذہن کے پردے پر محفوظ چلا آ رہا ہے۔

چاچا سلطان کی تصویر کا سب سے نمایاں پہلو جو نگاہوں کے سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ وہ ایک گمنام انسان تھا جسے چند آدمیوں کے سوا علاقے کے لوگ بھی نہ جانتے تھے۔ وہ دو جوان بیٹوں کا باپ تھا جو گھر بار والے تھے۔ چاچا کہیں جوانی ہی میں بیوی کی موت کا صدمہ برداشت کر چکا تھا اور اُس کا کھانا چند روز ایک بیٹے کے گھر پکتا اور پھر دوسرے کے گھر۔

چاچا کی دوسری اہم صفت اُس کا پابندِ نماز ہونا تھا۔ مَیں نے یادداشتوں کو ٹٹولا تو وہ بارہا مجھے عصر، ظہر اور مغرب کی نماز پُورے خضوع و خشوع کے ساتھ نہر لوئر جہلم کی سبز منڈیر پر پڑھتا نظر آیا۔ مجھے یہ بھی یاد پڑا کہ ایک دفعہ سخت گرمی کے موسم میں چاچا جب باغ میں سنگترے کے پَودے سو پودوں کی نلائی کر چکا تو روزے کے سبب اُسے پیاس نے آن ستایا۔ اُس نے راجباہ کے گدلے پانی میں اپنے کندھے کی چادر بھگوئی اور شہتوت کے نیچے ٹھنڈی زمین پر چادر تان کر سو گیا۔ ظہر ڈھلے اُٹھ کر نماز پڑھی اور عصر تک وظیفہ کرتا رہا، عصر کی نماز پڑھ کر حسبِ معمول اپنی مرچوں کی کیاری چھیلتا رہا اور اس طرح افطاری تک اُس نے خود کو مصروف رکھا۔ یہ اُس کے لیے روزمرّہ کا معمول تھا۔ اُس کے ساتھ رہنے والے کہتے ہیں کہ اُس نے ایک بھی روزہ قضا نہیں کیا۔

اُس کا مشغلہ یہ بھی تھا کہ ایک بچھیا یا کٹڑی کہیں سے نصف حصّے پر لے آتا اور اولاد کی طرح اُسے کھلاتا پلاتا اور پیار کرتا۔ اور جب تیسرے چوتھے سال وہ شیردار ہو جاتی تو اپنے حصّے کی رقم لے کر اپنے پوتوں کو کپڑے بنوا دیتا۔ دُودھ پینا شاید اس کے نصیبوں میں نہ تھا۔ اگلے روز پھر سے ایک نئی بچھیا اُس کے دروازے پر بندھی نظر آتی جس کے ناز نخرے برداشت کرتا وہ کبھی نہ تھکتا۔ قلتِ خوراک سے

وہ بیمار تو نہیں البتہ کمزور کمزور نظر آنے لگا تھا جب بھی کسی رئیس نے اُسے فقیر یا شاید حقیر سمجھ کر چند روپے بطورِ خیرات دیے تو ناگواری اُس کے چہرے پر اُبھر آئی۔ اس نوازش کو ٹھکرا تو نہ سکتا لیکن یہ صاف نظر آتا کہ یہ دولت لے کر اُسے کوئی خوشی نہیں ہُوئی اور وہ دباؤ کے تحت اسے قبول کر رہا ہے۔

اُس میں قناعت اور غنا اتنا تھا کہ آج کا تعلیم یافتہ مہذّب اور بنا ٹھنا نوجوان اُس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ مَیں نے قلتِ طعام پر صابر شاکر چاچا سلطان کو قلتِ کلام کا بھی شائق پایا۔ اُسے گفتگو کا آغاز کرتے کبھی نہ دیکھا۔ وہ محفلوں میں پہروں بیٹھا گفتگو سنتا رہتا۔ مُسکراتا اور لطفِ کلام سے محظوظ ہوتا رہتا لیکن کبھی اپنی سُنانے پر مُصر نہ ہوتا۔ اُسے نیند بھی کم آتی۔ مَیں نے رمضان کے سوا اُسے کبھی دن کے وقت سوتے نہ دیکھا۔ اُس کی گھاس پھونس کی جھونپڑی کے آس پاس رہنے والے کہتے ہیں کہ پچھلی رات وہ کبھی نہ سویا۔ وہ شب بیدار تھا۔ تہجد کا پابند تھا۔ نمازِ فجر سے تھوڑی دیر پہلے دھیمے سُروں، پُر سوز آواز میں گنگناتا ؎

رُکھے رُکھے رُکھا ساڈے مینہ ندیاں تے وسّے
جھونپڑیاں وچ گھپ اندھیرا تے چن بنگلیاں تے ہسّے
ڈوہنگے پھٹ کتھے تے ملہماں کتھے لایاں
واہ نگری دیاں سایاں

تھوڑی دیر کے لیے سسکیوں کی آواز آتی۔ تسلیم و رضا کا پُتلا اپنے خالق اور مالک کے گلے شکوے کرتا۔ پھر توجہ عقیدت کے مرکز مُرشد کی طرف پھر جاتی اور اُسے مخاطب کر کے رمزیہ انداز میں وہ کہتا ؎

الف ادھڑاں دے وچ مَیں پھراں بھوندی تیرے باجھ نہیں اوٹ پناہ
بھانویں جھیی کوچجی تے کوجھی ہاں لڑ لگیاں تُدھ جیہا رانجھا

رمزیہ بول صُبح کاذب کے دُھندلکے میں یُوں غضب ڈھاتے ع

میرا سجدہ اوسے محل توں جتھے کیتا خان مکان

نمازِ فجر باجماعت ادا کرنے کے فوراً بعد یہ ان پڑھ لیکن صاف باطن انسان کھُرپی سنبھال کر اپنی سبزی کی دیکھ بھال میں مشغول ہو جاتا۔

زندگی بھر اُس نے بندوق کو ہاتھ نہ لگایا، موٹر کار کی سواری نہ کی اور بجلی کے پنکھے کی ہوا نہ لی۔ برفیلا پانی کبھی نہ پیا۔ سَو روپے کے نوٹ کو ہاتھ لگانا بھی نصیب نہ ہُوا لیکن بے مائگی کبھی اُس کی خوش مزاجی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

وہ آگے جاتے کو پہلے السلام علیکم کہتا۔ مُسکراتے رہنا تو اُس کی عادت تھی۔ لطیفہ اُسے بس ایک ہی یاد تھا جسے وہ صرف حسبِ فرمائش یا پھر اُس وقت سُناتا جب وہ انتہائی خوشی کے مُوڈ میں ہوتا اور بے تکلفی کی فضا اُسے میسّر آتی۔ آپ بھی سُن لیجیے:

"اللہ میاں کے حکم سے ایک مُسلّی یعنی مسلم شیخ کو جنّت کی سیر کرائی گئی۔ وہ جنّت میں بے حد غمگین اور پریشان ہو گیا، کیونکہ وہاں نہ تو کوئی حُقّہ تھا اور نہ کوئی رانجھا نامور اور سردار اُسے نظر آیا۔ ہر طرف موچی، درزی، کمہار اور دوسرے محنت کش باریش چہروں پر سجدوں کی محراب سجائے اپنے آپ میں مگن پھر رہے تھے۔ جنّت سے واپسی پر مُسلّی سیاح نے جہنّم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُسے وہاں علاقے کے بڑے بڑے سرداروں کے ڈیرے نظر آئے جہاں وہ تھانیداروں کے ساتھ بیٹھے حُقّے کی نَے مُنہ میں لیے جوڑ توڑ اور چوروں کی سفارشیں کرتے دکھائی دیے۔ سیاح ان سرداروں کو دیکھ کر اور حُقّہ پی کر بڑا خوش ہُوا۔"

یہ لطیفہ سُنا کر وہ بے ساختہ قہقہہ لگاتا ورنہ اُس کی سدا بہار مُسکراہٹ کبھی ہنسی کے دائرے میں داخل نہ ہوتی۔ اُسے پیلو اور ٹھیکری کی کہانی بھی بڑی پسند تھی۔ "پیلو شاعر ایک روز ویران شہر میں گیا اور ٹُوٹے برتن کی ٹھیکری ہاتھ میں پکڑ کر دل گرفتہ ہو گیا اور شاعرانہ زبان میں پُوچھنے لگا ؎

پیلو پچھدا ٹھیکرے کِت وَل گیا جہان
کِت وَل مٹ شراب دے کِتھے نیل دُکان

رُکت وِل گیاں سنگتاں جھیڑیاں کے وی نہ مُرجھان
رُکت وِل گیاں بانکیاں تے کِت وِل چھیل جوان

(بیلکو ویرانے کی ٹھیکری سے پُوچھتا ہے کہ تیرا اصل دستا بستا جہان کیسے ویران ہوگیا۔ شراب کے مٹکوں سے بھری دُکانیں، کبھی نہ ماند پڑنے والی مجلسیں حسین و جمیل نازنینیں اور کڑیل جوان آخر کہاں چلے گئے؟)

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ایک دفعہ گھنگھور گھٹائیں، گھر گھر کر آ رہی تھیں اور برکھا ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ موسلا دھار مینہ سے پناہ حاصل کرتے میں چاچا سلطان کی کچی کُٹیا میں داخل ہُوا۔ چاچا دھان کی پرالی کے اُوپر اپنی کندھے کی چادر بچھائے نمازِ ظہر ادا کر رہا تھا۔ میں اُس کی اکلوتی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ نماز ادا کر کے میری طرف متوجّہ ہُوا اور مُسکرایا۔ پھر اُس نے مجھے رُوکھی روٹی سُرخ مرچوں کے ساتھ کھانے کی دعوت دی جو اُس کے چھوٹے بیٹے کی بیوی نے اُس کی جھونپڑی میں پہنچائی تھی۔ میں نے معذرت کی اور اُسے وہ رُوکھی سُوکھی کھاتے دیکھتا رہا۔ جتنے ذوق و شوق سے مزے لے لے کر اُس نے وہ 'لنچ' کیا اس طرح میں نے انٹر کانٹیننٹل میں امیر لوگوں کو لطف اندوز ہوتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

بارش تھمنے تک میں وہیں بیٹھا اُس کی بے مائیگی کو نگاہِ عبرت سے دیکھتا رہا۔ ایک پیالہ، ایک پلیٹ اور ایک گھڑا پانی کا۔ ایک ٹوٹی پُھوٹی چارپائی اور ایک لحاف سردیوں میں اوڑھنے کا۔ یہ تھا سارا سامانِ زیست جس کے بل بوتے پر یہ مردِ درویش زندگی کے دن پُورے کر رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر استغنا اور قناعت کے حسین رنگ یُوں بکھرے ہُوئے نظر آتے تھے گویا ہفت اقلیم کا مالک ہو۔

بارش جب زیادہ تیز ہوگئی تو پانی جھونپڑی کے اندر گُھس آیا۔ چاچا سلطان کی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اور پھیل گئی اور وہ اپنی کندھے کی چادر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور میری پائنتی کی جانب چارپائی پر بیٹھ کر پانی کے ریلے کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "میرے پاس ہے کیا جسے تُو بہا لے جائے گا؟ میری جانب سے جتنا زور شور لگا سکتا ہے لگا لے۔ اگر جھونپڑی گر گئی تو پھر سے بنا لوں گا۔"

میں نے چاچا سلطان کی حالت کے پیشِ نظر کہا "چاچا! تُو کماتا کیوں نہیں؟ اس عسرت و افلاس کے ہاتھوں تنگ نہیں آتا؟"

وہ مُسکرایا اور اُس نے کہا: "بیٹے! میں نکھٹو تو نہیں۔ سبزی لگاتا ہُوں، مویشی پالتا ہُوں۔ درختوں کی پیوندکاری میں میرے جیسا کاریگر پُورے پنجاب میں کوئی نہیں۔ تمہارے باغ میں کنو اور ریڈ بلڈ کے پودے میرے ہاتھوں پیوند ہُوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں کما کر اپنے پوتوں، پوتیوں، بیٹوں اور بہوؤں کو دے ڈالتا ہُوں، کیونکہ کثرتِ اولاد سے اُن کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ یہ نہ سمجھیں میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں۔ میری نمازیں، روزے، صبر اور شکر یہ سب میرے لیے بیش بہا دولت ہیں۔ یہ محفوظ سرمایہ اگلی دُنیا میں کام آئے گا۔ ان سکوں کا چلن موت کے بعد ہوگا۔ سُنا نہیں تُو نے؟

"بیگانے دیس میں تُو دیکھے گا یہاں کے فقیر وہاں شہنشاہ ہوں گے اور یہاں کے شاہ وہاں جا کر گدا ہو جائیں گے۔ اُس کے ہاں دیر تو ہے لیکن اندھیر نہیں۔" اُس لمحے وہ سنجیدہ اور روہانسا ہوگیا تھا۔

"بے ٹکیاں گڈی مُول نہ چڑھنا اس گڈی جانا دیس بیگانے"

(اے مسافر! ٹکٹ کے بغیر گاڑی پر ہرگز نہ چڑھنا کیونکہ یہ گاڑی ایک اجنبی دیس جا رہی ہے جہاں ٹکٹ دکھانا لازمی ہوگا۔)

"لیکن چاچا! اگر یہاں تُو ڈھنگ کا پہنے، اچھا کھائے پیے اور چین سے گزر بسر کرے تو کیا تیری آخرت خراب ہو جائے گی!"

"بیٹے! ہر نعمت کے متعلق آخرت میں سوال تو کیا جائے گا نا! میں ہر جمعہ کوٹ مومن گیارہ میل دُور جا کر سید بادشاہ کے پیچھے اسی لیے پڑھتا ہُوں کہ وہ بڑی کام کی باتیں بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دُنیا کے پیچھے اُتنا ہی بھاگو جتنا تمہیں دُنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کچھ کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے۔ اور یہ کہ ناداروں کے لیے خوشخبری ہے (طوبیٰ للغربا) اب تُو دیکھ اگر میرے پاس دُنیاوی سامان کم ہے تو اس برساتی پانی کے ریلے کی مجھے کیا فکر ہو سکتی ہے؟ اگر جھونپڑی میں پانی گُھس آیا ہے تو میرا کیا بگاڑے گا۔ میں کندھے کی چادر جھاڑ کر زمین سے کھڑا ہوتا ہُوں۔ اسی طرح کل کلاں جب میرے اُونٹ والا (ملک الموت) دکھائی دے گا تو انشاءاللہ یہی چادر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوں گا۔"

اور آج چاچا سلطان فی الواقع چادر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور اگلے جہان روانہ ہوگیا تھا۔ جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا اور جو بھی یہاں دُنیا میں آیا اُسے وہاں جانا ہی پڑا۔ خواہ اس نے چاہا یا نہ چاہا۔ چونکہ وہاں جانے والا کوئی بھی واپس نہیں آیا اس لیے کسی نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ وہاں جا کر کیا بیتتی ہے لیکن جس ہستی کے دشمن بھی مانتے تھے کہ اس نے زندگی بھر جھوٹ نہیں بولا، اور وہ صادق اور امین ہے، اُس نے عین الیقین یعنی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتایا ہے کہ وہاں کس کس پر کیا بیتتی ہے۔ اس لیے آخرت کے عذاب و ثواب کو ماننا ہی پڑتا ہے۔

حدیثِ قدسی کے الفاظ ہیں کہ اللّٰہ کے دوستوں میں سے وہ قابلِ رشک ہے:

۱ جس کے پاس مال و عیال کم ہو۔
۲ نمازوں کا حصّہ وافر رکھتا ہو۔
۳ اپنے رب کی عبادت اچھے انداز میں چھپ کر کرتا ہو۔
۴ لوگوں میں گُمنام ہو اور اُس کی طرف اُنگلیوں سے اشارہ نہ کیا جاتا ہو۔
۵ اس کا رزق بھی گزارے کا ہو اور وہ اُس پر صبر بھی کرے۔
۶ اس کی موت جلد آ جائے۔
۷ اُس پر رونے والے کم ہوں۔
۸ اُس نے وراثت بھی کم چھوڑی ہو۔

میں رات کو بستر پر لیٹا تو اس حدیثِ قدسی کی روشنی میں چاچا سلطان کو پرکھا۔ فوز العظیم کی خوشخبری کا یہ جگمگ جگمگ کرتا جامہ اُس کے کمزور اور منحنی بدن پر پُورا آیا۔ میں گواہ تھا کہ وہ مال و عیال کم رکھتا تھا۔ نماز میں اُس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ وہ عبادت اچھے انداز میں اور شب بیداری چُھپ چُھپ کر کرتا تھا۔ اتنا غیر اہم اور گُمنام تھا کہ اُس کے گاؤں کے سب لوگ بھی اُسے نہ جانتے تھے۔ اُس کے بیٹے اور بہوئیں بھی اُسے کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتی تھیں؛ حالانکہ وُہ جو کچھ کماتا، اُنہیں کھلا دیتا تھا۔ وہ زراعت باغبانی اور مویشی بانی میں ٹیکنوکریٹ تھا لیکن وہ اس پیشے سے محض اتنا ہی رزق حاصل کرتا تھا جتنا اُس کے لیے کافی تھا۔ رُوکھی روٹی اور سُرخ مرچیں مزے لے لے کر کھاتے اور الحمد للّٰہ الحمد للّٰہ کہتے میں نے خود اُسے دیکھا تھا۔ اُس کی موت بھی ایک رات کی بیماری کے بعد آ گئی۔ رونے والے اُس پر تھے ہی نہیں۔

چاچا ستر پچھتر سال کی عمر میں مرا تھا بیٹے اور بہوئیں بھی کہہ رہی تھیں: "الحمد للّٰہ جھنگ باغ چھوڑ کر مرا ہے، ہم نے خود اپنے ہاتھوں دفن کیا ہے۔" اور سب سے آخر لیکن سب سے بڑھ کر اُس نے وراثت میں صرف ایک لحاف، بوسیدہ پوشیدنی کپڑے، ٹوٹی ہوئی دیسی جُوتی، مٹی کا گھڑا اور پیالہ، چارپائی اور ایک پلیٹ چھوڑی۔ کچی جھونپڑی اُس کی ملکیت نہیں تھی کیونکہ وُہ جس زمین پر بنی تھی، وہ زمیندار کی ملکیت تھی۔

اسی ادھیڑبُن میں، میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ دُنیا کا بے بس ترین انسان عالمِ آخرت میں نئی سج دھج اور آن بان میں ہے۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ دریائے چناب جیسی ندی کا مشرقی کنارہ ہے۔ ایک اُونچا ٹیلا ہے جو مٹی کا نہیں بلکہ مُشک یا مونگے کا ہے۔ اُس پر

درخت بھی سُنہری ہیں اور اُن کے پتے بھی سُنہری۔ اُن پر بیٹھے خوبصورت پرندے استقبالیہ انداز میں بولیاں بول رہے ہیں، شیریں نغمے الاپ رہے ہیں۔ پس منظر میں ندی کے اندر قرمزی رنگ کا پانی عجیب انداز سے بہہ رہا ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ کی لہریں ہلکورے لے رہی ہیں۔ ندی کے اُس پار ایک ایسی شاداب وادی کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے جیسے کاغان اور سوات کی وادیاں اُس کا غیر حقیقی عکس ہو۔ چاچا سلطان، سر پر سُنہری تاج پہنے، سُرخ اور سفید نورانی چہرے کے ساتھ ٹیلے پر چہل قدمی کر رہا ہے اور فاتحانہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا ہے۔ رنگ و بُو کے اس ماحول میں اُس کی مانوس مُسکراہٹ ہونٹوں پر بہت نمایاں نظر آ رہی ہے۔ اُس کا جامہ اتنا دیدہ زیب ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ پھٹے پُرانے کُرتے والا یہاں یہ کیا پہنے پھرتا ہے۔ اُس کی ٹوٹی جُوتی کے بجائے اُس کے پاؤں کا پہناوا سونے چاندی کا بنا ہُوا لگتا ہے۔ وہ استغنا اور اطمینان اُس کے چہرے پر ہویدا ہوتا جو اس دُنیا میں کسی انسان کے چہرے پر ملنا ممکن ہی نہ ہو۔

مَیں خواب ہی خواب میں اس حقیقی انقلاب پر ششدر رہ جاتا ہُوں۔ کیا یہ سب کچھ اس حقیقی عالمِ رنگ و بُو میں بھی ممکن ہے کہ ایک نادار اور مسکین آدمی وہ جامہ پہنے جو نوّابوں اور ٹوانوں کو بھی نصیب نہ ہو۔ اس انقلاب کے فراق میں تو ہمارے حکما نے عمریں بتائیں، لاکھوں غازیوں نے شہید ہونا بخوشی قبول کیا اور

ہمارے شعرا نے تخیلاتی تانے بانے بُنے ؎

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے

لیکن کچھ بھی تو نہ ہو پایا تھا۔ ہُوا تو صرف یہ ہُوا کہ ؎

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور آج مَیں اپنے گاؤں کے ایک خاک نشین کو تاج پوشی کے عالم میں اتنی سج دھج سے دیکھ رہا تھا کہ رُوس اور امریکہ کے سربراہان بھی اُسے دیکھ پائیں تو رشک کرتے رہ جائیں۔ میرے دِیدے پتھرا گئے۔ مَیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ سب کچھ مَیں خواب میں دیکھ رہا ہُوں۔ عالمِ حقیقت میں ایسے انقلاب بھلا کیوں کر ممکن ہیں؟

یہ خیال جیسے ہی ذہن میں پیدا ہُوا؛ چاچا سلطان عجیب تمکنت آمیز چال چلتا میرے قریب آیا اور فلسفیانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہُوا: "یہ بھی عالمِ حقیقت ہی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم اُدھر اُس دُنیا میں (انگلی سے دُور دریائے راوی کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے) اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ عین الیقین سے مشاہدہ کریں تو یہاں بھی ایک امرِ حقیقت نظر آتی ہے۔ ویسے اُس دُنیا میں بھی یہ انقلاب کئی مرتبہ آئے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے سلمانؓ فارسی، صہیبؓ رُومی اور بلال حبشیؓ غلام بن کر بکے لیکن ایمان اور عمل کی بدولت رُوم، شام اور فارس کے گورنر بنے۔ یہ حقیقی انقلاب اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کی بدولت دنیائے فانی میں رہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

خواب میں ان پڑھ چاچا سلطان کی زبان سے عالمانہ، فاضلانہ اور مؤرخانہ باتیں سُن کر مَیں دہشت زدہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ چِٹّا ان پڑھ تھا اور نماز، درود شریف اور آیۃ الکرسی کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسی کیفیت کے زیرِ اثر میری آنکھ کھُل گئی۔

مَیں دیر تک سوچتا رہا کہ چاچا سلطان اللہ کا پسندیدہ انسان تھا۔ اب عالمِ خواب میں اپنی آنکھوں سے اُس کا نیک انجام دیکھ کر مَیں اس حدیثِ قدسی کی صداقت کا چشم دید گواہ بن سکتا ہُوں کہ نہیں؟ منطق کا فیصلہ اس بارے میں کیا ہے؟

نماز ہر آدمی پر ساری عمر تک کے لیے فرض ہے۔ (معارج ۲۳)

ٹنڈر نوٹس

زیرِ دستخطی کو منظور شدہ فرموں / ٹھیکیداروں ڈیپارٹمنٹ ہذا سے درج ذیل کاموں کے لیے فیصد / آئیٹم ریٹس پر سربمہر ٹنڈر مطلوب ہیں ٹنڈرز ۸۵-۶-۵ کو ۱۱ بجے صبح تک وصول کیے جائیں گے جو کہ اسی روز اُسی وقت مقررہ وقت پر موجود فرموں / ٹھیکیداروں یا ان کے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ زرِ ضمانت بصورت رسیدی بنک ڈیپازٹ کال / چالان خزانہ پیش کرنا ہوگا۔ ورنہ ٹنڈر دستاویزات جاری نہیں کی جائیں گی۔

ٹنڈر فارم ۸۵-۶-۴ کو دفتری اوقات کے دوران ایسے ٹھیکیداروں / فرموں کو جاری کیے جائیں گے جو موجودہ مالی سال ۸۵-۱۹۸۴ء کے لیے جمع شدہ اندراج / تجدید فیس رسید کے پیش کرنے کے علاوہ ضروری ثبوت اندراج / تجدید بھی پیش کریں گی۔ ٹنڈر مجوزہ فیس (ناقابلِ واپسی) کے نقد ادا کرنے پر جاری کیے جائیں گے۔ مشروط / بذریعہ تار ٹنڈر قابلِ غور نہیں ہوں گے۔

تصریحات / ڈرائینگز دفتر زیرِ دستخطی میں کسی روز دفتری اوقات کے دوران حاصل کی جاسکیں گی۔ ماسوائے مندرجہ بالا مقررہ تاریخ کے کوئی ٹنڈر جاری نہیں کیا جائے گا۔ زیرِ دستخطی بغیر وجہ بتائے کسی یا تمام ٹنڈروں کو منظور یا مسترد کر دینے کے مکمل مجاز ہوں گے۔

نمبر شمار	تفصیل کام	اندازاً لاگت	زرِ ضمانت	مدتِ تکمیل
۱	رورل واٹر سپلائی سکیم چک نمبر ۳۳۴ / گ ب ا۔ تعمیر آر سی سی اوور ہیڈ ریزر وائر ۱۰،۰۰۰ گیلن استعداد۔	۲۰۰،۰۰۰/- روپے	۴،۰۰۰/- روپے	۴ ماہ
۲	رورل واٹر سپلائی سکیم گڑھ ا۔ تعمیر اوور ہیڈ ریزر وائر ۵۰،۰۰۰ گیلن استعداد۔	۷۵،۰۰۰/- "	۱۵۰۰/- "	۶ "
	ii۔ ڈسٹری بیوشن سسٹم ۔ فراہمی اور بچھائی اے سی پائپ لائن ۱۰"، ۸" اور ۶" آئی / ڈی۔	۲۵۰،۰۰۰/- "	۵،۰۰۰/- "	۳ "
	iii۔ فراہمی بچھائی پی وی سی پائپ ۳" اور ۴" آئی / ڈی۔	۲۷،۵۰۰/- "	۵،۵۰۰/- "	۳ "
۳	اربن توسیعی واٹر سپلائی سکیم سمندری۔ ا۔ ڈسٹری بیوشن سسٹم ۔ فراہمی اور بچھائی پی وی سی پائپ لائن ۶" اور ۴" آئی / ڈی	۲،۰۰،۰۰۰/-	۴،۰۰۰/-	۳ "

ایگزیکٹو انجینئر

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن۔ فیصل آباد

آئی پی ایل: ۳۵۱۶

جینٹلمین، بِسمِ اللہ ___ جینٹلمین، الحمدُ لِلّٰہ

دو شگفتہ کتابوں کا تعارف

ڈاکٹر اقتدا حسن

اسٹالن کے مرنے کے بعد جہاں خروشچیف نے اُس کی مٹّی پلید کی، وہاں اُس کی جنم بُھومی سے متعلّق ایک لطیفہ بھی رُوس میں عام ہُوا ___ کہ گرجستان (جورجیا) کے لوگ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالیں اُسے کچھ ایسے ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ پھر کرنے دھرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان فرنگی دانشوروں سے اللہ سمجھے کہ فوجیوں کے بارے میں بھی وہ کچھ ایسے ہی واہمے کا شکار ہیں اور اس بے زبان مخلوق سے متعلّق ان خُدائی فوجداروں نے ایسی ایسی گُل فشانیاں کی ہیں کہ جنہیں اپنے سردار جی بھی سُنیں تو شرما جائیں۔ مثلاً کوئی انگریز مدبّر یا مفکّر ایک بڑی سی بلڈنگ میں گئے، سامنے ایک بورڈ پر 'ملٹری انٹیلی جنس' لکھا دیکھ کر چونکے اور بے ساختہ ارشاد فرمایا:

WHAT A CONTRADICTION OF SORTS. یعنی موصوف کے نزدیک ملٹری کا انٹیلی جنس (ذہانت) سے بھلا کیا واسطہ!

خیر اگر ولایت میں ایسا ہے تو ہُوا کرے۔ پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اب ہماری فوج ہی کو لیجیے، سیاست کے میدان میں اس نے جو جھنڈے گاڑے ہیں تو بڑے بڑے شہ زوروں سے اپنا لوہا منوا لیا۔ انتظامیہ میں دیکھیے تو انگریز کی ساختہ پرداختہ سول سروس اسی کا مُنہ دیکھ دیکھ کر جیتی ہے۔ رہ گئی تھی ایک قلم کی مار' سو اس میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں۔ سنجیدہ نگاری میں مرحوم جنرل اکبر (رنگروٹ) نے جو روایت قائم کی تھی اُسے مرحوم ایوب خاں (اب الطاف گوہر لاکھ کریڈٹ لیں لیکن نام تو مصنّف ہی کا چلے گا۔) بریگیڈیئر گلزار، جنرل عتیق الرّحمٰن، جنرل فضل مقیم، جنرل موسیٰ، جنرل شیر علی، جنرل شاہد حامد، کرنل غلام سرور اور کرنل صدّیق سالک جیسے منجھے ہُوئے قلمکاروں نے آگے بڑھایا۔ (کئی اور بھی صاحبِ سیف اہلِ قلم ہیں جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں۔) البتّہ شگفتہ نگاری میں ہمارے فوجی ذرا کمزور پڑ رہے ہیں۔

اِس بحث میں پڑے بغیر کہ مزاح کا عنصر کس کے ہاں طبع زاد ہے اور کتنا ماخوذ، میری ناچیز رائے میں ڈاکٹر شفیق الرّحمٰن (جنرل ہیں یا ایڈمرل اس کا فیصلہ وہ خود کرلیں، ہم تو اُن کی کرنیلی پر لہلوٹ ہیں) سیّد ضمیر جعفری اور کرنل محمّد خاں کے پائے کا اور کوئی مزاح نگار ہماری فوج سے اُبھر کر سامنے نہیں آیا۔ ویسے کرنل صدیق سالک کے ہمہ رنگ قلم سے جہاں کہیں پھُول جھڑتے ہیں وہاں کانٹوں کی چُبھن بھی صاف محسُوس ہوتی ہے۔ ایک اور نام کرنل مرزا حسن خاں (فاتحِ گلگت) کا ذہن میں آتا ہے، جن کا حال ہی میں انتقال ہُوا ہے۔ مرحوم کی جو تحریریں اُردو ڈائجسٹ میں چھپ رہی ہیں یا جو مسوّدے میری نظر سے گزرے اُن میں زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ طنز اور مزاح کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ افسوس پنڈی سازش کیس میں ملوّث ہونے کی وجہ سے اُن کا باغ و بہار قلم خزاں کی لپیٹ میں آگیا اور اپنی زندگی میں اُنہیں وہ ادبی مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

فوج کے اُبھرتے ہُوئے شگفتہ نگاروں میں دو نام اتنے پُرانے نہیں۔ ایک میجر صولت رضا (کاکولیات) اور دُوسرا کیپٹن اشفاق حسین کا، جن کی دُوسری کتاب 'جنٹلمین ___ الحمدُ لِلّٰہ' غالباً چھپ تو پچھلے سال گئی تھی لیکن مارکیٹ میں ایک برس بعد ہے۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے عطاء الحق قاسمی نے کہیں لکھا تھا کہ ایک صاحب کو 'ایک آمد' پڑھ کر کرنل محمّد خاں سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا ___ کہ اتنے میں دوسری کتاب آگئی۔ مجھے بھی خواہش ہُوئی کہ اشفاق صاحب کے ساتھ بھی کہیں یہی واردات نہ ہو۔ چنانچہ ان کی پہلی کتاب 'جنٹلمین ___ بسم اللہ' منگوا کر پڑھی اور سکون کا سانس لیا کہ دونوں کتابیں زبان و بیان کے ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہیں۔

عنوانات کے اس اینگلو عرب' سنجوگ کا عقدہ یُوں کھلا کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی' کاکول میں ایک مخصوص دعوتِ طعام ہوتی ہے جو 'بٹالین گیسٹ نائٹ' کے نام سے موسوم ہے۔ ظاہر ہے ایک عدد مہمانِ خصوصی بھی اس کے لیے مدعو کیے جاتے ہیں اور ادھر مرغ و ماہی پر اُن کی توجّہ مبذول ہُوئی کہ اُدھر اُنھی کی میز سے ایک آواز اُٹھی:

"جنٹلمین ___ بسم اللہ!"

یہ گویا بزن کا اعلان ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے افسرِ اعلیٰ کی تقلید میں تمام حاضرینِ محفل یعنی جنٹلمین کیڈٹ' چھری کانٹوں سے لیس ہو کر میدانِ کارزار میں ٹُوٹ پڑے۔ اور یہ معرکہ اُسی وقت سرد پڑتا ہے جب مہمانِ خصوصی کی میز سے "سیز فائر" کا حکم صادر ہوتا ہے جیسے مقامی زبان میں کہتے ہیں 'جنٹلمین، الحمدُ لِلّٰہ!' ہیں مگر ہوتا ہے کچھ ایسا نادر شاہی کہ جو ہاتھ کی گرفت میں آیا ہُوا نوالہ بھی بس مُنہ کا مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ مُصنّف کے ذہنِ رسا کی داد دیجیے کہ اُس نے ایک ہی دسترخوان سے اپنے کام کے دو عنوان اُچک لیے اور دیکھنا یہ ہے کہ اب اس کی نظرِ کرم کس پر ہوتی ہے۔

عنوانات کے اس پوسٹمارٹم سے یہ تو واضح ہو گیا کہ مُصنّف نے اپنی فوجی زندگی کی بُوقلمونیوں کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ مزید یہ کہ پہلی کتاب میں عسکری تربیت کے تلخ و شیریں تجربات کا بیان ہے اور دُوسری میں افسرانہ وارداتیں۔ کاکول کا وہ 'سنگلاخ' ماحول جہاں سینما جانے اور فلم دیکھنے کے بھی اصول مقرّر ہیں اور بقول مصنّف مقصد اس ڈرل کا یہ ہے کہ کیڈٹ کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ تفریح کے لمحات بھی کسی ضابطے کے پابند ہوتے چاہییں۔ بے خودی اور سرشاری کے عالم میں بھی ایک فوجی کو عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ ایسے خارزار سے اگر کوئی پھُول کِھلا ہُوا نکلے تو اسے ہم پتّھر میں جونک لگانا ہی کہیں گے۔ بات بظاہر بڑی عجیب ہے کہ انسان جائے فوجی تربیت کے لیے جہاں بات بات پر اُٹھک بیٹھک ہوتی ہو اور نکلے وہاں سے وہ ظرافت کی پھُلجھڑیاں چھوڑتا۔ صاف ظاہر ہے کہ توپ و تفنگ کی گھن گرج میں بھی انسان کی حسِّ ظرافت مر نہیں سکتی' بلکہ شاید اس ماحول کا یہ بھی تقاضا ہے کہ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے رزم، ہنستے کھیلتے سختیاں جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ جبھی تو قدم قدم پر وہاں ایسے چٹکلے تخلیق ہوتے ہیں:

"آج ناشتے میں کبوتر تو نہیں کھائے آپ نے؟"

حیرت سے: "نہیں صاب۔"

"جمپ کرتے ہُوئے کوئی بِلّی تو نظر نہیں آئی آپ کو؟"

مزید حیرت سے: "نہیں صاب۔"

ایک دہاڑ: "تو پھر جمپ کرکے آنکھیں یُوں بند کیوں کرتے ہیں جیسے بِلّی کو دیکھ کر کبوتر کرتا ہے؟"

یا پھر ___

"صاب ___ آپ بقیدِ حیات ہیں؟"

"جی صاب۔"

"دل ٹھیک کام کر رہا ہے آپ کا؟"

"بالکل۔"

"سانس کا رشتہ باقی ہے؟"

"ظاہر ہے"

ایک چنگھاڑ: "صاب، ظاہر ہی تو نہیں۔ آپ تو یوں جمپ کرتے ہیں جیسے گیٹ سے کوئی مُردہ نکلا ہو۔"

اور جب واجبی سی تعلیمی شُد بُد رکھنے والے 'ہوا بردوش' اسٹاف کی قادرالکلامی کا یہ حال ہو تو اُن کے تربیت یافتہ، پڑھے لکھے مستقبل کے افسر بھلا تیر و نشتر کے اس میدان میں بھی کسی سے کیوں پیچھے رہنے لگے۔

انسان کو حیوانِ ظریف کہا گیا ہے لیکن طنز و مزاح نے ابوالکلام کی چائے کی طرح بڑا نازک مزاج پایا ہے۔ صاف شفّاف پانی، مناسب آنچ، چائے چینی کا لطیف امتزاج' ایسا امتزاج جس میں شکر کی شیرینی اور چائے کی تلخی دونوں کا اپنا اپنا لُطف موجود ہو، خوشنما ارغوانی رنگ اور اس میں سے اُٹھتی ہُوئی مسحُور کُن لپٹیں —— اور پھر اُن کے ہاں تو پینے کے بھی آداب ہیں کہ چھوٹا سا حسین فنجان ہو اور صبح کا سہانا سماں۔

مزاح کی 'چائے' بھی نہایت لطیف' خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہے۔ اس کے اپنے لوازمات ہیں، تخلیق کے اپنے آداب ہیں اور لُطف اندوز ہونے کی اپنی ایک فضا۔ اس میں جو طنز کی آمیزش ہے وہ بھی چائے کی تلخی کی طرح کیف و سرور دوبالا کرنے کے لیے، جس سے نہ بدمزگی ہوتی ہے، نہ طبیعت پر گرانی۔ ہر اچھا مزاح نگار ان مبادیات کو سمجھتا ہے، اپنے ظرف اور ذوق کے مطابق ان سے بہرہ ور ہوتا ہے اور دُوسروں کو اپنے تجربات میں شامل کر کے خود بھی مسرور ہوتا ہے اور ہم جیسے روتے بسورتوں کو گدگدا، گدگدا کر زندگی کی تلخیاں جھیلنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ (اور بھی ارفع و اعلیٰ مقاصد سُننے میں آتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسی روایات خاصی ضعیف ہیں۔)

کیپٹن اشفاق حُسین (جو اُمید ہے اب تک میجر کے متوقّع 'پھول' سے سرفراز بلکہ 'گل بردوش' ہو چکے ہوں گے) پڑھے لکھے ذہین جوان بلکہ ماشاءاللہ نوجوان ہیں۔ صحافت اور انگریزی کے ایم اے ہیں۔ فوج کے خارزار میں پھول کِھلاتے ہیں، یہی ان کا بڑا کمال ہے۔ ان کے ہاں شوخی اور شگفتگی ہے۔ ہلکا پُھلکا اندازِ بیان ہے، پڑھنے والوں کو وہ گُدگداتے بھی ہیں لیکن ایک سُلجھے ہُوئے مزاح نگار کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کے لیے اُنہیں ابھی اور محنت کرنی ہوگی۔ اپنی تحریر میں کچھ اور رچاؤ، تھوڑا سا اور تیکھاپن پیدا کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو سرور میں تولاتے ہیں لیکن پھر اُسے خلا میں ٹانک ٹوئیاں مارتا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیف و سرور کے ان لمحات میں صحت بخش اضافے سے تحریر کے حُسن میں تو نکھار آئے گا ہی، مجموعی تاثر بھی زیادہ بھرپُور ہو جائے گا۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کی دُوسری کتاب 'حُسنِ صُورت اور سیرت' دونوں اعتبار سے پہلی سے بہتر ہے۔ البتہ انہیں ایسی تفصیلات سے گریز کرنا چاہیے جو شگفتگی اور مزاح دونوں کے مزاج پر گراں ہیں۔ مثلاً 'لاجواب پرواز' جو اُردُو ڈائجسٹ میں بھی چھپ چُکا ہے۔ وہ حساب کتاب اور حوالہ جات سے ہٹ کر اگر صرف ان کے ذاتی مشاہدات اور تاثرات تک محدُود رہتا تو زیادہ بے ساختہ اور اثر انگیز ہوتا۔

اسی کتاب میں دو چار اور بھی چھوٹی موٹی غلطیاں ہیں جن کی اصلاح اگلے ایڈیشن میں ہو جائے گی۔

صفحہ ۷۰ پر ایک جگہ 'غصّے کی پرکالی' ہے، محاورے میں اُردو غزل کے محبوب کے لیے 'آفت کا پرکالہ' مستعمل ہے لیکن ریختی میں جہاں مخاطب کی صنف واضح ہے 'آفت کی پرکالہ' بھی آیا ہے۔ یہاں 'غصّے کی تیز' یا 'جاہ و جلال کا مُرقع تھی' آنا چاہیے۔

صفحہ ۷۹ پر کشمیر کے بارے میں ہے: "بدقسمتی سے ریاست کی باگ ڈور ایک سکھ کے ہاتھ میں تھی۔" مہاراجہ سکھ نہیں، ہندو ڈوگرہ راجپوت تھا۔

صفحہ ۱۴۶ پر 'موگا دیشو کے جزائر' ہے۔ 'موغادیشو' مالیہ کا دارالحکومت ہے۔ مُصنّف کی مراد بحرِ ہند میں واقع یگو گارسیا کے جزیرے سے ہے۔

صفحہ ۱۹۸ پر ورڈز ورتھ کے حوالے سے "ڈسٹرکٹ لیک" لکھا ہے، جسے 'لیک ڈسٹرکٹ' ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۰۹ پر لیفٹیننٹ جنرل نیازی کی سرکاری گاڑی کو چار ستاروں سے مُزیّن کیا گیا ہے، اس میں ایک ستارہ زائد ہے۔ (سُورج کو غالباً ایسے ہی موقعوں پر چراغ دکھایا جاتا ہے!)

چلتے چلتے کچھ غالبِ خستہ کا بیاں ہو جائے، اور اس کی شانِ نزول بھی غالب کا ایک شعر ہے جو اشفاق صاحب نے دریافت کیا ہے۔

جب سے ہم نے شغلِ بیکاری اپنایا ہے۔ ہماری بیوی کی زبان پر (جو بھلے وقتوں میں کبھی کبھی رفیقۂ حیات بھی بن جاتی تھیں) یہ مصرع کچھ زیادہ ہی وارد ہونے لگا ؏

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

اور ہم اَن سُنی کرتے ہُوئے بھی اس کو سُننے پر مجبُور تھے۔ پھر جب ایک مصرع ہی بھرپُور اور حسبِ حال ہو تو دُوسرے کی تلاش سے اپنی رُسوائیوں میں اضافہ کرنے کی ضرورت بھلا کسے ہوگی۔ اسی خیال سے ہم نے اس کا تردّد ہی نہ کیا۔ خُدا بھلا کرے اشفاق صاحب کا، اُنہوں نے ہماری یہ مشکل آسان کی اور پُورے کا پُورا شعر فراہم کر دیا۔ ذرا ملاحظہ ہو ؎

بٹھا کے یار کو پہلو میں رات بھر غالب
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

سیاق و سباق کے حوالے سے ہم نے اشفاق صاحب کی یہ دریافت جب اپنی بیگم کے حضور پیش کی تو پہلے تو وہ چونکیں پھر بھنائیں اور بس اتنا کہہ کر اپنا پیچھا چھُڑا لیا کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہو سکتا۔

شعر غالب کا ہو یا نہ ہو، اتنی بات ضرور ہے کہ اب اس واہیات مصرع سے ہمارا پیچھا چھُوٹ گیا۔

پاکستان ریلویز ۔ ہیڈ کوارٹرز آفس، لاہور

نوٹس

اپرنٹس سب انجینئر (وے) / بی ایس - ۱۱ کی پاکستان ریلویز میں ۲۴ اسامیوں کے پُر کرنے کے لیے پاکستانی شہریت کے حامل موزوں اُمیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کل پاکستان کی بنیاد پر	پنجاب بشمول فیڈرل ایریا	سندھ بشمول کراچی	سرحد	قبائلی علاقے	بلوچستان	کُل
۲	۱۲	۵	۲	۲	۱	۲۴

(باقی اگلے صفحے پر)

کم از کم تعلیمی قابلیت : ڈپلومہ ہولڈر سول انجینئرنگ منظور شدہ ادارہ۔

عمر : ۸۵-۶-۲۰ کو ۱۸ اور ۲۵ سال کے درمیان۔ زائد عمر میں ۳ سال تک رعایت بصورت امیدواران پسماندہ علاقہ جات ہوگی۔

تنخواہ : بی پی ایس - ۱۱ - (۷۰۰ - ۳۵ - ۱۴۰۰ روپے) بشمول دیگر الاؤنسز / فوائد بمطابق مجوزہ ایمپلائز رولز۔

تربیت / وظیفہ : اس طرح منتخب شدہ امیدواروں کو ۱۸ ماہ کی مدّت کے لیے تربیت پر رہنا ہوگا۔ انہیں ۷۰۰/- روپے ماہانہ کے علاوہ دیگر مجوّزہ الاؤنسز بھی بطور وظیفہ ان کی تربیت کی مدّت کے دوران دیے جائیں گے۔

درخواستیں دینے کا طریقہ : درخواستیں مجوزہ فارموں پر جو کہ ۱/- روپیہ فی فارم کے نقد ادا کرنے پر پاکستان کے تمام بڑے بڑے اسٹیشنوں سے حاصل کرسکتے ہیں، چیف پرسانل آفیسر، پاکستان ریلویز، ہیڈکوارٹرز آفس شاہراہِ عبدالحمید بن بادیس لاہور کے نام بوساطت نزدیک ترین دفتر روزگار بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کرنی ہوگی، اس طرح کہ یہ ایڈریسی کو ۸۵-۶-۳۰ تک پہنچ جائیں۔

سلیکشن : بھرتی مندرجہ بالا مختلف علاقہ جات کے لیے مخصوص کوٹے کے مطابق علاقائی بنیادوں پر ہوگی۔ ٹیسٹس / انٹرویوز ڈویژنل ہیڈکوارٹرز آفس پاکستان ریلویز میں ہوں گے۔ درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۸۵-۶-۲۰ ہے۔ ریلوے سروس کی گارنٹی نہیں دی جاتی۔

(ارشاد احمد شیخ)

جنرل مینجر (پرسانل)

پی آئی ڈی (لاہور) ۵۱۰۶

برکت والی دونی

تاریخِ مغلیہ کا ایک ایمان افروز واقعہ۔

اُمِّ اعزاز

وہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۶۱ء کے ساون کی ایک رات تھی چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ گھور اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بجلی کی چمک آنکھوں کا نور اُچکے لیے جاتی تھی۔ کڑک گرج سے دل سہمے ہوئے تھے۔ ہوا کے کوڑوں سے تناور درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کمبل میں لپٹا گلی گلی، کوچے کوچے، بازار بازار پھر رہا تھا۔ بارش، ہوا سے بے نیاز، گرج چمک سے بے خوف جیسے کسی کی تلاش میں ہو، کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ نورانی چہرہ، تل چاولی ڈاڑھی سادہ مگر صاف ستھرا لباس، بنے سنورے بال، باوقار چال ___ وہ دیوانہ تھا نہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر ___ وہ تنگ سی گلی سے نکل کر بازار میں آیا، چوک میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ سوچا اور پھر ایک گلی میں گھس گیا۔ ایک دو منزلہ مکان کے نیچے دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور آگے کو چل دیا۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ سرکاری لالٹین کی روشنی میں اُس کا سراپا صاف نظر آرہا تھا۔ چھریرے، ستھرے لباس اور حلیے سے وہ معمولی آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ زوردار کڑک سے درو دیوار گونج اُٹھے۔ ساتھ ہی بوندوں پانی پڑنے لگا۔ وہ اطمینان سے کھڑا بھیگتا رہا۔

دفعتہً سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ ایک فکرمند آواز اندھیرے میں اُبھری:

"بڑے میاں! مزدوری کیجیے گا؟"

"جی ہاں، کیوں نہیں؟" اُس نے لپک کے جواب دیا جیسے وہ اسی مقصد سے وہاں کھڑا تھا۔

"ہماری چھت ٹپک رہی ہے۔ مٹی ڈال کے ٹھیک کردیجیے۔" پکارنے والے نے دروازہ پورا کھولتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا!" اور مٹی سے بھرا ہوا تسلا اور کھرپا وغیرہ لے کر اُوپر چڑھ گیا۔

دھواں دھار بارش اور تند و تیز ہوا میں وہ بڑی

محنت اور جفاکشی سے مٹی ڈالتا اور کھُرپے سے ٹھوک ٹھوک کر مضبوط کرتا رہا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں چھت ٹپکنی بند ہوگئی۔ اتنے میں مؤذن کی آواز کان میں آئی۔ اُس نے کھُرپا ہاتھ سے رکھ دیا اور وہ مؤذن کے ساتھ اذان کا ہر کلمہ دوہراتا رہا۔ جب اذان ختم ہوگئی تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی۔ پھر صاحبِ خانہ سے کہا:

"جناب! آپ کا کام ختم ہوگیا ہے۔ اب اجازت دیجیے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ احسان مندی کے بوجھ سے جُھکا جارہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک دوتی نکالی اور بڑی لجاجت سے کہا: "اس وقت میرے پاس بس یہی ایک دوتی ہے۔ صبح کو دُکان پر آئیے اور مُنہ مانگی مزدوری لیجیے۔"

"یہی دے دیجیے، مَیں پھر حاضر نہیں ہوسکتا۔"

دولت مند صاحبِ خانہ نے بڑا ہی اصرار کیا کہ وہ صبح کو دُکان پر آئے لیکن وہ نہ مانا اور یہی کہتا رہا: "یہی دوتی دے دیجیے۔ نہیں تو بندہ چلا۔" سیٹھ نے دوتی ہتھیلی پر رکھ دی اور وہ سلام کرکے باہر نکل گیا۔

مزدور برِصغیر پاک و ہند کا مشہور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا اور سیٹھ دلّی کا بنیا اُتم چند۔ اس واقعے کے چند روز بعد شہنشاہ نے اپنے اُستاد مُلّا احمد جیون کو لکھا:

"..... بندۂ ضعیف ہندوستان ایسے وسیع و عریض ملک کی حفاظت کے بارِ گراں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا ایک لائحۂ عمل ہے۔ کتاب اور سُنّت ہر دم پیشِ نظر رہتی ہے، تاہم طمانیتِ قلب اور اس عظیم ذمے داری کی بطریقِ احسن انجام دہی کے لیے دُعا کا خواستگار ہوں اور مُستدعی ہوں کہ دلّی تشریف لاکر خاکِ پا کو شرفِ ملاقات سے سرفراز فرمائیں۔"

مُلّا صاحب نے جواب میں لکھا:

"فرزندِ دل بند اورنگ زیب! وعلیکم السلام۔

مَیں دن رات تمھارے لیے دست بہ دُعا رہتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمھیں عظیم ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ تم جانتے ہی ہو یہاں ہزاروں تشنگانِ دینِ الٰہی اصحابِ صُفّہ کی طرح نیازمند سے وابستہ ہیں۔ رمضان میں مکتب بند ہوگا، تو تم سے ملنے کے لیے سفر کروں گا۔"

رمضان کی سات تاریخ تھی۔ اورنگ زیب دربار سے فارغ ہوکر عصر کی نماز ادا کرنے مسجد گیا تو دیکھا کہ مُلّا احمد جیون وضو کررہے ہیں۔ وہ فوراً صفوں کو چیرتا حاضرِ خدمت ہوکر قدم بوس ہُوا۔ اُستاد نے اُٹھ کر سینے سے لگالیا۔ افطار کے بعد یہ دونوں اُستاد و شاگرد ایک دسترخوان پر بیٹھے، مٹّی کے برتنوں میں کھانا کھارہے تھے۔ رمضان بھر دونوں اکٹھے رہے۔ دربار میں تختِ طاؤس پر پہلو بہ پہلو بیٹھتے، نماز میں برابر کھڑے ہوتے۔ تراویح کے بعد دیر تک علمی اور دینی سلسلہ جاری رہتا جس میں اُس وقت کے اکابرین اور عُلما شریک ہوتے۔

عید سے تین دن پہلے جب مُلّا احمد جیون رخصت ہونے لگے تو عظیم المرتبت شہنشاہ نے ایک دوتی نذر گزاری۔ مُلّا صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے اُسے شرفِ قبولیت بخشا ــــ پھر اورنگ زیب اپنی عسکری مہمات میں مصروف ہوگیا۔

چودہ برس کی طویل غیر حاضری کے بعد جب وہ ۱۶۷۰ء میں دارالحکومت دلّی واپس آیا تو رعایا اور اعیانِ حکومت نے جشنِ مسرت منایا۔ کئی دن دھوم دھڑکا رہا۔ گھر گھر شادیانے بجے۔ دیوار دیوار چراغاں ہُوا۔ سونا چاندی خوب لُٹا۔ جشنِ مسرت سے فرصت ملی تو حکومت کے کاروبار کی طرف متوجہ ہُوا۔ ایک دن دیوانِ خاص میں بیٹھا عرضی پرچے دیکھ رہا تھا کہ وزیرِ اعظم نے مؤدبانہ عرض کی:

"عالی جاہ! حضرت مُلّا صاحب بہت بڑے زمیندار ہوگئے ہیں۔ اجازت ہو تو لگان وصول کیا جائے؟"

"کون مُلّا صاحب؟" اورنگ زیب نے تعجب سے پوچھا۔

"حضور پیر و مرشد مُلّا احمد جیون صاحب!" وزیرِ اعظم ادب سے دوہرا ہوگیا۔

"حضرت قبلہ و کعبہ!" وہ قلم رکھ کر سوچنے لگا کہ درویش کو مال و دولت سے کیا نسبت؟ سونا چاندی تو اللہ والوں کے لیے سانپ بچھّو ہوتے ہیں۔ یقین نہیں آرہا تھا اُسے وزیرِ اعظم کے بیان پر۔ اُس نے وزیرِ اعظم کو دیکھا۔ وہ گھبرا کر فوراً ہی آداب بجالایا:

"سچ عرض کررہا ہوں اعلیٰ حضرت! صدر الصدور سے دریافت فرمالیجیے۔"

"نہیں، ہمیں کسی سے پُوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم حضرت قبلہ و کعبہ سے معلوم کریں گے۔" اُس نے ایک عرضی پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

اگلے دن مُلّا احمد جیون کی طلبی کا فرمان جاری کیا گیا۔ حکمِ شاہی کی تعمیل میں وہ تیسرے دن حاضر ہُوئے۔ موٹے کھدر کا سادہ لباس، انداز و اطوار کی وہی سادگی۔ چہرے پر وہی بزرگانہ شان و جلال۔ تموّل و تملّق کا دُور دُور پتا نہ تھا۔ لب و لہجے کی عاجزی و انکساری دیکھتے ہوئے اورنگ زیب کو اُن کی دولت مندی کے بارے میں استفسار کرنے کی جرأت ہی نہیں ہورہی تھی۔ ادب کے مارے تختِ طاؤس سے اُترا۔ لبِ فرش تک جاکر اُستاد کا استقبال کیا اور تخت کے برابر لاکر بٹھایا۔ مُلّا صاحب نے قدرے توقف سے پُوچھا:

"اے فرزند! کیا معاملہ درپیش ہے جو اس فقیر کو طلب کیا؟"

"زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ بس یُونہی ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔" اورنگ زیب ہچکچا گیا۔

"بے دھڑک اپنا مدعا بیان کرو، جھجکو مت۔" درویش کامل نے شاگرد کے تذبذب کو بھانپ لیا۔ اُن کی جرأت سے شہنشاہ کو بھی حوصلہ ہُوا۔ اُس نے بڑے ادب سے سوال کیا:

"قبلہ و کعبہ! مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ...." وہ پھر گھبرا گیا۔

"بولو نا بھئی ــــ کیا جاننا چاہتے ہو؟" مُلّا صاحب نے بارُعب آواز میں کہا۔

"مَیں آپ کے مال و دولت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں؟" شہنشاہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ مُلّا احمد جیون نے شاگرد کو بے پروائی سے دیکھا اور صاف آواز میں کہا: "یہ اُس دوتی کی برکت ہے جو تم نے مجھے نذر کی تھی۔"

"دوتی؟!! ..... میں نے دی تھی؟" بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں ــــ" مُلّا صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اُس دوتی سے مَیں نے بنولے خریدے اور کپاس کاشت کی۔ اللہ عزّوجل نے اس میں ایسی برکت دی کہ چند ہی برس میں مالا مال ہوگیا۔"

اورنگ زیب نے سارا ماجرا سُن کر درویش سے

روپیہ ــــ

سونے کا پلنگ خرید سکتا ہے، نیند نہیں۔
کتابیں خرید سکتا ہے، ذہن اور دماغ نہیں۔
غذا خرید سکتا ہے، اشتہا نہیں۔
خوبصورت چیزیں خرید سکتا ہے، خوبصورتی نہیں۔
مکان خرید سکتا ہے، گھر نہیں۔
دوائیں خرید سکتا ہے، صحت نہیں۔
سیر و تفریح کا سامان خرید سکتا ہے، خوشی نہیں۔
مذہب خرید سکتا ہے، بخشش نہیں۔
ہر جگہ کا پاسپورٹ رُوپے سے مل سکتا ہے لیکن جنّت کا پروانۂ راہداری نہیں۔

معذرت کی اور دونی کی داستان عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ مُلّا صاحب کے اشتیاق پر اُس نے خواجہ سرا کو حکم دیا:

"سیٹھ اُتم چند کو ۱۰۶۹ھ کے بہی کھاتے کے ساتھ حاضر حضور کیا جائے۔"

سیٹھ اُتم چند حکم شاہی سُن کر گھبرا گیا۔ ۱۰۶۹ھ کا بہی کھاتہ نکالا۔ جھاڑا پونچھا اور لرزتا کانپتا حاضر حضور ہُوا۔ سجدۂ تعظیم بجالانا چاہا۔ مُلّا صاحب نے بڑھ کر جھکتے کو تھام لیا اور کہا: "توحید پرست شہنشاہ نے سجدۂ تعظیم موقوف کر دیا ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر سوال و جواب کیجیے!"

شہنشاہ نے حکم دیا:

"۱۰۶۹ھ کے ساون میں جو کچھ خرچ ہُوا اُس کی تفصیل پڑھ کر سنائی جائے۔"

"بسر و چشم عالی جاہ!" اُتم چند نے بہی کھاتے کے ورق پلٹ کر ساون کے مہینے کے خرچ کی تفصیل نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے ایک جگہ رُک گیا۔ بادشاہ نے پُوچھا:

"رُک کیوں گئے؟"

"ظِلِّ سُبحانی!! یہاں ایک دونی درج ہے مگر اس کے وصول کنندہ کا نام درج نہیں۔"

"وصول کنندہ کا نام درج نہیں۔ سوچ کر بتاؤ یہ دونی تم نے کسے دی تھی؟" بادشاہ نے نرمی سے سوال کیا۔

"مہابلی! یہ لمبی چوڑی کہانی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔" بنیئے نے التجا کی۔

"اجازت ہے۔"

بادشاہ کی اجازت پا کر سیٹھ اُتم چند نے بیان کیا: "وہ ایک تاریک رات تھی اور چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ مکان جگہ جگہ سے ٹپکنے لگا تھا۔ قریب تھا کہ چھت بیٹھ جائے، مَیں نے گھبرا کر باہر جھانکا شاید کسی سے مدد لی جا سکے۔ سرکاری لالٹین کے پاس ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ مَیں نے اُسے مزدوری کے لیے بُلا لیا۔ اُس فرشتہ سیرت انسان نے موسلا دھار بارش میں بڑی محنت اور بہادری سے کام لیا اور تھوڑی دیر میں چھت مرمّت کر دی۔ اتنے میں اذان ہو گئی اور وہ نیک مرد جانے لگا۔

اعلیٰ حضرت! اُس وقت میرے پاس صرف ایک دونی تھی۔ وہی مَیں نے اُسے پیش کر دی اور صبح کو دُکان پر آنے کے لیے کہا۔ اُس نے دونی لے لی اور اصرار کے باوجود دُکان پر آنے کو تیار نہ ہُوا۔ دونی لے کر وہ ایسا غائب ہُوا کہ آج چودہ برس ہو گئے مَیں نے اُس کی شکل تک نہیں دیکھی ـــــ جانے وہ کون تھا۔ بھگوان اُسے خوش رکھے!"

"ہُوں! ٹھیک ہے۔ میر ساماں! سیٹھ اُتم چند کو خلعت فاخرہ پہنا کر رخصت کیا جائے۔" شہنشاہِ ہند نے کمال محبّت سے حکم دیا۔ جب سیٹھ اُتم چند خلعت پہن کر دربار سے چلا گیا تو مُلّا صاحب نے فرطِ محبّت سے بادشاہ کی پیشانی چُومتے ہُوئے کہا:

"شاباش بیٹا! تم نے کمال کر دیا۔ اسے کہتے ہیں حلال کی روزی ـــــ تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت دی ہے۔"

"یہ سب کچھ حضرتِ والا کا فیضِ نظر ہے۔ خزانۂ عامرہ سے اپنی ضرورت کے لیے کچھ نہیں لیتا۔" اورنگ زیب نے مُسکراتے ہُوئے کہا: "رات کے چاروں پہر مَیں نے یُوں تقسیم کر رکھے ہیں:

"اوّل پہر آرام کرتا ہُوں۔ دوسرا پہر روزی کمانے کے لیے وقف ہے۔ اس میں ٹوپیاں سیتا اور قرآن شریف لکھتا ہُوں۔ تیسرے پہر میں رعایا کی تکالیف اور مشکلات جاننے کے لیے بھیس بدل کر شہر میں گھومتا ہُوں۔ خداوند کریم کا شُکر ہے کہ اُس نے میرے فانی وجود سے اپنے ایک بندے کی ضرورت پُوری کرائی۔ یہ سب کچھ اُسی کی دی ہُوئی توفیق ہے۔"

مُلّا احمد جیون فرمانبردار شاگرد کا بیان سُن کر اتنا روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ■■

ڈی۔ ڈبلیو۔ ڈیوڈ

ترجمہ: مقبول ایچ خان

ایک خطرناک فوجی مشن

یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ مَیں ڈھاکہ میں رجمنٹل فارورڈ بیس ڈپو میں تعینات تھا۔ ایڈجوٹینٹ نے مجھے اور کپتان ایِن کو مُہر شدہ دو لفافے دیے جن پر "انتہائی خفیہ" کے الفاظ درج تھے۔

"مَیں آپ کے ہمراہ حفاظتی عملہ نہیں بھیج سکتا۔" ایڈجوٹینٹ نے کہا۔ "میرے پاس ایک بھی آدمی نہیں۔ مَیں نے جو کاغذات آپ کو دیے ہیں انہیں کمانڈنگ افسر کے پاس جلد سے جلد

چٹاگانگ پہنچانا اشد ضروری ہے۔ اُس کے ساتھ میرا وائرلیس کا رابطہ بھی نہیں۔ بس اب سارا دار و مدار تم دونوں ہی پر ہے۔"

دوسری عالمگیر جنگ زوروں پر تھی۔ سنگاپور جاپانیوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ ملایا پر جاپانیوں کی یلغار جاری تھی اور اُن کے فوجی دستے برما کے راستے آسام پر حملے کے لیے پر تول رہے تھے۔ درحقیقت مشرق میں آسام ہی اُن کے لیے ہندوستان میں داخلے کا دروازہ تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں کچھ سیاست دانوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں کے مقابلے میں جاپانی حملہ آوروں کو پسند کرتا تھا۔

ہمیں چٹاگانگ کا سفر ریل گاڑی کے ذریعے طے کرنا تھا اور ۲۰۰ میل کی یہ مسافت طے کرتے وقت درمیان میں ایک رات پڑتی تھی۔ اس پُرآشوب دَور میں یہ سفر خاص طور پر سفید فام اتحادیوں کے لیے نہایت خطرناک تھا۔ جگہ جگہ شر پسند چور ڈاکو اور انگریز دشمن انقلابی ریلوں کو روک کر مسافروں کو لُوٹتے اور سفید فام لوگوں کو قتل کر دیتے۔ اُن کے ہاتھوں میں بانس کاٹنے کے مخصوص چھرے ہوتے تھے۔

ایڈجوٹینٹ ہمیں خُفیہ کاغذات دیتے وقت قدرے پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے تاسّف کے لہجے میں کہا: "مَیں جو کاغذات تمہارے ذریعے بھیج رہا ہُوں، اِن میں چٹاگانگ کے اُن سرکردہ اشخاص کے نام درج ہیں جو جاپانیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اُن کے لیے پانچویں کالم کا رول انجام دینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ مَیں نے علیحدہ علیحدہ دو سیٹ دیے ہیں مگر دستاویز ایک ہی ہے۔ خدانخواستہ ایک مارا گیا تو شاید دوسرا ان کاغذات کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔"

کپتان ایِن ہندوستانیوں کے جذبات سمجھنے سے قاصر تھا اور ہندوستانی قوم پرستوں کو غدّار کہتا تھا! چنانچہ جب ہمیں ایڈجوٹینٹ نے احتیاط اور ہوشیاری سے سفر کرنے کا مشورہ دیا تو کپتان موصوف نے حقارت سے کہا: "مَیں دیکھوں گا کہ کوئی غُنڈہ میرے کام میں کس طرح مداخلت کی جُرأت

کرتا ہے۔"

مَیں تو ۲۲ سال کا ایک ناتجربے کار انگریز تھا اور جنگ لڑنے ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستانی سیاست سے ناواقف تھا۔ بہرحال مجھے اطمینان تھا کہ مَیں اچھی طرح مسلح ہُوں، مجھے چند چاقو بردار لوگوں سے کیا خوف؟

ہم نے سامانِ سفر باندھا اور چٹا گانگ جانے کے لیے ڈھاکہ اسٹیشن کا رُخ کیا۔ انجن کے ساتھ لگی ہُوئی فرسٹ کلاس بوگی میں کپتان اَین سوار ہُوا، میری نشست پیچھے لگی ہُوئی فرسٹ کلاس بوگی میں ریزرو تھی۔ اس طرح کے انتظامات جان بُوجھ کر کیے گئے تھے کہ ہم میں سے ایک مارا جائے تو دوسرا تو بچ نکلے اور کاغذات صحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

مَیں نے اپنے ڈبّے کی جالیاں لگی ہُوئی کھڑکیوں کو کھولا اور نشست پر بیٹھ گیا۔ تھرماس سے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پیا اور سلیپنگ برتھ پر دراز ہو کر خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹنے لگا۔

یکایک میری آنکھ کُھل گئی۔ مَیں نے دیکھا گاڑی رُکی ہُوئی ہے۔ کمپارٹمنٹ کی روشنی غائب، پنکھا بند اور میری جیکٹ پسینے سے تر ہے۔ ایک مچھر میرے کان کے قریب بھنبھنا رہا ہے۔ مَیں نے کھڑکی کا بولٹ اُوپر کر کے باہر نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک بڑا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر لوگ جے ہند اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگا رہے تھے۔ پلیٹ فارم ان لوگوں سے اٹا پڑا تھا۔ مَیں نے کھڑکیاں بند کر دیں اور ڈبّے کی دوسری جانب کے دروازے کی طرف دوڑا۔ باہر کوئی نظر نہ آیا کیونکہ اس جانب پٹڑی کے ساتھ ساتھ کھلا میدان تھا جو کسی بستی کو جاتا تھا۔

مَیں نے ریوالور چلنے کی آوازیں سُنیں۔ کئی گولیاں چلیں۔ مَیں کُود کر پٹڑی پر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ کپتان اَین کا دروازہ کُھلا ہے اور ایک مجمع باہر آ رہا ہے اور لوگ اِدھر اُدھر مُنتشر ہو گئے ہیں۔ مَیں نے صبح کاذب کے دُھندلکے میں زمین پر ایک لاش پڑی دیکھی۔ مجھے اُس لاش کو پہچاننے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ یہ کپتان اَین کی لاش تھی۔ اب مَیں تنِ تنہا تھا۔

مَیں تیزی سے مُڑا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر اینگلو انڈین کو دیکھا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کی بیوی اُس سے بُری طرح چمٹی ہُوئی تھی۔

"خدا کے لیے مسٹر آفیسر، میری مدد کیجیے۔" اُس شخص نے گڑگڑا کر التجا کی۔

"معاملہ کیا ہے؟"

"غنڈے ٹرین میں یورپینوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے انجن سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ بس اِدھر آنے ہی والے ہیں۔ ہم سب قتل کر دیے جائیں گے۔ بچائیے صاحب ہمیں بچائیے۔"

مَیں ۲۲ سال کا ناتجربے کار نوجوان تھا۔ سوچا، باغی ہجوم سے کیسے نمٹوں اور وہ بھی تنِ تنہا۔ ساتھی بچھڑ گیا۔ کوئی رائے دینے والا بھی نہیں۔ بہرحال مجھے کچھ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

"جلدی کرو اور میرے ڈبّے میں سوار ہو جاؤ۔" مَیں نے اینگلو انڈین جوڑے سے کہا اور خود بھی اُن کے ساتھ اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ کھڑکیاں دروازے سب بند کر لیے اور مَیں نشست پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ ایک سگریٹ اینگلو انڈین کو پیش کیا مگر اُس نے ہاتھ نہ بڑھایا، ہکا بکا مجھے تکتا رہا۔ وہ سخت بدحواس تھا۔

یکایک دروازے پر کلہاڑیاں مارنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ مجھے یقین تھا کہ دروازہ اور کھڑکیاں سب کچھ ٹوٹ جائیں گے۔ اب میرے سامنے تین راستے تھے۔ پہلا یہ کہ مَیں انتظار کروں اور مجمع دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر اندر آ جائے اور ہم سب کو قتل کر ڈالے۔ دوسرا یہ کہ مَیں کھڑکی کھولوں اور مجمع پر فائر کھول کر اپنا دفاع کروں۔ تیسرا یہ کہ کھڑکی کھول کر مجمع سے بات کروں اور اُسے حملے سے باز آنے کی تلقین کروں۔ یقینی موت کے مقابلے میں مجھے اس تیسرے میں اُمید کی کچھ جھلک نظر آئی؛ چنانچہ مَیں اُٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اینگلو انڈین میرے ارادے کو سمجھ گیا۔ وہ وحشت اور نااُمیدی کی حالت میں مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچنے لگا۔ مَیں نے اُسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور کھڑکی کھول دی۔ باہر ایک شخص کھڑکی پر کلہاڑی مارنے ہی والا تھا۔ اُس کے پیچھے تین آدمی سفید قمیص، سفید پاجامے اور سفید ٹوپی میں ملبوس کھڑے تھے جو احکامات صادر کر رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک جمِ غفیر نعرے لگا رہا تھا۔

اُن تین لیڈروں میں سے جو سب سے قریب تھا، مَیں اُس سے مخاطب ہُوا۔ کالے رنگ کا یہ ایک نوجوان تھا جو کسی یونیورسٹی کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ مَیں ایک انگریز نوجوان تھا اور وہ ہندوستانی۔ دونوں کی عمریں تقریباً برابر ہی تھیں۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"ہم دریا تک آپ کے ساتھ اس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔"

مَیں نے کچھ توقف کیا۔ مجھے اب موت اور زیست کے درمیان فیصلہ کرنا تھا۔ مَیں نے اُس نوجوان کی آنکھوں میں کچھ دیکھا جس نے مجھے اُمید دلائی اور مَیں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کُھلتے ہی تینوں لیڈر بڑے فخریہ انداز میں میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہُوئے۔ آخری شخص نے مجمع سے کچھ گفتگو کی اور اُن میں سے چار آدمی اندر بلا لیے۔ مَیں نے دیکھا کہ افلاس اور فاقہ کشی کے آثار اُن کے سیاہ چہروں پر نمایاں تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے ہُوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا اُن کے ہاتھوں میں کیا ہے۔

ٹرین چل پڑی۔ موت میرے قریب کھڑی تھی۔ ترغیب دینے کے سوا اور کوئی مدد مجھے میسّر نہ تھی۔

سیاہ فام نوجوان نے سوالیہ انداز میں پُوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

بلوچستان پر اپنی نوعیت کی پہلی ہمہ پہلو کتاب

اجنبی اپنے دیس میں

سیّد شوکت علی شاہ کا دیدہ ور سفرنامہ

* ایک ایسا سفرنامہ جس میں بلوچستان کے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی اُتار چڑھاؤ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔
* ایک ایسا سفرنامہ جو مستقبل کے امکانات اپنی گرفت میں لاتا ہے۔
* ایک ایسا سفرنامہ جو بلوچستان کے اندر بیٹھ کر اور بلوچستان کو اپنے دل میں سمو کر لکھا گیا ہے۔
* ایک ایسا سفرنامہ جس میں وادیوں اور پہاڑوں میں بسی ہُوئی غیرت اور محبّت کی دھڑکنیں ایک ادبی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

قیمت ۵۵ روپے

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور ۲۵

میں نے بتادیا میں کہاں جارہا ہوں۔

"تم ہندوستانیوں سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے جنگیں لڑیں؟"

میں نے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جاپانی انسانوں کی عزت نہیں کرتے۔ اگر اُنہوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو وہ ہندوستانی یا یورپین کی تفریق کے بغیر سب کو غلام بنا لیں گے۔

"اگر یہ دُرست بھی ہو تب بھی ہمیں کوئی فکر نہیں۔ آخر ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی بھوکوں مر رہے ہیں اور جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ جاپانی ہمارے ساتھ اس سے بدتر اور کیا سلوک کریں گے جو تم اور تمہاری قوم ہمارے ساتھ پہلے ہی سے کرتی چلی آرہی ہے۔"

میں نے اُس کے الفاظ میں کچھ صداقت کی جھلک دیکھی لیکن اپنی بات پر اڑا رہا اور جاپانیوں کے بُرے سلوک اور مظالم کے قصّے سُناتا رہا۔

"میں تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ جاپانی ہماری طرح مشرقی ہیں۔ وہ ہمیں اپنا اتحادی سمجھ کر ہمیں خوش آمدید کہیں گے کیونکہ ہم دونوں ایک ہی دشمن سے برسرِ پیکار ہیں۔"

ہم کتنی ہی دیر بحث کرتے رہے اور یُوں کتنے گھنٹے گزر گئے ہمیں اس کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔ اپنی باتوں کے تاثر کا خیال کیے بغیر میں اُس سے مسلسل محوِ گفتگو رہا اور وہ بھی مجھ سے متواتر بحث کرتا رہا۔

اُس کے ساتھیوں کو ہماری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو جلد سے جلد ہمیں قتل کر کے اپنا کام ختم کرنے کے لیے بیتاب تھے لیکن وہ نوجوان اُن کا لیڈر تھا۔ اس کے حکم کے بغیر وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔

گفتگو جاری تھی کہ ایکاایکی ٹرین رُک گئی اور باہر [illegible] فوجیوں کے بُوٹوں اور افسروں کے احکام کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ دروازہ کُھلا اور ایک قوی الجثّہ سارجنٹ اور ایک نان کمیشنڈ ہندوستانی سپاہی اندر آگئے اور [illegible] اُن لوگوں کو دیکھنے لگے جو میرے قریب کھڑے تھے۔ باہر ٹرین کے قریب سپاہیوں کی ایک پلاٹون موجود تھی۔

"سر! کیا آپ ٹھیک ٹھاک ہیں؟" سارجنٹ نے میری جانب دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔ "ہمیں ٹرین پر حملے کی خبر مل گئی تھی اور آپ لوگوں کے زندہ بچ جانے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ میں ان بدمعاشوں کو سول پولیس کے حوالے کرتا ہوں بشرطیکہ آپ ان پر کوئی فردِ جرم عائد کریں۔"

میں نے کمپارٹمنٹ پر نگاہ ڈالی۔ اینگلو انڈین کے چہرے سے خوف کے اثرات ختم ہو چکے تھے اور اُن کی جگہ نفرت کے جذبات نمایاں تھے۔ مجھے ایک لفظ کہے بغیر اُس نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور باہر جانے لگا۔ چلتے چلتے حملہ آوروں پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا "باسٹرڈ!" اور رفوچکر ہو گیا۔

میں نے حملہ آوروں کو غور سے دیکھا۔ وہ خاموش کھڑے تھے۔ اُنہیں سزا کا بالکل خوف نہ تھا۔ میں نے نوجوان کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُن میں رحم کی اپیل تھی ہی نہیں۔ میرے مُنہ سے اب جو الفاظ نکلنے والے تھے وہ اُن کی قسمت کے لیے فیصلہ کُن تھے۔

میں نے سارجنٹ کی طرف مُڑتے ہُوئے کہا "ان لوگوں سے کوئی جُرم سرزد نہیں ہُوا۔"

●●

میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہُوں جنہوں نے پروپیگنڈہ اور شخصی نزاعات اور سبّ وشتم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ بزرگانِ قوم کی پگڑیاں اُچھالنے والوں، اور سیاسی اختلافات کو ذاتی عداوت میں تبدیل کرنے والوں سے میں ہمیشہ بیزار رہا ہُوں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں۔

(سیّد ابُو الاعلیٰ مودُودیؒ)

القرویین، فاس

مولانا وحیدالدین خاں
مُدیر "الرسالہ" دہلی

مراکش کا انتہائی خوبصورت سفرنامہ جس میں ایک اسلامی کانفرنس کی رُوداد بھی ہے اور دُنیائے اسلام جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہے، اُن کا احاطہ بھی۔

عالمِ اسلام کی سیر

جولائی ۱۹۸۴ء

میں ملائشیا جانا ہُوا تھا، پھر نومبر ۱۹۸۴ء میں ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے مراکش جانے کا اتفاق ہُوا۔ یہ گویا مسلم دُنیا کے ایک سرے سے دُوسرے کی طرف سفر تھا جو ملائشیا اور انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک پھیلی ہُوئی ہے۔

مراکش مغرب کی سمت میں افریقہ کا آخری ملک ہے جو اسپین کے نزدیک واقع ہے، چنانچہ اس ملک کا دُوسرا نام 'مغرب' ہے۔ اس کا رقبہ دو لاکھ ۵، ہزار مربع میل اور آبادی دو کروڑ سے کچھ زیادہ ہے جس میں بیشتر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اس کی راجدھانی رباط ہے اور شاہ حسن ثانی اس کے موجُودہ حکمران ہیں۔

مراکش کو بنو اُمیّہ کے دَور میں عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اُنہوں نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا جب وہ خشکی کو فتح کرتے ہُوئے مراکش کی آخری سرحد تک پہنچے

جس کے آگے بحرِ اوقیانوس موجیں مار رہا تھا تو اُنہوں نے اسلامی جوش کے تحت اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور پانی کے اندر کھڑے ہو کر کہا:

وَاللّٰہ لو علمتُ ان وراءَ ھٰذا البحر بلدٌ

لخضتُہٗ حتّٰی لایعبد احدٌ دونک

(خدا کی قسم! اگر مَیں جانتا کہ اس سمندر کے پار بھی کوئی ملک ہے تو مَیں سمندر عبور کر کے وہاں پہنچتا یہاں تک کہ رُوئے زمین پر ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔)

دَورِ اوّل کے مسلمان جس مقصد کے تحت سرشار ہو کر اُٹھے تھے وہ لوگوں کو خُدائے واحد کا عبادت گزار بنانا تھا، نہ کہ ملکی فتوحات حاصل کرنا، مگر بعد کی نسلیں یہ راز بھُول گئیں۔ اُنہوں نے فتوحات اور سیاسی کارناموں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔

۲۵ نومبر کو جب مَیں نے یہاں اپنے ہوٹل کے کمرے میں کھڑے ہو کر بحرِ اوقیانوس کی لہروں کو موجیں مارتے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے یہ موجیں آج بھی عقبہؓ بن نافع کے اس حقیقی قول کی امانت لیے ہُوئے ہیں اور اسے توحید کا نام لینے والوں تک پہنچا دینا چاہتی ہیں۔

مراکش کی مکمل فتح کے بعد موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ یہ وہی طارق بن زیاد ہے جس کے نام سے جبل الطارق یا جبرالٹر موسوم ہے۔ اُس نے آبنائے جبرالٹر عبور کی اور اندلس یعنی اسپین میں داخل ہو کر اس کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا۔ اس کے بعد اسپین کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہو گئی مگر بعد میں جب مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے نتیجے میں عیسائی دوبارہ یہاں غالب آ گئے تو اُنہوں نے چاہا کہ اس ملک سے اسلامی تاریخ کو بالکل مٹا دیں۔ اُنہوں نے زبردست مظالم کیے؛ چنانچہ مجبور ہو کر یہاں کے مسلمان یا تو ملک چھوڑ کر افریقہ چلے گئے یا دوبارہ مسیحی بن گئے۔

مراکش میں فرانسیسی ۱۹۰۱ء میں داخل ہوئے اور اُنہوں نے ۱۹۱۲ء تک اس پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اسی دوران اسپینی بھی مراکش کے ایک حصّے پر قابض ہو گئے۔ تاہم ۱۹۵۶ء میں فرانس اور اسپین دونوں سلطان کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ اب مراکش مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہے۔

راقم الحروف نے مراکش کا نام سب سے پہلے بچپن میں شبلی نعمانی کی نظموں کے ذریعے سُنا تھا۔ جنگِ عظیم اوّل سے پہلے اس پر مغربی قوموں کا قبضہ ہو گیا تھا تو شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا: ؎

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مراکش، فارس یعنی ایران اور ٹرکی اگرچہ آج مغربی اقوام کے قبضے سے آزاد ہو چکے ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے غلبے سے نکلنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

مراکش شہر یہاں کا قدیم دارالحکومت ہے۔ یورپی لوگ اکثر اسی نام کی نسبت سے یہاں کی حکومت کو حکومتِ مراکش کہتے تھے۔ اس طرح 'مراکش' پُورے ملک کے لیے بھی بولا جانے لگا اور یہی لفظ یورپی زبانوں میں بگڑ کر 'مراکو' بن گیا۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو صبح سویرے ایئر انڈیا کے ذریعے دہلی سے روم کے لیے روانگی ہُوئی۔ جہاز کے اندر مختلف اخبار اور رسائل پڑھنے کو ملے۔ ٹائم میگزین کا شمارہ ۱۹ نومبر ۸۴ء الیکشن اسپیشل کے طور پر چھاپا گیا تھا۔ اُس میں بہت سی دلچسپ باتیں تھیں۔ صفحہ ۴۹ پر امریکی لیڈر ماندیل کا ایک قول درج تھا:

"ہم حقیقی مسائل سے نمٹ رہے ہیں اور ہم حقیقی جواب چاہتے ہیں۔ یہ ہالی وُڈ نہیں ہے۔"

ہالی وُڈ امریکی فلمی دُنیا کا نام ہے۔ فلم کی دُنیا میں طرح طرح کے کردار ادا کیے جاتے ہیں مگر وہ سب کے سب غیر حقیقی ہوتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ ہر قسم کی طاقت رکھنے کے باوجُود یہ جانتے ہیں کہ فلمی دُنیا والی کارکردگی دکھانے سے حقیقی دنیا میں اچھے نتائج نہیں نکل سکتے۔ دراصل ماندیل نے اس جملے میں صدر ریگن پر طنز کی تھی جو ہالی وُڈ سے امریکی سیاست میں وارد ہُوئے تھے۔

دہلی سے ٹھیک ساڑھے چھ بجے صبح روانگی ہُوئی۔ نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز روم میں اُترا۔ دہلی سے روم کا فاصلہ سات ہزار کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔

مَیں اگلے جہاز کے انتظار میں روم کے بینُ الاقوامی ہوائی اڈے پر تھا۔ میرے سامنے ہوائی اڈے کا وسیع میدان پھیلا ہُوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جہاز روانہ ہو رہے تھے۔ ابتدا میں وہ کھڑے نظر آتے، پھر متحرک ہو کر تیز دوڑتے اور پھر فضا میں بلند ہو کر اُڑنے لگتے۔

روم میں چند گھنٹے قیام کے بعد ایئر مراک کے ذریعے آگے روانگی ہُوئی۔ شام کے وقت مَیں کیسا بلانکا پہنچا یہ مراکش کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا کچھ حصہ پُرانی وضع کا ہے اور کچھ جدید طرز پر بنایا گیا ہے۔ یہ اس ملک کا تجارتی مرکز ہے۔ بیرونی ملکوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے ہیں، تجارت کے لیے بھی اور سیاحت کے لیے بھی۔

کیسا بلانکا بحرِ اوقیانوس کے عین ساحل پر واقع ہے۔ اس کا اصل نام الدار البیضاء ہے۔ مغربی استعمار کے زمانے میں وہ کیسا بلانکا کے نام سے مشہُور ہُوا۔ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی 'سفید گھر'۔ الدار البیضاء عربی لفظ ہے اور کیسا بلانکا اسی کا اسپینی مترادف ہے۔

کیسا بلانکا میں میرا قیام ہوٹل 'سفیر' میں تھا۔ یہ ہوٹل ساحل کے نزدیک ہے۔ یہاں سے بحرِ اوقیانوس کی موجیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس پر نظر پڑی تو یہ سوچ کر میری عجیب کیفیت ہوئی کہ یہی وہ سمندر ہے جس کے دوسری طرف کھڑے ہو کر طارق بن زیاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: البحر وراءکم والعدو امامکم (سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے۔) پھر یہیں سے گزر کر مسلمان اسپین اور فرانس میں داخل ہُوئے اور اُنہوں نے یورپ میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کیا۔

۲۵ نومبر کو مَیں ہوٹل کے باہر کی سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ پولیس کے ایک آدمی سے ملاقات ہُوئی۔ اُس نے عربی میں بات شروع کی۔ مجھے اُس کا لہجہ سمجھنے میں دقّت پیش آئی میں نے اُس سے اپنا کلام دُہرانے کے لیے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا کہ یہ تو ہم فصیح عربی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر مراکش کے لہجے میں عربی بولیں تو اُسے آپ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد وہ مقامی لہجے میں بولنے لگا تو مجھے ایسا معلُوم ہوا گویا وہ عربی نہیں، کوئی اور زبان بول رہا ہے۔

حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم مختلف عرب قبائل سے اُن کی اپنی بولی میں گفتگو کرتے تھے اور ہم اُسے بالکل سمجھ نہیں پاتے تھے۔ یہ صُورتِ حال اسی لہجے کے فرق سے پیدا ہُوئی تھی۔

بھارت میں مغرب کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ مراکش میں اس کے برعکس مشرق کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکش قبلے کے دُوسری سمت میں واقع ہے۔ اس فضائی سفر نے مجھے زمین کے ایک طرف سے اُٹھا کر دُوسری طرف پہنچا دیا تھا۔ مراکش میں اس طرح سے نماز پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہُوا کہ مسلمان مشرق اور مغرب کا پابند نہیں ہے۔ وہ صرف قبلے کا پابند ہے۔ دُنیا اس رُخ پر جا رہی ہو یا اُس رُخ پر، ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم خُدا کے رُخ پر قائم رہیں اور محمّدِ عربی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی سُنّت سے کبھی نہ ہٹیں۔

کیسا بلانکا میں شہر کے اندرُونی حصّوں میں بھی جانے کا اتّفاق ہُوا۔ ایک مقامی نوجوان سے بات ہُوئی جو فقط فرانسیسی میں بات کر سکتا تھا اور عربی زبان بولنے پر قادر نہ تھا۔ معلُوم ہُوا کہ یہاں کچھ ایسے خاندان بھی ہیں جو فرانسیسی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ یہ فرانس کے دَورِ اقتدار کی نشانی ہے۔ یہاں ٹیلی ویژن سے لے کر زبان اور فرنیچر، ہر چیز پر فرانسیسی تہذیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام پس منظر

میں جاتا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک تاریخی روایت بن گیا ہو۔

کیسابلانکا کی مختلف سڑکوں سے گزرنے کا اتفاق ہُوا۔ لیکن کہیں کوئی مسجد یا مینار دکھائی نہ دیا۔ اذان کی آواز بھی سُننے میں نہ آئی۔ سڑکوں پر ہوٹل، بینک اور دفاتر کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہیں مگر ان کے درمیان کہیں مسجد اُبھری ہُوئی نظر نہ آئی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ مسجدیں سڑکوں کے پیچھے پائی جاتی ہیں ، تاہم وہ زیادہ شاندار نہیں۔

ہم بہت سے ملکوں سے گزرتے مراکش پہنچے تھے، مثلاً خلیجِ عرب کے ممالک، شام، ترکی، یُونان، اٹلی وغیرہ۔ ان ملکوں میں سے کسی کا میرے پاس ویزا نہیں تھا جبکہ مراکش میں داخلے کے لیے مجھے نئی دہلی کے سفارت خانے سے باقاعدہ ویزا لینا پڑا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکش میں تو میں زمینی مسافر تھا اور یہاں مجھے قیام کرنا تھا اس کے برعکس دُوسرے مُلکوں کا میں نے محض ہوائی سفر کیا اور اُن کی زمین پر نہیں اُترا ___ اگر آپ کسی شخص یا قوم کے اُوپر اُوپر گزر جائیں تو وہ آپ سے تعرض نہیں کرتا لیکن اگر آپ اُس کی حقیقی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو وہ تعرض کرے گا اور آپ کے خلاف رُکاوٹیں ڈالے گا۔

قوموں کا یہ مزاج زندگی میں کامیابی کا نہایت گہرا اصول دیتا ہے۔ یہ کہ آدمی لوگوں کو چھیڑے بغیر اپنا کام کرے۔ وہ اپنا منصوبہ اس طرح پُورا کرے کہ لوگوں کو بالکل بے ضرر معلُوم ہو۔ بدقسمتی سے موجُودہ زمانے کے مسلمان اس حکمت کو نہیں سمجھتے، چنانچہ دین کے نام پر جھگڑوں اور ہنگاموں نے اکثر ملکوں میں دینی کام انتہائی دُشوار بنا دیا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب جو کیسابلانکا کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہُوئے تھے، اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے ملک میں مسلمان چونکہ عام طور پر پُرامن ہیں اور بڑی حد تک سیاست سے الگ رہتے ہیں، اس لیے وہاں تبلیغِ اسلام پر کوئی پابندی نہیں۔ اُن کے ہاں اگرچہ عیسائی حکومت ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی خواہ سارے لوگ اسلام سے نکل جائیں یا اسلام میں داخل ہو جائیں۔ وسطی اور جنوبی افریقہ کے تقریباً سب ملکوں میں یہی صُورتِ حال ہے۔

اس صُورتِ حال نے برِّاعظم افریقہ میں یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ یہاں بلا روک ٹوک اسلام کی اشاعت کی جائے۔ اگرچہ عملاً ابھی اس امکان سے بہت کم فائدہ اُٹھایا جا سکا ہے۔ کہیں مسلمان اپنے خلاف جھُوٹی رُکاوٹیں کھڑی کر کے دینی کام کی راہ میں مشکلات پیدا کیے ہُوئے ہیں اور کہیں اپنی غفلت کی وجہ سے مواقع استعمال کرنے سے محروم ہیں نتیجہ دونوں جگہ یکساں ہے۔

میرے پاس کانفرنس کی طرف سے جو ٹکٹ آیا تھا اُس میں ۲۴ر نومبر کی پیشگی ریزرویشن تھی۔ میں نے سمجھا شاید ۲۵ر نومبر سے کارروائی شروع ہونے والی ہے ؛ چنانچہ ریزرویشن کے مطابق ۲۴ر نومبر کو دہلی سے روانہ ہو کر اُسی دن شام کے وقت کیسابلانکا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہُوا کہ اصل کارروائی ۲۸ر نومبر سے شروع ہو گی! اس طرح مجھے تین دن غیر ضروری طور پر کیسابلانکا میں گزارنے پڑے۔ اگرچہ فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام تھا مگر یہ تین دن یُوں گزرے جیسے تین صدیاں بیت گئی ہوں۔ میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو محسوس ہُوا کہ میرے بالوں کی سفیدی میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے کوئی برتر مقصد نہ ہو، اُن کے لیے اس طرح کے ایام تفریح کے ایام ہوتے ہیں مگر ایک بامقصد انسان کے لیے تین دن یقیناً تین صدیوں سے کم نہیں۔

وہ چیز جسے فائیو اسٹار ہوٹل کہتے ہیں ، حقیقتاً ایئر کنڈیشنڈ جیل خانے کا دوسرا نام ہے۔ ایسے ہوٹلوں میں آدمی کو ایک ایسے ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں ہر چیز مصنوعی ہوتی ہے۔ دُھوپ کی جگہ بجلی ، ہوا کے بجائے ایئر کنڈیشنر ، گھاس کے فرش کی جگہ قالین ، بستر کے

بجائے پلاسٹک کے پھُول اور پودے۔ چڑیوں کے نغمے کی جگہ ٹیپ شدہ موسیقی ، نیلے آسمان کے بجائے منقش چھت ؛ غرض ہر چیز مصنوعی طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ آدمی بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے سے قدرت کے مناظر دیکھتا ہے مگر وہ اُن سے براہِ راست مربوط نہیں ہو سکتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ قدرت کے مشینی بدل میں جکڑا اپنے صبح و شام گزارتا رہے۔

ہوٹل 'سفیر' میں میں نے ایک صاحب سے پُوچھا کہ اس کے اندر کوئی کھُلی جگہ ہے جہاں قدرتی ہوا اور دُھوپ مل سکے۔ اُنہوں نے مُسکرا کر کہا کہ نہیں۔ اُنہوں نے ہر قدرتی چیز کو بند کر رکھا ہے۔ تلاش و جستجو کے بعد بالآخر میں نے ایک جگہ ڈھونڈ نکالی اور وہاں جا کر دُھوپ اور کھُلی ہوا میں بیٹھنے لگا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ اُنہوں نے پُوچھا کہ آپ کو اس قسم کا ماحول بہت پسند ہے۔ میں نے کہا: "اس میں مجھے ایک قسم کا ربانی لمس محسوس ہوتا ہے۔"

اس کانفرنس میں مختلف ملکوں اور برِّاعظموں کے لوگ شرکت کے لیے آئے تھے۔ میں نے افریقہ کے ایک صاحب سے افریقی مسلمانوں میں جدید تعلیم کے متعلق دریافت کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ تعلیم اُن میں آئی ہے مگر ابھی وہ اپنے پڑوسی عیسائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ میں نے وجہ پُوچھی تو اُنہوں نے کہا کہ ماضی میں ہمارے لوگوں کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو ایمان سے دُور کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی یہی کیفیت تھی۔

جن بزرگوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا، وہ اگرچہ نیک نیت تھے مگر اُن کی غلطی یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ مثلاً اگر وہ کمیونزم کی تعلیم سے روکتے تو یہ صحیح ہوتا کیونکہ یہ ذہن کے فساد کا دوسرا نام ہے لیکن اُنہوں نے تو سائنسی تعلیم سے بھی مسلمانوں کو دُور رکھنے کی کوشش کی ، حالانکہ سائنس موجودہ زمانے میں قوت کے ہم معنی تھی۔ سائنسی میدان میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مسلمان

FLIGHTO TRAVEL SERVICES
گورنمنٹ سے منظور شدہ
فلائیو ٹریول سروسز
ہر ملک کی کسی بھی فضائی کمپنی کا ٹکٹ ہم سے حاصل کریں۔
صحیح مشورہ اور بہترین خدمت ہمارا نصب العین ہے۔
نسیم چوہدری (مینجنگ پارٹنر)
سابق صدر پیاسی یونین (پی آئی اے) لاہور،
۶۵۔ شاہراہِ قائدِ اعظم ، ریگل لین ، نزد ریگل چوک ، ثریا مینشن ۔ لاہور
فون دفتر: ۶۹۷۳۲ — ۳۲۴۴۶۱ — فون گھر: ۳۷۰۴۶۵

دورِ جدید میں کم از کم سو سال پیچھے رہ گئے۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قدرتی ذخائر کی فراوانی ہے مگر دوسری قومیں ان کا استحصال کر رہی ہیں اور اپنی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

کیسابلانکا میں شراب اور نائٹ کلب تک کی آزادی ہے۔ پورک یعنی سؤر کے گوشت کی دکان بھی نظر آئی۔ اسی لیے یہاں مغربی سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ ایک عرب اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچّوں کے ساتھ آئے اور ہوٹل 'سفیر' میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ غالباً سیاحت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ مَیں نے دیکھا تو اُن کے بیوی بچے فیشن کے سامان اور جدید طرز کے کھلونوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ان عرب سے ملاقات ہوئی تو وہ جدید مادّی تہذیب کے خلاف بے تکان بولنے لگے۔ مَیں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو خود تو عملاً اپنے پُورے خاندان کے ساتھ مادّی تہذیب میں غرق ہیں اور زبان سے اس کے خلاف تقریریں کرنے میں تیز ہیں۔

ایک مسلمان جو میرے ساتھ ہوائی جہاز میں میرے بغل کی سیٹ پر تھے، اُنھوں نے ہوائی جہاز کی ضیافت قبول کرتے ہوئے شراب لی۔ اتّفاق سے وہ بھی اسی ہوٹل 'سفیر' میں آکر ٹھہرے۔ ایک ملاقات کے دوران میں ان سے گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے: "آجکل مسلمانوں کے معاملات بالکل غیر اسلامی ہو گئے ہیں۔" مَیں اس تضاد پر حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لیے اسلام بھی ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود جو چاہے کرے، اُسے اپنے آپ پر اسلام نافذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی تضاد نے اُن کی تمام کوششیں بے نتیجہ بنا کر رکھ دی ہیں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کینیا سے اس اجتماع میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اُن کی عمر ابھی سینتیس برس ہے مگر کم عمر ہونے کے باوجود اُنھوں نے وہ کام کیا ہے جو بڑوں کے کام سے زیادہ قیمتی ہے۔ جناب شریف سالم شریف حسین نے بتایا کہ وہ پہلے دارالحکومت نیروبی میں رہتے تھے۔ وہاں اُن کے لیے ذاتی اعتبار سے بہت مواقع تھے مگر اُنھوں نے محسوس کیا کہ شہروں سے کام کا آغاز کرنا مکان کو گویا چھت کی طرف سے تعمیر کرنا ہے۔ وہ نیروبی چھوڑ کر ایک ہزار کلومیٹر دُور ایک گاؤں مرسابت چلے گئے۔ وہاں اُس وقت اُن کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ اُنھوں نے خود اپنے ہاتھ سے بُنیاد کھود کر ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ مسجد بنائی۔ اُنھوں نے کچھ ساتھیوں کو جوڑ کر یہ کوشش کی کہ لوگوں کے ذہن کو جگائیں۔ اُنھوں نے غریب بچّوں کے کپڑے فراہم کیے، ضرورت مند کسانوں کو مویشی خرید کر دیے اور غریب لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ اُن کے ہاتھ پاؤں اُن کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ مثلاً وہ ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں وعظ کیا۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں مسجد ہے نہ مدرسہ۔ اُنھوں نے کہا کہ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ تمہارے پاس پانی ہے، مٹّی ہے، پتھر ہے، لکڑیاں ہیں۔ اور خدا کے دیے ہوئے ہاتھ ہیں اُنھیں استعمال کرو؛ چنانچہ اُن کی تحریک سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹیں تیار کیں اور لکڑیاں جمع کیں اور کچھ سمنٹ خرید کر خود اپنی محنت سے ایک مسجد اور مدرسہ کھڑا کر دیا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا: "یہ مسجد اور مدرسہ اگر کسی بیرونی ملک کے ڈالر سے بنا ہوتا تو کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی مگر آج گاؤں والوں کو اس کی ایک ایک اینٹ سے محبّت ہے جسے اُنھوں نے خود اپنا پسینہ بہا کر بنایا ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ یہ پورا علاقہ اس سے پہلے پس ماندہ تھا لیکن آج اسے ہمارے گاؤں نے جگا دیا ہے۔

ریاض کے اخبار 'الشرق الاوسط' میں ایک مضمون اسرائیل کے متعلق پڑھا۔ اُس میں یہ قصّہ درج تھا کہ ایک عرب خاتون اسرائیل کے زیرِ قبضہ علاقے سے باہر جا رہی تھی۔ سرحد پر اسرائیلی فوجی نے کہا کہ اے عورت تُو کہاں جا رہی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مَیں کویت جا رہی ہوں، اپنے بچّوں سے ملنے کے لیے۔ فوجی نے کہا کہ ان سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ ہم جلد ہی اُن کے پاس ہوں گے۔

یہ کانفرنس 'اسلام کی عالمی دعوت' کے موضوع پر تھی۔ اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے لوگوں پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ اسلامی دعوت خود کیا چیز ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، سب کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ اُنھوں نے 'دُنیا کی مشکلات اور مسلمانوں کی مشکلات' کے میدان میں کام کرنے کو اسلامی دعوت کا کام سمجھا اور اسی کے بارے میں تقریریں کیں۔

مَیں نے اپنے مختصر اظہارِ خیال میں کہا کہ وہ چیز جسے 'الدعوۃ الاسلامیۃ' کہا جاتا ہے، اُس کا تعلق دُنیا کے مسائل سے نہیں بلکہ آخرت کے مسائل سے ہے۔ خدا نے جس منصوبے کے تحت انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے مطابق بالآخر انسان کو جس فیصلۂ الٰہی کا سامنا کرنا ہے، اُس سے لوگوں کو باخبر کرنا ہی وہ چیز ہے جسے اسلامی دعوت کہا گیا ہے۔ مسلمان موجودہ دنیا میں جن مشکلوں سے دوچار ہیں یا قومیں جن مسائل میں مبتلا ہیں اُن کے سلسلے میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کام کا عنوان 'دعوت الی اللہ' نہیں۔

کانفرنس جس ہال کے اندر ہُوئی وہاں جلی حرفوں میں قرآن کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی:

(اے رسول! تجھ پر تیرے رب کی طرف سے جو نازل ہُوا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دے۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے رسالت کا فریضہ انجام ہی نہیں دیا اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔)

مَیں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق عصمت من الناس کو حاصل کرنے کا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانے میں ہمارے لیے جو یہ مسئلہ پیدا ہُوا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ظلم و تعدی سے محفوظ نہیں ہیں، وہ دعوت الی اللہ کا کام چھوڑنے ہی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی مشکلات حل کرنے کا طریقہ بس یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کا اصل کام جاری کیا جائے۔

ایک صاحب سوئٹزرلینڈ سے آئے تھے۔ اُن کے ہاں انگریزی 'الرسالہ' پابندی سے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی سوئزرلینڈ سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ اُنھوں نے الرسالہ کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہُوئے کہا کہ مَیں اور میرے ساتھی آپ کا میگزین شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں مغز ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کے انگریزی اور عربی جرائد میں یہی چیز سب سے کم ملتی ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ مسلم دُنیا کا ایسا کوئی پرچہ میرے علم میں نہیں جو اتنا مغز رکھتا ہو جتنا آپ کے الرسالہ میں ہوتا ہے۔

ایک صاحب کا تعلق گیمبیا سے تھا۔ اُنھیں ہمارے ہاں کا چھپا ہُوا تعارفی سٹ (انگریزی) بھیجا گیا تھا۔ اُنھوں نے بتایا: "ہمارے ہاں کئی لوگوں نے اسے پڑھا اور اتنا زیادہ پسند کیا کہ اُنھیں مصنّف کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہُوا۔ وہ لوگ مزید انگریزی کتابوں کا شدّت کے ساتھ تقاضا کر رہے ہیں۔" اُن کے نام الرسالہ انگریزی جاری کر دیا گیا ہے۔

ایک صاحب یوگوسلاویہ سے آئے تھے۔ اُنھوں نے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ دُنیا بھر میں لاجئین یعنی پناہ گزینوں میں ۸۰ فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمّت پر وہ چیز طاری کر دی گئی ہے جسے قرآن میں 'ذلّت و مسکنت' کہا گیا ہے۔ ہمیں گہرائی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ مسلمانوں کا یہ حال کیوں ہے اور وہ موجودہ زمانے میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں رہ گئے۔

ایک صاحب کویت سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے مسلم تنظیموں پر تبصرہ کرتے ہُوئے کہا کہ یہ تنظیمیں قرآن و سُنّت کی بنیاد پر اُٹھی ہیں، اس لیے اُن کے پاس اچھے افکار کی

کمی نہیں مگر اس دُنیا میں فقط فکر کافی نہیں بلکہ نظم اور منصوبہ بندی بھی لازمی ہے۔ اس اعتبار سے ان تنظیموں کی حالت افسوسناک ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ مغربی ممالک اسی لیے ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ منظم انداز سے کام کرتے ہیں اور ہم اس لیے پیچھے ہو گئے ہیں کہ ہمارا کام نظم و ترتیب سے خالی رہتا ہے۔

ایک صاحب نے، جو کینیڈا سے آئے تھے، بیان کیا: "کینیڈا کے اڑھائی کروڑ باشندوں میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان ہیں۔ وہاں مکمل آزادی ہے، کسی قسم کا تعصب نہیں اور اسلامی دعوت کے زبردست مواقع ہیں لیکن بھارت اور پاکستان کے لوگوں نے وہاں آکر آپس کے مذہبی جھگڑے کھڑے کر دیے ہیں۔ دوسروں کی طرف سے ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں مگر اپنوں کی جانب سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔" اُنہوں نے بتایا کہ وہاں ایک نئی مسجد بنائی گئی ہے جس کے لیے مالیات کی فراہمی میں مَیں نے اسّی فیصد تک تعاون کیا تھا لیکن جب مسجد بن گئی تو شدید مذہبی جھگڑے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ مَیں نے اور میری طرح بہت سے لوگوں نے اس مسجد میں جانا ہی چھوڑ دیا۔"

اُنہوں نے دلگیر ہو کر بتایا کہ مغرب میں مسلمانوں کی تصویر بہت خراب ہے۔ اُنہیں پوٹینشل ٹیررسٹ یعنی امکانی دہشت پسند کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ یہودی پروپیگنڈے کا دخل ہے مگر خود مسلمانوں نے اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور یہ دوسرا پہلو یقیناً زیادہ افسوسناک ہے۔

رابطۃ الجامعات الاسلامیہ الرباط ایک شش ماہی مجلہ شائع کرتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ میں "کتاب العدد" کے عنوان سے حیات الصحابہ از مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر تبصرہ تھا۔ کتاب کے ابواب کی تفصیل دیتے ہوئے تبصرہ نگار نے لکھا تھا: "علما کا قول ہے کہ قرآن کے بعد پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ آپ کے اصحاب کرامؓ ہیں؛ چنانچہ اصحاب رسول کے حالات پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں مگر حیات الصحابہؓ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ مصنف نے زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے صحابہؓ کی زندگی کو بطور نمونہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔"

ایک صاحب بڑے پُرجوش تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل جہاد ہے۔ جہاد سے اُن کی مراد قتال تھی۔ مَیں نے کہا کہ اُمت کے رہنما اسی قسم کے جہاد میں تو سو سال سے لگے ہوئے ہیں، پھر مسائل حل کیوں نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے قرآن سے قتال کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ مَیں نے کہا کہ جن لوگوں نے قرآن میں صرف قتال اور جہاد کی آیتوں کو پڑھا ہے، اُنہوں نے قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔ قرآن اعراض کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال مکّی دَور کی زندگی ہے۔ قرآن ایڈجسٹ منٹ کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے۔ قرآن قتال کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال بدر اور احد کے واقعات ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ پہلی دونوں قسم کی تعلیمات بھول جائیں اور صرف قتال اور جہاد کی تعلیمات کو زور شور کے ساتھ پیش کریں، اُن کا رویّہ ویسا ہی ہے جیسے بہت سے غیر اسلامی ذہن کے لوگ قرآن کی ایک آیت کو لے لیتے ہیں اور اس سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں۔

ایک عالیشان ہوٹل تھا۔ ایک بہت بڑے سجے ہوئے کمرے میں قیمتی صوفوں پر لوگ براجمان تھے۔ وہ ہنس رہے تھے، سگریٹ اور مشروبات پی رہے تھے اور بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ مَیں نے کسی چیز میں حصہ نہ لیا اور بالکل خاموش ایک نشست پر بیٹھا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے اس حال میں دیکھ کر پُوچھا کہ آپ اس طرح چپ کیوں بیٹھے ہیں۔ مَیں پھر بھی چپ رہا۔ اُن کے بار بار سوال کرنے پر مَیں نے کہا کہ اس دَور کے لوگوں کا حال دیکھ

کر اکثر میرا دل یہ کہنے لگتا ہے:

"لوگ یُوں خوش ہو رہے ہیں گویا اس کے بعد وہ کبھی ناخوش نہیں ہوں گے۔ اور لوگ یُوں ہنس رہے ہیں گویا بعد میں انہیں کبھی ہنسنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

ایک موقع پر افریقہ میں قحط اور بھوک کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب، جو سگریٹ پینے میں بلانوش تھے، یکے بعد دیگرے قیمتی سگریٹ سُلگا رہے تھے۔ اُنہوں نے دُھواں اُڑاتے ہُوئے کہا کہ آج کا اصل مسئلہ بھوک نہیں، اسراف ہے۔ عرب دُنیا میں آج انتہائی مُسرفانہ طور پر خدا کی دی ہُوئی دولت خرچ کی جا رہی ہے۔ اگر اُسے ڈھنگ سے خرچ کیا جائے تو ساری دُنیا میں بھوک کا مسئلہ حل ہو جائے۔ مَیں خاموش بیٹھا لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو مطمئن چہروں کے ساتھ بھوک کے مسئلے پر بے تکان بول رہے تھے۔ میرے دل نے کہا:

"ہر آدمی دوسرے کی خامیوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اپنی کمیوں سے آخری حد تک بے خبر۔"

فاس یہاں کا سب سے مشہور تاریخی شہر ہے۔ اسے ادریس بن عبداللہ نے ۱۷۲ھ میں آباد کیا تھا۔ اُس وقت یہاں اسلام عمومی طور پر نہیں پھیلا تھا۔ ادریس بن عبداللہ عباسی دارو گیر سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ انہوں نے اپنی دعوتی کوششوں سے تقریباً پُورے ملک کو مسلمان بنا ڈالا۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو فاس کا سفر ہُوا۔ صبح کے وقت کانفرنس کے شرکا خصوصی طیّارے کے ذریعے کیسابلانکا سے فاس لے جائے گئے جو بذریعہ ہوائی جہاز پون گھنٹے کی مسافت پر ہے اور اسی دن شام کے وقت کیسابلانکا واپس چلے آئے۔

فاس قدیم زمانے میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں دُور دُور سے طلبہ آتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک شخص کی عالمانہ باتیں سن کر کسی نے اُس سے پوچھا: کیا تم نے فاس میں علم حاصل کیا ہے؟ اُس نے کہا نہیں علم آدمی کے سر میں ہوتا ہے نہ کہ شہر فاس میں۔

جدید فاس موجودہ زمانے کے شہروں کی طرح ہے مگر قدیم فاس تاریخی آثار سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں قدیم طرز کی عمارتیں، شاہانہ نشست گاہیں اور قلعے گزری ہوئی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ سڑکوں سے گزرتے ہُوئے متعدد مسجدیں دکھائی دیں۔ یہاں کی مسجدوں کا طرز بالکل مختلف ہے۔ مینار صرف ایک ہوتا ہے جو ایک کونے پر بنایا جاتا ہے۔

یہاں کی مشہور جامعۃ القرویین بھی دیکھی۔ یہ بہت بڑے رقبے میں یونیورسٹی کے انداز پر بنائی گئی تھی۔ اسے عالمِ اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ یہاں عظیم الشان مدرسہ اور اس کے ساتھ عظیم الشان مسجد ہے۔ قدیم زمانے میں مسلمانوں کی بنائی ہُوئی گھڑیاں، اُصطرلاب وغیرہ آج بھی

سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ فاس میں تعمیرات قدیم اسپینی محلات کے طرز کی نظر آئیں۔

ہمارے گائڈ نے جامعۃ القرویین کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس تعلیم گاہ کا معیار اتنا بلند تھا کہ یہاں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جسے مہارت حاصل ہو۔ یورپ کے آئے ہوئے ایک صاحب سے میں نے اُن کا تاثر پُوچھا تو اُنہوں نے کہا: "جو چیز ماضی میں اسلام کی عظمت تھی وہ آج صرف سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔"

ہم نے جمعے کی نماز یہاں کی قدیم جامع مسجد میں پڑھی۔ اس کا طرزِ تعمیر بالکل وہی تھا جو اسپین کے الحمرا میں پایا جاتا ہے۔ فاس میں یہودیوں کا ایک محلّہ بھی ہے۔ یہ لوگ پہلے قدیم فاس میں تھے لیکن اب جدید شہر میں آباد ہو گئے ہیں۔

اس سفر کی ایک دریافت روم ایر پورٹ کے ایک اطالوی افسر تھے۔ اُن کا نام تھا مارشیٹی۔ اُنہوں نے جاتے ہُوئے اور واپسی میں روم ایر پورٹ پر غیر معمولی تعاون کیا۔ یہاں دو باتوں کا تذکرہ مناسب ہو گا۔ دہلی سے روم کے سفر میں ایر انڈیا کے بوئنگ ۷۴۷ کی اکانومی کلاس اگرچہ بڑی حد تک بھری ہُوئی تھی مگر سولہ نشستوں کے فرسٹ کلاس کیبن میں اکیلا مسافر میں تھا۔ واپسی میں عجیب صُورت پیش آئی۔ میری ریزرویشن روم سے کنفرم نہیں تھی اور آج اتّفاق سے گورنمنٹ آف انڈیا کے افسروں کی ایک جماعت اسی جہاز سے سفر کر رہی تھی، اس لیے بظاہر نشست حاصل کرنا مشکل تھا لیکن مسٹر مارشیٹی دوبارہ مل گئے۔ اُنہوں نے مجھے لاؤنج میں بٹھا دیا اور میرا ٹکٹ لے کر ایر انڈیا کے دفتر میں گئے اور ریزرویشن کنفرم کرا لائے۔

میری واپسی کی تاریخ کی دہلی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن سے میں نے ذکر کیا تو فوراً اُنہوں نے میرا ٹیلیفون نمبر لیا اور کہا کہ ابھی میں دہلی ٹیلکس بھیج دیتا ہوں کہ آپ کے گھر پر اطلاع دے دی جائے کہ آپ اتوار کی صبح ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۳۱ سے دہلی پہنچ رہے ہیں۔

مسٹر مارشیٹی نے جس اخلاق اور فرض شناسی کا ثبوت دیا وہ اس قدر معیاری تھا کہ مجھے تعجب ہوا کہ خود غرضی اور سطحیت کی اس دُنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴ء کو کیسابلانکا سے واپسی کے لیے روانہ ہُوا۔ الیتالیا پر سفر کرتے ہُوئے لندن کے اخبار ڈیلی گراف میں یہ خبر پڑھی کہ آکسفورڈ کے ۳۲ سالہ جان لیمبرٹ نے اپنی تین لڑکیوں کو قتل کر دیا۔ اُس نے اپنی بیوی کے نام آخری خط میں لکھا تھا کہ تم نے مجھے ایک محبت کرنے والے وفادار شوہر سے بدل کر قاتل بنا ڈالا۔ میں ہر چیز کا الزام صرف تمہیں دیتا ہُوں۔ قاتل پکڑا گیا۔ اس کے بعد اُس نے عدالت میں بیان دیتے ہُوئے کہا: "میں نے یہ فعل اپنی بیوی سے انتقام لینے کے لیے کیا جو غیر مردوں سے راہ و رسم رکھتی تھی۔"

ماہرِ فلکیات ڈاکٹر پرسی سیمور کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا یومِ پیدائش غلط تاریخ کو منایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سیمور کہتے ہیں کہ تقریباً دو ہزار برس پہلے بابل کے تین عقل مند آدمیوں نے بیت اللحم کے اُفق پر جو پُراسرار روشن ستارہ دیکھا تھا، وہ زحل اور مشتری کے ایک سیدھ میں آنے کا نتیجہ تھا۔ یہ واقعہ درحقیقت، قبل مسیح میں ۱۵ ستمبر کو پیش آیا تھا اور یہ قرونِ وسطیٰ میں کیلنڈر کی غلطی تھی کہ عیسوی سن سات سال بعد سے شروع کیا گیا۔

ڈاکٹر سیمور نے پلے موتھ انگلستان میں سیاروں کی حرکت سے متعلق معلومات اور کمپیوٹر سے کام لے کر سیاراتی تجربہ گاہ میں بیت اللحم کا آسمانِ شب پیدا کیا تو برجِ حُوت کے اندر زحل اور مشتری سیدھ میں آ گئے۔ ان سیاروں کا ایسا اجتماع ۹۷۱ برس میں ایک بار ہی ہوتا ہے۔ (ٹائمز لندن - ۱۹ دسمبر ۸۴ء)

طاہر نقوی

بگولا

معاشرتی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والی ایک دلگداز کہانی

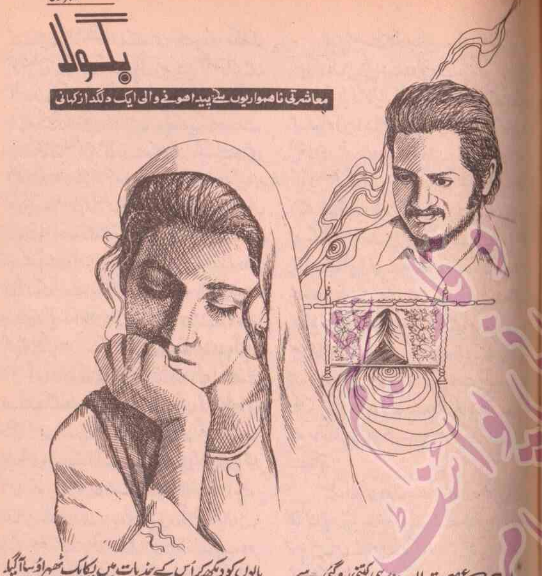

اری عصمت! اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ مہمان آنے ہی والے ہیں اور تُو ابھی تک پلنگ پر پڑی ہے۔ جلدی تیار ہو جا لڑکی!" عصمت کی ماں دُور سے چلّا رہی تھی۔ عصمت بغیر جواب دیے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے دیکھا سفید بالوں کی چوٹیوں سے جھانکنے لگی ہے۔ ماں نوکروں پر برس رہی تھی، نکل گئی۔ اُس نے ایک لمحے آنے والے مہمانوں کے بارے میں سوچا اور شرم اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے پسینے میں شرابور ہو گئی۔ جن خواہشات کو وہ پیچھے دھکیل چکی تھی وہ ایسے وقت پھر اُبھرنے لگیں۔ سامنے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سر میں کہیں کہیں چمکتے ہُوئے سفید بالوں کو دیکھ کر اُس کے جذبات میں یکایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اُسے اپنے ماں باپ کی خوشی پر ترس آنے لگا اور اُن کی بے چارگی کا سبب اپنے آپ کو سمجھنے لگی۔ اُس کی زندگی اُس ریگستان کی طرح تھی جس پر سال بھر سُورج کی کرنیں عموداً پڑتی ہیں۔ میلوں تک کہیں سایہ نظر نہ آئے اور حدِ نگاہ تک ویرانی کی حکومت ہو۔ ایک خیال آتے ہی اُسے ایک جُھرجُھری سی آئی۔ "اگر اس مرتبہ بھی، اس مرتبہ بھی..." اس کے آگے وہ کچھ اور نہ سوچ سکی۔

عصمت کے سر میں جب کسی سفید بال کا اضافہ ہوتا تو اُس کی ماں ایک سرد آہ بھرتی اور مُنہ پھیر کر دوپٹے سے بھیگی آنکھوں کو خشک کر لیتی۔ پہلے پہلے عصمت اپنے

کمرے میں جاکر آنسوؤں کے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کرتی مگر روک نہ پاتی۔ پھر جیسے آنکھوں میں آنسوؤں کی کمی سی ہوتی گئی۔ وہ انجانے جذبے کے تحت ماں کو دیکھتی اور پھر کسی کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔ اُسے اکثر یوں لگتا جیسے ابھی ابھی کوئی بے حد اہم کام کرنا ہے، جو ذہن سے اُتر گیا ہو اور ایک نامعلوم سی خلش ذہن سے چپک کر رہ جاتی۔ اُس کے احساسات کے نازک آبگینوں میں بال پڑ گئے تھے۔ ہر لمحے اُسے اپنی ہی پیدا کردہ تنہائی کاٹنے کو دوڑتی جو اُس کی قسمت میں گھل مل گئی تھی۔ وہ ماضی کی ناچاریوں اور بے بسی کا ایک اُجاڑ مکان بن کر رہ گئی تھی۔ زندگی کا قافلہ گزرتا چلا گیا اور اُس کی کارواں سرائے ویران ہوتی چلی گئی۔

اُس کی زندگی میں کلیاں چٹکتی تھیں، پھول کھلتے تھے اور اُس کے وجود کے اردگرد ہوا میں اُن کی خوشبو بسی رہتی۔ اُس نے اپنی علحدہ دُنیا بسا رکھی تھی۔ گھر کی خوشحالی اور ماں باپ کے لاڈ نے اُسے اور بھی آزاد بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنی دُنیا میں ایک ہیولا بسا رکھا تھا اور اپنے اس ہیولے کو وہ دن رات خواب میں دیکھتی، خیال میں پالتی، تصوّر میں سجاتی اور تخیّل میں سنوارتی۔ جب وہ تنہا ہوتی تو وہ اُس کے دھیان کی سیڑھیوں پر چُپکے چُپکے دبے پاؤں آجاتا۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ اُس کی سوچوں کے پس منظر سے اُبھرتی ہُوئی اُس کے وجود تک پہنچتی تو وہ محسوس کرتی، کوئی اُس کے پاس ہی آکھڑا ہُوا ہے۔ وہ اُسے دیکھتی رہتی۔ خوبصورت، تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ منصب والا۔ بی اے کے زمانے میں اُس کے لیے ایک رشتہ آیا۔ ایم اے پاس لڑکا اچھا خاصا تھا۔ باپ نے اپنی مرضی ظاہر کی تو عصمت نے پُرزور مخالفت کی۔ اُسے تو ایم اے کرنے کی دُھن تھی۔ ماں نے بھی لڑکی کا ساتھ دیا:

"میری عصمت کو رشتوں کی کیا کمی ؟"

اور پھر عصمت کا تو اپنا ایک الگ معیار تھا۔ اس معیار کو دل میں چھپائے وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ اُسے انور اور شیرازی کا خیال آگیا۔ یہ سب اُس کے ... آنے کا کوئی بہانہ نہ چھوڑتے۔ اُن کا خیال آتے ہی ... مُسکرا دی۔ انور نے اپنے اشعار میں اُسے بہت ... کی کوشش کی تھی۔ اپنی غزلوں میں اکثر وہ عصمت کا ... کرتا۔ ان اشعار کو پڑھ کر اُس کے بدن میں لہریں ... ہونے لگتیں، ہونٹ پھڑپھڑانے لگتے لیکن وہ ... سی بنی رہتی۔ شیرازی نے تو شادی تک کے ... سے کہا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔ اس بے باکی پر ... بھی آیا۔ سہیل کا خیال آتے ہی اُس کے ہونٹوں پر ... پھر مُسکراہٹ آئی۔ وہ اُس کے لیے دل کے ... میں جگہ ضرور پاتی مگر اُس کے خیالات عجیب ... وہ کہتا: "یونیورسٹی کی لڑکی سے دوستی کی جاسکتی ... کے ساتھ تفریح کی جاسکتی ہے مگر وہ مرد کو سکون ... دے سکتی۔"

سہیل کی اِنھی باتوں سے وہ اندازہ لگا لیتی ... کا ذہن پڑھ لیتا ہے، اُس کے سامنے وہ مجرم سی ... کہ پتہ نہیں کس لمحے سہیل اُس کی کمزوری پکڑ لے ... نے سہیل کا خیال ذہن سے کھُرچ ڈالا۔ وہ سوچتی ... چلنے والے کا بھی کبھی ہاتھ تھاما جاسکتا ہے۔ وہ ... سے گزر جاتا ہے اور کبھی پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھتا ... سے تعلق تو بس اِتنا ہوتا ہے کہ نگاہیں اُٹھائیں، ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور پھر آگے چل نکلے ... دو چیونٹیاں چلتے چلتے ایک دوسرے سے کانا پھُوسی ... کر کے پاس سے گزر جاتی ہیں۔ زندگی کی راہ پر ... ہر آن دھڑکن بڑھتی جاتی ہے لیکن یہ راہ اس قدر ... ہوتی ہے کہ دھڑکن بڑھنے سے کوئی کہانی جنم نہیں ... لیتی پھر فوراً ہی وہ اپنے خیالات کے ہیولے ... ان سب کا موازنہ کرتی تو یہ سارے اُس کے آگے ...

لملا آتے اور پھر سب وقت کے ساتھ اُس کی زندگی کے پس منظر میں گرتے رہے۔ اُس کی یادوں کا یہ پس منظر اُنھیں نگلتا رہا۔

وہ اپنے خیالات کے ہیولے سینے سے لگائے زندگی کی پگڈنڈی پر چلتی رہی، زندگی کے ہر موڑ پر تنہا کھڑی ہر آنے جانے والے کو دیکھتی رہی اور پہچاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کسی میں اُس کے ہیولے کی مشابہت موجود ہو۔ اُسے یقین تھا کہ کسی موڑ پر اُس کے خیالات کا ہیولا اُس کا انتظار کرتا ہُوا ملے گا۔ ماں باپ مطمئن تھے کہ اُس نے تعلیم مکمل کرلی ہے، اب جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا رشتہ ملے گا لیکن وہ زندگی کی پگڈنڈیوں پر اکیلی ہی چلتی رہی اور فاصلہ بڑھتا رہا۔ وہ دیکھتی اُس کا ہیولا سامنے کھڑا ہے مگر چلتے چلتے وہ تھکتی جارہی تھی۔ وقت کو بھی پر لگ گئے تھے۔ جاں گسل انتظار کی یکسانیت سے اُکتا کر اور اپنے آپ کو بہلانے کے لیے اُس نے ایک کمپنی میں ملازمت کرلی۔ ماں نے مخالفت نہ کی اور باپ کو یہ کہہ کر چُپ کرا دیا کہ اس کا دل ہی بہلتا رہے گا۔ عصمت کے اس کمپنی میں داخل ہوتے ہی ایک دم ایک تبدیلی آگئی یہ تبدیلی خود عصمت نے بھی محسوس کی۔ جہاں پہلے لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے رہتے تھے، اب ان میں زندگی کی تازگی آگئی تھی۔ یہ تبدیلی محسوس کر کے آخر ایک روز صدّیقی صاحب نے اُس سے کہہ دیا۔

"مِس عصمت! آپ نے تو اس دفتر کی کایا ہی پلٹ دی!"

وہ مُسکراتی ہُوئی واپس اپنی سیٹ پر آگئی ___ کام کرتے کرتے کبھی اِردگرد نظر ڈالتی تو کئی نظروں کو اپنی طرف دیکھتے ہُوئے پاتی اور اُس کے گلابی چہرے پر شفق اُبھر آتی۔ اُسی شام تھکی ہاری دفتر سے گھر پہنچی تو معلوم ہُوا اُس کے پاس ہی بیٹھنے والے خالد نے اُس کے لیے پیغام بھجوایا ہے۔ اُسے غُصّہ آگیا۔ اُس نے سوچا

> بحیرۂ رُوم کے ساحل پر ایک دن ایک گدھے کی ملاقات فورڈ گاڑی سے ہُوئی۔ یہ پُرانی فورڈ کا ذکر ہے جو اس وقت موٹروں میں ناقص تصوّر کی جاتی ہے۔ گدھے نے فورڈ سے پُوچھا: "آپ کون ہیں؟" فورڈ نے کہا: "مَیں موٹر کار ہُوں۔" گدھا ہنس کر بولا: "مَیں گھوڑا ہُوں۔"
>
> (ایم آر کیانی۔ افکارِ پریشاں)

کہ دفتر میں کیسا چُپ چاپ اور نگاہیں نیچی کیے بیٹھا رہتا ہے۔ اُس کے ماں باپ نے اُس کی رائے لی تو اُس کے سامنے اُس کا ہیولا آگیا اور عصمت نے فوراً انکار کر دیا۔ پھر عصمت نے دفتر میں دیکھا کہ خالد نے اپنی سیٹ دوسرے کمرے میں لگوا دی۔ سب اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی حماقت کر رہا ہو کیونکہ ہر شخص اپنی سیٹ وہیں لگوانا چاہتا تھا مگر وہ بے پروائی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ پھر صدّیقی صاحب کے پاس ایک فائل لے کر کسی کام سے چلی گئی۔ وہ دیکھتے ہی یُوں خوش ہُوئے جیسے اُسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

"مَیں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا،" اُنھوں نے ملائمت سے کہا۔ عصمت نے صدّیقی کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ وہ بھی اُس وقت اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی تیز نگاہوں نے عصمت کی رُوح کو جھنجھوڑ دیا۔ اُس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی؛ کیونکہ کئی دنوں سے وہ صدّیقی اور اپنے ہیولے کا موازنہ کر رہی تھی۔ صدّیقی بالکل اُس کے معیار کی طرح وجیہہ، پڑھا لکھا اور اعلیٰ منصب والا تھا۔ اُسے اپنے سامنے اپنے خوابوں کا ہیولا بیٹھا نظر آیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور یہ کہنے کے لیے کئی دنوں سے سوچ رہا ہُوں۔"

خود عصمت بھی اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے خوابوں کا ہیولا مجسّم بن جائے اور اُسے اپنے ساتھ کہیں دُور لے جائے۔ عصمت کے چہرے

پر تجسّس کے تاثرات نمایاں تھے، جو شاید صدّیقی نے پڑھ لیے۔

"میں آپ سے شادی . . ."

اُس لمحے اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کے دل کے مندر میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں اور وہ اپنے جذبات کی متلاطم موجوں پر بہتی چلی جا رہی ہو۔ اس کے آگے عصمت میں سُننے کی تاب نہیں تھی، وہ کمرے سے بھاگ گئی۔ اُس کے رُوئیں رُوئیں سے پھلجڑیاں سی چھُوٹنے لگیں۔ وہ سوچنے لگی کہ صدّیقی اُس کے لاشعور کی یہ بات کیسے سمجھ گیا، جو ابھی اُس کے اپنے تصوّر میں بھی نہیں آئی تھی۔ شاید خیالات اور رُوح کا سفر ایک ہی ہوتا ہے لیکن صدیقی کے ایک ہی جملے سے اُس کے لاشعور کی ساری خواہشات اُس کے شعور کے دامن میں آ پڑیں۔

چھُٹّی ہونے پر صدّیقی نے اُسے اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تو وہ راضی ہو گئی۔ اس سے پہلے اگر صدّیقی اُس سے یہ کہتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتی اور صاف انکار کر دیتی۔

اس کے بعد نہ جانے کیوں چھُٹّی ہونے کے وقت وہ روز یہی چاہتی کہ صدّیقی اُسے اپنے برابر بٹھا کر لے جائے اور یہ سوچتے ہُوئے اُسے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا کوئی خوف بھی محسوس نہ ہوتا۔ ایسی ہی سوچوں میں گھری ہُوئی اپنی میز کا سامان سمیٹ رہی تھی کہ نہ چاہنے کے باوجود اُس نے اپنے سامنے سے گزرتے ہُوئے صدّیقی کو اُمنگی نظروں سے دیکھا۔ اُس نے بھی لمحے بھر کو اُس کے پاس ٹھہر کر اُسے پھر وہی پیشکش کی تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غیر شعوری طور سے جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ صدّیقی کا گھر راستے میں تھا، اُس نے کہا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرا گھر دیکھ لیجیے اور ایک پیالی چائے بھی۔ اس کے بعد مَیں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

وہ انکار یا اقرار بھی نہ کر پائی تھی کہ صدّیقی نے کار اپنے گھر کے سامنے روک دی وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور صدّیقی نے عصمت کو ایک سجے سجائے کمرے میں جا بٹھایا۔

"آپ تنہا ہی رہتے ہیں؟" عصمت نے پہلی بار پُوچھا۔

"ہاں۔" صدّیقی نے گہری سانس لیتے ہُوئے کہا۔

عصمت کو جانے کیوں، اُس پر ترس آیا، صدّیقی اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "شادی سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ہو گا۔"

عصمت کے گالوں پر قوسِ قزح لہرا گئی۔ جانے کیسے وہ اُس کے دل کی بات لے اُڑا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ صدّیقی نے اپنے بازو اُس کی طرف بڑھا دیے۔ اس پھندے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بَل کھا کے رہ گئی۔ اُسے اپنے خیالوں کا ہیولا دھندلا ہوتا نظر آیا صدّیقی کی آنکھوں میں اُس کے ہیولے کی جگہ اُس وقت صدّیقی خود جھانک رہا تھا۔ وہ اُس کے وجود کی صاف و شفّاف چادر پر اپنے قدموں کے نہ مٹنے والے نشان چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اُسے ایسی قبر بنا دینا چاہتا تھا جہاں آئے دن لوگ فاتحہ پڑھنے آتے ہوں اور وہ لمحے بھر کی چھاؤں کی خاطر اُسے زندگی بھر کے لیے تپتی دھوپ میں جلتا چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

"اتنے بڑے افسر کی بیوی تم آسانی سے نہیں بن سکتیں۔" صدّیقی نے اُس کی ذات کے بارے میں اُس کے جسم کے لحاظ سے رائے قائم کی اور اُس کی رُوح کو مادّے کی ترازو میں تولا۔ صدّیقی کی فطری خصلت اُبھر آئی جو مرد کی گھُٹّی میں پڑی ہوتی ہے۔ عصمت اپنی عصمت ہی کی قُوّت سے اُسے دھکیل کر علیحدہ ہو گئی۔ اور اُس کے اندر کے اندھیرے میں اُس کو لڑکھڑاتا ہُوا چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ گھر پہنچ کر وہ اوندھے مُنہ پلنگ پر گر پڑی اور بہت دیر تک روتی رہی۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کا ہیولا اُس پر ہنس رہا ہو اور پھر اگلے روز اُس نے

ENC-K/3-1-85

دفتر جانا بند کر دیا۔ ماں باپ نے بھی زیادہ نہیں کُریدا۔

عصمت زندگی کی پگڈنڈی پر تھکے تھکے قدموں سے چلتی رہی۔ اُس کی زندگی کی شاہراہ پر مختلف سمتوں سے پگڈنڈیاں آتیں جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی جاتیں۔ ہیولا اُس کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا اور جیسے جیسے وہ اُس کے پیچھے چلتی، اُس پر گہری چھانے لگتی۔ ایک روز وہ ایک مصروف سڑک سے گزر رہی تھی کہ اُسے سہیل، انور اور شیرازی تینوں ساتھ ہی ساتھ مل گئے۔ معلوم ہُوا شیرازی اور انور کی شادی ہُوئے کئی سال ہو چکے ہیں اور وہ بہت خوش ہیں۔ سہیل کے ابھی تک وہی خیالات تھے۔ اُس نے وہی بات پھر کہی:

"پہلے تو لڑکیاں اپنے معیار کے چکر میں کسی کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتیں لیکن پھر اُن کا یہ معیار اُنہیں کبھی نہیں ملتا۔"

عصمت کو محسوس ہُوا جیسے سہیل نے اُس کے دل میں چُٹکی بھری ہو اور اُس کے اندر چھُپے ہُوئے چور کو پکڑ لیا ہو۔ وہ گھبرا کر اُن سے رُخصت ہُوئی اور ایک دُکان میں گُھسی تو ٹھٹک کر رہ گئی کیونکہ خالد کسی لڑکی کا ہاتھ تھامے نکل رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہیولے کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو کہیں کھو گیا تھا۔ اُس لمحے وہ اس ابدی تنہائی کو محسوس کرنے لگی جو عمر بھر سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے اور جس کا تعلق ہمارے ماحول سے نہیں بلکہ ہماری رُوح سے ہے۔

وہ سوچتی ہم سب ایک دوسرے کے لیے جنم جنم کے اجنبی ہیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر آئی اور آئینے کے سامنے سے گزرتے ہُوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا کیونکہ اُس کے سر میں سفید بال چمک رہے تھے۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے اُس کے دل کو دونوں ہاتھوں میں لے کر نچوڑ دیا ہو اور اُس کا خُون قطرہ قطرہ اُس کی رُوح پر گر رہا ہو۔

عصمت اپنی پُرانی کتابیں جھاڑ رہی تھی کہ ماں آ گئی۔ ماں کے لہجے اور چال میں اب وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔

"عصمت! تم سے بات کرنی ہے۔"

"امّی! مجھے معلوم ہے آپ کیا بات کریں گی۔" اُس نے بے پروائی سے کہا۔

ماں کا دل بیٹھ گیا مگر اُس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

"بیٹی! ایک رشتہ آیا ہے۔"

"رشتہ... رشتہ... رشتہ۔" وہ جھنجھلا گئی۔ "امّی! رشتے آنے کب بند ہوں گے۔"

ماں نے افسردہ لہجے میں کہا:

"وہ تو بند ہو ہی گئے ہیں، ہم نے بہت سے اچھے اچھے رشتوں کو ٹھکرا دیا مگر اب سوچنا پڑے گا۔ ایک لڑکا ہے میٹرک پاس اور کلرک۔"

عصمت کو یُوں لگا جیسے ایک سرد اور تاریک خلا میں معلق ہو کر رہ گئی ہو۔ ماں کی انہی باتوں سے اکثر ایسی سوچیں، چور راستوں سے اُس کے دماغ میں داخل ہو جاتیں۔ پھر یہ سوچیں یادوں میں ڈھلنے لگتیں اور وہ چاہتی کہ گزرا ہُوا وقت واپس آ جائے لیکن گزرا ہُوا وقت تو ہمیشہ یادوں کی ایک حسین اور طویل داستان اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ عصمت نے خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھا اور ایک کتاب کی گرد جھاڑتے ہُوئے محض خاموش رہ کر اُس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

"شام کو وہ دیکھنے آ رہے ہیں۔" ماں کی آواز کسی گہرے کھڈ سے آتی ہُوئی لگی۔ اُس نے یُوں محسوس کیا گویا اُس کی ماں بھی اُس کی زندگی کی کتاب سے گرد صاف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ شام کو آنے والوں کے لیے خُوب خُوب اہتمام ہُوا اور سلام کرنے کے لیے حسبِ معمول عصمت کو بلوایا گیا۔ عصمت نے کنکھیوں سے دیکھا کہ

لڑکا اُسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بکر منڈی میں لوگ جانوروں کو پرکھتے ہیں۔ اگلے روز ہی جواب نفی میں آ گیا۔ لڑکے کا کہنا تھا:

"مجھے اپنی رکھوالی کے لیے بُزرگ عورت نہیں چاہیے۔"

عصمت کی ماں نے سر تھام لیا۔ عصمت خاموشی سے کوئی کتاب پڑھتی رہی جیسے اُسے کوئی افسوس ہی نہ ہُوا ہو۔ مایوسیوں نے اُس کے احساس کو ڈس لیا تھا۔ اُس کی حیثیت ایسے جہاز کی تھی جس کی روشنیاں بُجھ گئی ہوں، جو سمندر میں مارا مارا پھر رہا ہو اور جو صرف اُس طرف جاتا ہو جہاں کوئی اُسے خوش آمدید کہنے والا نہ ہو۔ وقت اندھیرے کو ساتھ لیے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔

پھر عصمت کے چچا نے بتایا کہ اُن کا ایک دوست اپنے بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور آج اسی لیے صبح ہی سے عصمت کی ماں نے شور مچا رکھا تھا اور تیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پھر ملی جلی آوازوں سے عصمت کو معلوم ہُوا کہ مہمان آ گئے ہیں۔ اُس نے جھانک کر دیکھا صرف ایک آدمی چچا اور ابا کے پاس بیٹھا تھا۔ سیاہ رنگت، چھوٹا قد اور موٹا جسم۔ اُس نے اپنے خیالوں کے شہزادے کو تصور کی وادیوں میں دُور دُور تک تلاش کیا مگر اُس کا کہیں پتا نہ چلا۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس نے چُپکے سے کہیں دم توڑ دیا ہو گا۔ وہ بھی اُسے تلاش کرنے کے لیے اب تک زندگی کے ریگستان میں ننگے پاؤں پیدل چلتی رہی تھی اور اب تھک چکی تھی زندگی سے، اپنے آپ سے، اپنے خیالات سے، دُنیا سے، ہر چیز سے۔ اپنے وجود کا سارا بوجھ وہ اپنی ٹانگوں پر اُٹھائے پھرتی رہی۔ ماں کی آواز سے وہ چونکی اور حسبِ معمول اُسے سب کے سامنے جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد مہمان نے رُخصت چاہی۔ سب نے خوش اخلاقی سے رُخصت کیا اور چچا مہمان کو باہر تک چھوڑنے گئے۔ عصمت اپنے کمرے میں اُس اُمیدوار کی عدم اعتمادی کے احساس کے ساتھ آ گئی جو نوکری کا انٹرویو دے کر کمرے سے نکل رہا ہو۔ کھڑکی کے پاس پردہ سرکانے کی غرض گئی تو ماحول کی پُوری تشنگی اُس کی رُوح پر اُتر آئی۔

وہ صاحب کہہ رہے تھے:

"بھئی لڑکی کی عمر بہت ہے۔"

اُس لمحے عصمت کو اپنی نبضیں تھمتی محسوس ہوئیں۔ اُس کا دماغ کھمبوں کے سروں سے لگے تاروں کی مانند سائیں سائیں کرنے لگا۔ اُس کے کانوں میں ایک دم بہت ساری گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے گول دائرے گھومنے لگے اور اُسے یُوں لگا جیسے اُس کے خیالات کا ہیولا اُس کے سامنے کھڑا اُس پر قہقہے لگا رہا ہو۔

"مگر آپ کو تو اپنے بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے اُن کی ماں کی ضرورت تھی۔" چچا کی آواز کمزوری کی وجہ سے لرز رہی تھی۔

چچا کی اس بات پر اُن صاحب نے جواب دیا:

"ٹھیک ہے مگر مجھے اپنے لیے بیوی بھی تو چاہیے!"

مئی ۱۸۵۷ء میں شملے میں خطرے کی گھنٹی بجی تو کتنے ہی انگریز بہادر اپنی عورتوں کو بے آسرا چھوڑ کر غاروں میں جا چھپے۔ جب ذرا حالات سدھرے تو ایک انگریز خاتون مس کلیمینٹینا برکس نے مقامی اخبار میں ایک دلچسپ اشتہار دیا: "شملے میں مقیم انگریز خواتین ایک جلسہ منعقد کر رہی ہیں جس میں غور کیا جائے گا کہ اپنے مردوں کا حوصلہ کس طرح بڑھایا جائے جو انہیں چھوڑ کر غاروں میں جا چھپے ہیں بلکہ اُن کی بے آرامی سے وہ بے چین ہیں اور نرم و گرم بستر سجانے میں لگی ہیں کہ جب وہ بے چارے تھکے ہارے آئیں تو فکرِ فردا اور غمِ امروز سے بے نیاز ہو کر خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ سکیں۔"

خلائی عجائبات

انسان کے مستقبل کا دارومدار
اب خلا میں ہونے والے
حیرت انگیز تجربات پر ہے۔

تنویر قیصر شاہد

۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو ایک ایسا عظیم واقعہ پیش آیا جس کی مثال پوری سائنسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس روز انسان ارضی کشش ثقل کی حدود توڑ کر خلائے بسیط کی وسعتیں پھلانگتا ہُوا سطح قمر پر جا پہنچا اور یُوں اُس کی وہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچی جس کے وہ خواب صدیوں سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ انسان چاند کو مسخر کر چکا ہے اور اب اُس کی نظریں چاند سے پرے سیاروں اور ستاروں پر گڑی ہوئی ہیں۔

بعید تر مستقبل میں ایک وقت ایسا آنے والا ہے

جب ہمارا مسکن 'زمین' برباد ہونے والا ہے۔ زندگی سے معمور اس وسیع سیارے کو عظیم ستارہ سورج نگل جائے گا۔ اس مہیب خطرے سے نبٹنے کے لیے حضرتِ انسان نے ابھی سے پیش بندی شروع کردی ہے۔ اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ دُور خلائے بسیط میں تیرتے اجرامِ فلکی پر زندگی کے آثار جلد از جلد تلاش کرلیے جائیں تاکہ وہاں انسانی بستیاں تعمیر کی جاسکیں۔

خلا کے لیے تربیت

یہ ۲۰۴۰ء ہے۔ آپ ابھی ابھی خلائی شہر میں خلائی پرواز کی تربیت کے لیے پہنچے ہیں۔ تربیتی کورس کے پہلے حصے میں، آپ کو خلائی گاڑیوں کی ساخت اور اُن کی مشینری کے بارے میں سکھایا جائے گا لیکن عظیم خلائی درسگاہ میں داخلہ لینے کی خاطر آپ کو زمین ہی سے خلا کے بارے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آنا ہوگا۔ اس طرح آپ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ خلائی تربیت حاصل کرسکیں گے۔

یہ شہر دُنیا کا خلائی دارالحکومت ہے۔ اس کی تعمیر میں بیک وقت کئی ممالک نے حصّہ لیا ہے کیونکہ اَب خلائی سفر بین الاقوامی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ یہ خطِ استوا کے عین اُوپر، مشرقی افریقہ کے بالمقابل واقع ہے۔ یہاں سے زمین کا محور خلائی جہازوں کو مدار میں جانے کے لیے خاصی مدد فراہم کرتا ہے۔ خلائی جہاز ارضی مُستقر سے اُٹھ کر بحیرۂ ہند کے اُوپر سے پرواز کرکے وسعتِ خلا میں کھو جاتے ہیں۔ خلائی شہر میں تربیت کی مدت خاصی طویل اور نصاب خاصا مشکل ہے۔ آپ اپنی کلاس میں بیٹھے جُونہی دُور سے کسی راکٹ کے فائر ہونے کی آواز سُنتے ہیں، آپ کے دل میں یہ خواہش فوراً مچل اُٹھتی ہے کہ کب کورس ختم ہوگا اور کب آپ بذاتِ خود اُن خلائی راکٹوں کو اُڑانے کے قابل ہوں گے۔

سب سے پہلے آپ کو خلائی جہازوں کو کنٹرول کرنا اور اپنے خلائی لباس کے متعلق پُوری معلومات جمع کرنا ہوں گی۔ اس کے علاوہ جہاز خود چلانے، کمپیوٹر کے استعمال ریڈار یا لیزر شعاعوں کی مدد سے خلا میں اپنی منزلِ مقصود تلاش کرنے کی مکمل تربیت حاصل کرنا ہوگی۔ ان کے علاوہ آپ کو اپنے اوپر اس بات کا پُورا اعتماد اور یقینِ کامل ہونا چاہیے کہ آپ خلائی سٹریس اور سٹرین کو جھیلنے کے قابل ہوگئے ہیں، کیونکہ خلائی پرواز کے دوران میں آپ کے جسم پر مرکز گریز قوّتوں کا غیر معمولی دباؤ ہوگا اور خلائی گاڑی میں ایک عجیب وغریب حالت میں کام کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ، آپ کو خلا میں اپنی سہولت اور آسان تر زندگی کے لیے قمری ارضیات کی سائنس یا صفری کششِ ثقل کی تمام تر اطلاقات پر عبور حاصل کرنا پڑے گا۔

اور آخر کار وہ دن طلوع ہوتا ہے جس روز آپ عظیم خلائی سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ کو ذہنی اعتبار سے پُوری طرح تیار ہونا ہوگا کہ ابھی کیا ہونے والا ہے۔ حقیقی خلائی پرواز سے قبل، آپ کو مصنوعی ماحول میں اس بات کی پُوری تربیت دی جاچکی ہے؛ چنانچہ وہ خوش نصیب لمحہ بھی آپہنچتا ہے جب آپ کو خلائی شٹل اُٹھا کر مدار میں لے جائے گی۔ اِس کے آگے آپ کے لیے عظیم سفر کی وُسعتیں ہوں گی۔ آپ راستے کی تمام تر خلائی بستیاں، خلائی اسٹیشنوں، مدار پر موجود کارخانوں، قمری اڈّوں، اور سیاروں کو پھلانگتے چلے جائیں گے ـــــ شاید ایک ایسا زمانہ بھی آجائے جب منزلِ مقصود ان سیّاروں سے بھی پرے ستارے ہوں!

سفر کی آخری حدود

"ہر وہ شے جو اوپر جاتی ہے اُسے ضرور واپس آنا پڑتا ہے۔" یہ ایک قدیم قانون ہے جو آج بھی اُسی طرح لاگو ہے۔ پہلے خلائی راکٹ اپنے ہمراہ مصنوعی سیارے لے جاتے تھے۔ بعض ایسے طاقتور راکٹ بھی تھے جنہوں نے اپنے دوش پر سوار خلائی جہازوں کو انتہائی خلا میں پہنچا دیا اور یہ مصنوعی سیارچے اور خلائی جہاز پھر کبھی واپسی کا سفر اختیار نہ کرسکے۔ اب ہمارے پاس خلائی شٹل ہیں جو راکٹ کی طرح اُٹھتی ہیں اور اپنا سفر مکمّل کرنے کے بعد دوبارہ واپسی کا سفر اختیار کرکے، اُسی طرح لینڈ کرجاتی ہیں اس طرح ایک عام ہوائی جہاز اپنی پرواز مکمّل کرنے کے بعد ہوائی اڈّے پر اتر آتا ہے۔ یہ خلائی شٹل بار بار استعمال کی جاسکتی ہے۔ انھی خلائی شٹلوں نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم بار بار خلائی مُہمّات سَر کرنے کو نکلیں اور اخراجات بھی کم سے کم اُٹھیں۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ محض سیر وتفریح کے لیے خلائی شٹل میں بیٹھ کر خلائی سفر اختیار کیا کریں گے۔

وہ خلائی سفر جو محض تفریح کے لیے ہوا کرے گا، اس کا زمانہ ابھی بہت دُور ہے؛ تاہم خلائی شٹل کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیں بار بار خلا میں کام کرنے کے قابل بنا سکے اور اس کی پرواز ہفتہ وار سے ترقی کرکے روزانہ ہوجائے۔ اس طرح خلائی تحقیق میں بے پناہ ترقی ہوگی اور انسان خلا میں دُور دُور تک سفر کرنے کے قابل ہوجائے گا۔ اُس کی جولانگاہ سیّاروں سے نکل کر ستاروں تک جا پہنچے گی۔

خلائی شٹل کے دائرہ کار کو وُسعت دی جارہی ہے۔ اسے اس قابل بنایا جارہا ہے کہ وہ خود مصنوعی سیارے تیار کرکے انھیں مدار میں چھوڑ سکے۔ اس طرح ایندھن اور وقت کی بچت ہوگی۔

وہ اس کے علاوہ سپیس لیبارٹریز کو خلا میں انتہائی بلندی پر لے جانے کا کام سرانجام دے سکتی ہیں جس میں کم ازکم چار سائنسدان بیٹھ کر صفری کششِ ثقل اور ویکیوم پر تجربات کرسکیں گے۔

خلا کے اندر ہی خلائی اسٹیشن تعمیر کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان اسٹیشنوں کی تعمیر میں خلائی انجینئر اور انتہائی اعلیٰ درجے کے روبوٹ حصّہ لیں گے۔ یہ اسٹیشن گول پہیّوں کے مانند سلنڈر نما ہوں گے جو شمسی توانائی سے کام کیا کریں گے۔ خلا کے اُوپر تمام اسٹیشن ایک دوسرے سے منسلک ہوں گے اور اُن کی شکل مکڑی کے جالے کی طرح ہوگی۔ ان اسٹیشنوں کی تعمیر میں کام آنے والا میٹریل خودکار کمپیوٹرائزڈ راکٹ زمین سے خلا میں لے جائیں گے۔ یہ اسٹیشن درجہ بدرجہ بلندی پر تعمیر کیے جائیں گے اور پھر زمین سے خلا میں سفر کرنے کے دوران میں خلائی شٹل کے لیے یہ اسٹیشن 'سنگِ میل' کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔

خلائی ہوٹل

آپ ذرا تصوّر کیجیے کہ مستقبل میں خلانوردوں کا ایک گروہ خلائی اڈّے پر جمع ہے اور وہ سب کے سب اس سفر کے بارے میں گفتگو کررہے ہیں۔ اُن میں سے کچھ تو وہ ہیں جو چاند سے واپس آئے ہیں، کچھ وہ ہیں جو خلائی بستیوں کی طرف روانہ ہونے والے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نظامِ شمسی کی مزید تحقیق کے لیے اُڑنے والے ہیں۔ اب مختلف منازل کے باوجود ان سب کو ایک خاص منزل تک اکٹھے ہی پرواز کرنا ہے۔ پہلا پڑاؤ خلا میں، زمین کے مدار پر بنے ہُوئے خلائی ہوٹل پر ہوگا۔ اُس ہوٹل تک خلائی شٹل پہنچا کر واپس آجائے گی، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ہوائی جہاز مسافروں کو ایک ملک میں چھوڑ کر واپسی کا سفر اختیار کرلیتا ہے۔

یہ خلائی ہوٹل ایک چمکتے دمکتے دھاتی پہیّے کے مشابہ ہے جس پر بھدّی شکل کی چند عمارتوں کا پیوند لگا ہے۔ اس کے اردگرد خلائی جہازوں کی عجیب وغریب شکلیں کھڑی ہیں جن کے مسافر بھی یہاں آرام کرنے کی غرض سے رُکے ہیں اور اس ہوٹل کے چاروں طرف بڑی بڑی دیوہیکل پلیٹیں اور تختے چمک رہے ہیں۔ یہ تختے دراصل شمسی

توانائی سے چلنے والے جنریٹر ہیں جو اس ہوٹل کی تمام تر توانائی کو پورا کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

خلا کے اس حصے میں جہاں ہوا اور وزن کا کوئی وجود نہیں، بڑی بڑی عمارتیں آسانی سے تعمیر کی جاسکتی ہیں۔

آپ خلائی شٹل سے نکل کر اس ہوٹل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کے اندر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ ایک اور خلائی محافظ گاڑی میں سوار ہو کر اپنی آخری منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ یہ خلائی محافظ گاڑیاں صرف خلا میں پرواز کرنے کے قابل ہیں۔ ان کی منازل خلائی ہوٹل، خلائی بستیاں اور خلائی اسٹیشن اور خلائی فیکٹریاں ہیں۔ ان کا سفر انہی کے درمیان ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے۔

خلائی سرگرمیاں

خلا میں مصنوعی سیاروں سے ہم پہلے ہی بہت مفید کام لے رہے ہیں۔ ان مصنوعی سیاروں کی بدولت ہم ٹیلی ویژن پر پوری دنیا کے پروگرام دیکھ سکتے ہیں اور دور دراز ممالک سے پلک جھپکنے میں ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔

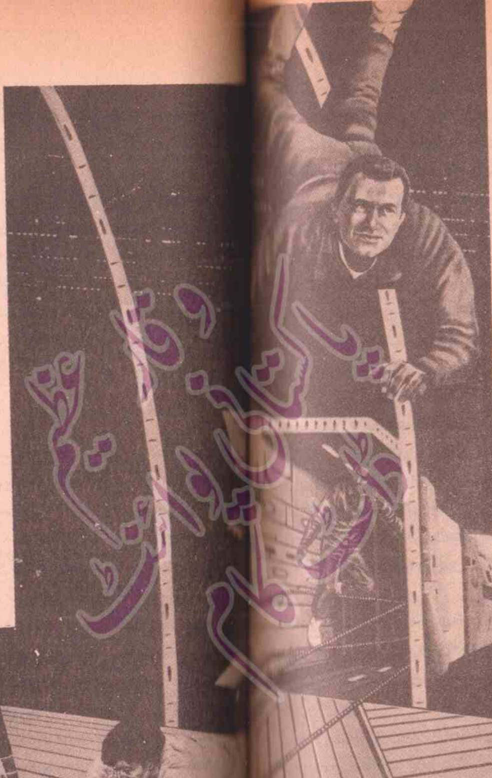

اس کے علاوہ یہ سیارے ہمیں موسمی حالات سے باخبر رکھتے ہیں۔ مستقبل میں ہمارے استعمال میں آنے والی تمام تر توانائی اور تمام ضروری اشیائے زندگی خلائی صنعت کے ذریعے تیار کی جاسکیں گی۔

سورج اپنی توانائی، روشنی اور حرارت ہر وقت اور متواتر خلا میں چاروں طرف بکھیرتا رہتا ہے۔ جلد ہی اس تمام تر توانائی پر قابو پاکر ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دنیا میں کہیں بھی بجلی کی پیداوار میں کمی کا سوال پیدا نہ ہوگا۔

اس کے لیے زمین سے بہت بلندی پر مدار کے اوپر شمسی توانائی سے چلنے والے بہت بڑے بڑے سیارچے بنائے جائیں گے۔ ان سیارچوں کی بیرونی سطحوں پر بڑے بڑے تختے ہوں گے جن پر شمسی سیل نصب کیے جائیں گے جب یہ شمسی سیل سورج کی توانائی سے گرم ہو جائیں گے تو توانائی کو بجلی میں تبدیل کرکے زمین پر ارسال کر دیں گے۔

یہ توانائی، مائیکروویوز کی شکل میں زمین کی طرف ارسال کی جائے گی۔ یہ شمسی توانائی کے سیارچے اتنی زبردست مقدار میں بجلی پیدا کریں گے کہ ان سے قبل زمین پر کسی پاور اسٹیشن نے پیدا نہیں کی ہوگی۔

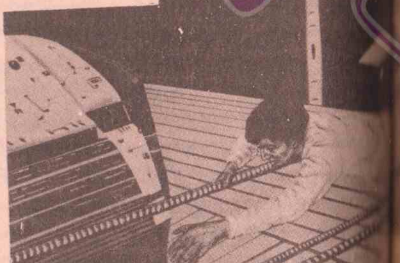

ایک خلائی شٹل خلائی ہوٹل کے دروازے سے آلگی ہے۔ مسافر دروازے میں داخل ہوتے ہیں جہاں بے وزنی کی کیفیت ہے۔ وہ داخلی دروازے 'چیک اِن پوائنٹ' تک پہنچنے کے لیے ہینڈ ریل استعمال کرتے ہیں۔ ایک آدمی ہینڈ ریل چھوڑ کر خلائی ہوٹل سے باہر خلا میں تیر رہا ہے۔

اس کے علاوہ خلائی کارخانے تعمیر کیے جائیں گے جن کا تعلق خلائی پاور اسٹیشنوں سے ہوگا۔ خلا میں چونکہ ہوا کی کثافتیں نہیں ہوتیں اس لیے خالص ترین کرسٹل صنعت وجود میں آئے گی جو الیکٹرانکس کی دُنیا میں انقلاب برپا کر دے گی۔ ایسی دوائیں بھی بنائی جائیں گی جو سرطان کے مہلک مرض کا خاتمہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔ خالص ترین کرسٹل صنعت کے علاوہ، صفری کششِ ثقل کا فائدہ اُٹھا کر ایک ایسی دھات بنائی جائے گی جو فوم سے زیادہ نرم مگر حد درجہ طاقتور اور زیادہ سے زیادہ گرمی کی شدّت برداشت کرنے کے قابل ہوگی۔

فلکیات ایک اور ایسا وسیع فیلڈ ہے جس میں خلائی صنعت کی ترقّی سے بہت بڑا انقلاب برپا ہوگا۔ دُور خلا کی وُسعتوں میں دُوربینیں ایسے ہلکے دھبّے بھی تلاش کرلیں گی جن کا زمین سے مشاہدہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

خلائی محافظ گاڑیاں

ہمارے ہاں جس طرح ہوائی جہازوں کی باقاعدہ سروس جاری رہتی ہے، اسی طرح کل ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب خلا کے لیے بھی باقاعدہ خلائی سروس شروع ہو جائے گی اور لوگ چاند اور دوسرے نظامِ شمسی کے سیاروں کی سیر کرنے جایا کریں گے۔ اس دُور دراز کے سفر کے لیے خاص قسم کی خلائی گاڑیاں چلا کریں گی جن کے ہمراہ ان خلائی گاڑیوں کی حفاظت کے لیے خاص قسم کے راکٹ بھی سفر کریں گے۔ آپ کا یہ سفر نہایت آرام دہ ہوگا اور آپ پُورے سفر کے پُورے عرصے میں یہی محسوس کریں گے جیسے کسی ہوائی جہاز میں بیٹھے ہیں۔

آپ کو سب سے پہلے زمین کے مدار سے نکلتے کے لیے مضبوط خلائی شٹل میں بیٹھ کر خلائی ہوٹل تک جانا پڑے گا۔ وہاں ہوٹل کے باہر محافظ خلائی گاڑیاں خلائی مسافروں کی مُنتظر ہوں گی اور اگلے سفر پر لے جائیں گی۔

یہ خلائی گاڑیاں جوہری اور زیادہ تر شمسی توانائی [illegible] پرواز کریں گی، اُن کی شکل بڑی بڑی دیوہیکل وہیل [illegible] ایسی ہوگی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اُن کا جسم خالص [illegible] دھات کا ہوگا۔ ان خلائی گاڑیوں میں مسافروں کو پرواز کی ابتدا میں شدید جھٹکوں سے بچاؤ کے لیے خاص [illegible] کیے جائیں گے۔ ان کا سارا اندرونی کنٹرول سسٹم کمپیوٹر کے سپُرد ہوگا اور یہی کمپیوٹر آپ کو نہایت سہولت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔

قمری اڈّے

خلائی گاڑیوں کے لیے پہلا اڈّہ چاند کی سطح پر [illegible] کیا جائے گا۔ یہ اڈّہ سطحِ قمر پر ہوگا جہاں جگہ جگہ بڑے دھبّے نظر آئیں گے۔ اس اڈّے پر بہت گنبد نُما مکان بھی دکھائی دیں گے۔ یہ گنبد نُما مکان [illegible] سطحِ قمر کے اندر بنے ہُوئے کنٹرول رُوم ہیں جو [illegible] پر اُترنے والی خلائی گاڑیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ [illegible] گنبدوں میں انسان بھی رہائش پذیر ہوگا۔ یہ [illegible] حرارت اور خلائی گاڑیوں کے بے پناہ شور اور [illegible] کی خونخوار سردی سے لوگوں کو بچانے کا کام دیتے [illegible] ان میں زیادہ تر سائنسدان، انجینئرز، ٹیکنیشن [illegible] ہیں۔ ان کے علاوہ چند سیّاح بھی ٹھہرے ہُوئے [illegible]

یہ قمری اڈّہ زمین سے نظر نہیں آسکتا کیونکہ [illegible] ریڈیو ڈشز سے بھرا پڑا ہے۔ یہ تمام ریڈیو ڈشز مل [illegible] ایک بہت بڑی دُوربین بناتی ہیں۔ چونکہ اس جگہ [illegible] لہروں میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت نہیں ہوتی اس [illegible] اس پُرسکون ماحول میں یہ دُوربین کائنات کے دُور [illegible] علاقوں سے آنے والے ہلکے سگنل بھی وصول کر [illegible] جو علمِ فلکیات کی تحقیقات کو آگے بڑھاتے ہیں [illegible] مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ خلائی اڈّہ ابھی تک بذریعہ مصنوعی سیارچہ زمین سے مُنسلک ہے۔

دُور اُفق پر جو نیم کروی شکل میں طویل راستہ سا نظر آ رہا ہے، یہ مُون بیس لانچر ہے۔ یہاں سے خلائی شٹل واپس زمین کا سفر اختیار کرتی ہے اور خلائی جہاز اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ قمری اڈّہ چاند کی سطح کے اندر چھپے ہُوئے معدنی ذخائر باہر لانے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں سے روبوٹوں کو معدنی ذخائر دریافت کرنے کے لیے مہمّات پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ معدنی ذخائر خلائی گاڑیوں کے ذریعے زمین پر بھیج دیے جاتے ہیں۔

دُور دراز کی خلائی مہمات پر روانہ ہونے والی خلائی گاڑیاں بھی یہاں سے پرواز کرتی ہیں اور اُن کی مشینری کی مرمت بھی روبوٹوں کی مدد سے کی جاتی ہے۔

فلکیاتی جزیرے

تاحال خلائی سفر صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اس غیر معمولی سفر کے لیے تربیت یافتہ، عزمِ صمیم اور سخت اعصاب کے مالک ہیں۔ خلانوردوں اور خلائی سائنسدانوں کے لیے تو ہر وقت یہ پروازیں تیار رہتی ہیں۔ مستقبل میں جب خلا پر فیکٹریاں، اسٹیشن، اڈّے تعمیر ہو جائیں گے تو اُس وقت بڑی تعداد میں لوگ خلائی سفر پر روانہ ہُوا کریں گے۔ روزگار کی تلاش میں انسان ادھر کا رُخ کرے گا۔

ان میں سب سے زیادہ حیران کُن وہ مرحلہ ہوگا جب خلا میں مصنوعی بستیاں تعمیر کی جائیں گی۔ انسانوں کی رہائش کے لیے مصنوعی ارضیاتی انداز کا ماحول پیدا کیا جائے گا۔ ان بستیوں میں لوگ مستقل طور پر رہائش اختیار کریں گے۔ ان فلکیاتی جزیروں میں وہ اسی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں گے جس طرح زمین کے کسی مُتمدن شہر میں رہتے ہیں۔ وہ تجارت کر سکیں گے، فصلیں اُگا سکیں گے اور انسان کا طرزِ حیات بالکل آئیڈیل ہوگا کہ وہ پُرمسرت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے گا۔ ہر وہ خواہش جو حضرتِ انسان زمین پر رہ کر کرتا ہے، ان فلکیاتی جزیروں میں اُسے میسّر آسکے گی۔

یہ خلائی جزیرے یا خلائی بستیاں زمین اور چاند کے درمیان تعمیر کی جائیں گی۔

خلائی کولمبس

دُور فلکیاتی بستیوں میں رہنا انسان کے لیے اگرچہ خوابناک ہوگا مگر لوگوں کو زندگی کی ضرورتیں پُوری کرنے کے لیے مشکل کام کرنا پڑیں گے۔ کسی فلکیاتی بستی کی تعمیر کے دوران میں سینکڑوں ہزاروں انجینئر سالہاسال تک اَنتھک محنت کر کے اُسے مکمّل کریں گے اور شاید یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی بستی کی تعمیر میں ایک صدی کا عرصہ لگ جائے۔

ان خلائی بستیوں کے لیے میٹریل، چاند اور دوسرے سیاروں کی کانوں سے نکالا جائے گا۔ تعمیر کے بعد ان میں زندگی کے واضح آثار پیدا کرنے کے لیے ان میں مٹّی کی بھاری تہ بچھائی جائے گی۔ نظامِ تنفّس کو بحال کرنے اور آسانی پیدا کرنے کے لیے مصنوعی ہوا کا ماحول پیدا کیا جائے گا اور آخر میں پانی کی سپلائی کا اہتمام ہوگا اور پودوں کی کاشت اس کے ساتھ ہی شروع کر دی جائے گی۔ مٹّی اور آکسیجن چاند سے لائے جائیں گے۔ خلا کی کاسمک ریز سے بچاؤ کے لیے ان کی بیرونی سطح پر دبیز تہ چڑھائی جائے گی۔ یہ تہ ایک شیلڈ کی طرح ہوگی اور ہر قسم کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی اس میں بدرجۂ اتم قوت موجود ہوگی لیکن پانی اور پلاسٹک کی پیداوار کے لیے ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن زمین سے تیز ترین خلائی راکٹوں کی مدد سے ان بستیوں میں لائے جائیں گے۔

چاند سے پرے، مریخ اور عطارد کے علاوہ ان خلائی بستیوں کے مکینوں کو بذاتِ خود ایسی اشیا کی تلاش کرنا ہوگی جو اُن کی زندگی مزید بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ اس کے لیے اُنہیں اپنی بستیوں سے نکل کر بیرونی خلا میں محفوظ راکٹوں میں سوار ہونا پڑے گا۔

جوں جوں خلا میں ان بستیوں کا جال پھیلتا چلا جائے گا، توں توں خلائی مُہم جوؤں کی تعداد اور حوصلہ بڑھتا جائے گا۔ جس طرح کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا، اسی طرح خلائی مُہم جو بھی خلا کے اندر نئی نئی بستیاں تلاش کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

خلا میں زمین کے علاوہ آٹھ اور بھی نظامِ شمسی کے سیارے موجود ہیں۔ ان سیاروں کے اپنے اپنے مجموعی چاندوں کی تعداد چالیس ہے۔ تو کیا مستقبل میں ایک دور ایسا بھی آئے گا جب ہم ان آٹھ سیاروں اور ان کے چاندوں کی سیر اور انہیں اسی طرح مسخر کر سکیں گے جس طرح چاند مسخر ہو چکا ہے؟ یا پھر کیا ان چاندوں کو ہم اپنی زندگی کا تیسرا بڑا محور بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ اگر سائنس کی ترقی کی رفتار یہی رہی تو مستقبل میں ایک ایسا دور بھی آنے والا ہے جب نظامِ شمسی کے بقیہ آٹھ سیارے اور اُن کے تمام چاند ہمارے پاؤں تلے روندے جا چکے ہوں گے۔ اور ہم ان پر بھی انسانی بستیاں تعمیر کر ڈالیں گے۔

ان سیاروں میں بعض کا درجۂ حرارت ناقابلِ برداشت حد تک گرم اور بعض کا درجۂ حرارت ہلاکت خیز حد تک ٹھنڈا ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انسانوں کو ان سیاروں پر بستیاں قائم کرنے سے قبل، ان کے درجۂ حرارت کو پہلے معمول کے مطابق تبدیل کر کے انسانی مزاج کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

منصوبہ یہ ہے کہ زمین کے نزدیک ترین سیارے مریخ اور زہرہ کو سب سے پہلے ان تجربات کا مرکز بنایا جائے۔ زہرہ کا درجۂ حرارت بہت ہی زیادہ گرم اور مریخ کا بہت ہی زیادہ ٹھنڈا ہے۔ ان دونوں سیاروں کے ماحول کو مصنوعی طریقے سے کسی طرح بدل کر سب سے پہلے ایک خاص قسم کی سمندری کائی پر ان علاقوں میں تجربہ کیا جائے گا۔ یہ کائی ان سیاروں کی کاربن ڈائی اکسائیڈ کو آکسیجن میں تبدیل کر دے گی اور آکسیجن کی وافر مقدار کی وجہ سے انسانی زندگی کا پہیہ وہاں باآسانی حرکت میں آ سکتا ہے۔ مریخ کے برف کے پہاڑ پگھلا کر پانی حاصل کیا جائے گا۔

انسان ان منصوبوں پر عمل پیرا ہو کر اگر اپنے تجربات میں کامیاب ہو گیا تو وہ دن دُور نہیں جب زمین اور چاند، چاند اور مریخ، مریخ اور زہرہ کے درمیان اُسی طرح ٹریفک شروع ہو جائے گی جیسے لاہور اور کراچی کے درمیان سارا سارا دن اور ساری ساری رات ہوائی پروازوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اُردو زبان کے راستے میں اصل رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا بالائی طبقہ چونکہ خود انگریزی ماحول میں پلا ہوا ہے اور اُردو لکھنے بولنے پر قادر نہیں، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے جیتے جی ساری قوم پر انگریزی زبان مسلط رہے۔ پھر یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی انگریزیت ہی کے ماحول میں پال رہے ہیں اور اس بات کا انتظام کر رہے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور آئندہ انہی کی نسل کے قبضے میں رہے۔ ہماری مصیبتوں کا کوئی حل اس کے سوا نہیں کہ ان دیسی انگریزوں سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ امرِ واقع یہ ہے کہ انگریز خود تو چلا گیا، مگر اس کا بھوت ہمیں چمٹ کر رہ گیا ہے۔

(مولانا مودودی۔ فروری ۱۹۵۳ء)

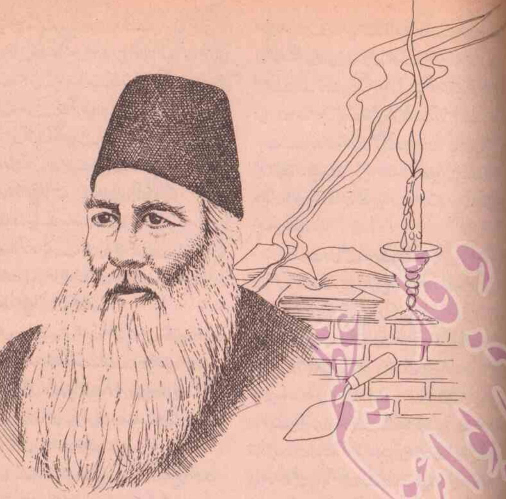

سرسیّد کی اَن کہی داستان

شیخ عبداللہ علیگ کے انتہائی دلچسپ ذاتی مشاہدات

تلخیص : عبدالمجید قریشی

۱۸۸۸ء کا ذکر ہے۔ مَیں اُن دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول لاہور میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور میری عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس برس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہُوا تھا اور سرسید بھی اس میں شریک تھے۔ مجھے اُن کی زیارت کا بڑی دیر سے شوق تھا، لہٰذا مَیں بھی اپنے اُستاد مولانا نورالدّین صاحب کے ہمراہ کانفرنس کے اجلاس پہنچ گیا۔ سرسیّد جہاں تشریف فرما تھے، مَیں وہاں سے کچھ فاصلے پر

بیٹھا تھا؛ چنانچہ میں نے اُنھیں بہت اچھی طرح دیکھا۔

اجلاس کی ابتدا شمس العلما ڈپٹی مولانا نذیر احمد دہلوی کی تقریر سے ہُوئی۔ ڈپٹی صاحب بڑے فصیح البیان مقرر تھے۔ اُن کی تقریروں میں بڑا اثر تھا اور سُننے والے بڑا لطف حاصل کرتے۔ اپنی تقریر کی تمہید میں انھوں نے فرمایا کہ مَیں ایک معمولی مولوی ہُوں اور میرے نام کے ساتھ بی اے یا ایم اے کی ڈگری کا دُم چھلا نہیں لگا ہُوا۔ مَیں جو کچھ کہوں گا، تصنع کے بغیر صاف اور سیدھے سادے الفاظ میں کہوں گا۔

یہ سُنا تو سرسید نے انھیں ٹوکا: "آپ نے یہ کیا کہا؟ آپ ماشاءاللہ مولانا بالفضل اولنا ہیں، پھر یہ کیسے کہتے ہیں کہ نام کے ساتھ دُم چھلا نہیں لگا ہُوا؟"

اس پر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا۔ اس کے بعد ڈپٹی صاحب نے سرسید کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا کہ سید احمد خاں صاحب کو جو مَیں نے پہچانا ہے تو اس پہچان کی بھی کوئی خصوصیت نہیں۔ اُن کے سر پر کوئی سُرخاب کا پر تو نہیں لگا ہُوا کہ آدمی انھیں دیکھتے ہی پہچان لے۔

اس کے جواب میں سرسید نے اپنی تُرکی ٹوپی اُتار دی اور اپنا صاف سپاٹ سر سب کو دکھا دیا کہ دیکھو، میرے کوئی سُرخاب کا پر نہیں لگا ہُوا۔ اس بار پھر قہقہہ بلند ہُوا۔

مجھے سرسید کو دیکھنے کا جو شوق تھا، وہ بہت اچھی طرح پُورا ہو گیا ـــــ جلسہ ختم ہونے کے بعد مَیں اپنے بورڈنگ ہاؤس لَوٹ آیا اور پھر کسی اجلاس میں نہ گیا، البتہ اپنے بعض مسلمان ہم جماعتوں سے بعد ازاں معلوم ہُوا کہ محرم علی چشتی نے، جو لاہور میں ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور سرسید کے سخت مخالف، کوئی خط سرسید کو لکھا تھا جس میں اُن کی بہت توہین کر ڈالی تھی اور اُن کی ذات پر رکیک حملے کیے تھے۔ سرسید نے وہ خط لاہور کے معززین کے سامنے پیش کیا؛ چنانچہ جتنے لوگ وہاں موجود تھے، انھوں نے فیصلہ کیا کہ محرم علی چشتی کا اخبار کوئی خریدے گا نہ پڑھے گا۔

۱۸۹۱ء کے شروع میں میرا دسویں کا نتیجہ نکل آیا۔ مَیں اچھے نمبروں سے کامیاب ہُوا اور تھوڑے دنوں بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہونے علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ لاہور سے علی گڑھ کا یہ سفر اگرچہ طویل تھا مگر سرسید کی دوبارہ زیارت اور حصولِ علم کے پیشِ نظر بڑے آرام سے طے ہُوا۔ رات کے بارہ بجے گاڑی علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ مَیں اپنے درجے سے اُتر پڑا اور سامنے خالی پلیٹ فارم دیکھ کر وہیں اپنا سامان رکھ دیا اور دیوار کے سہارے بچھونا بچھا کر سو گیا۔

دوسرے دن مَیں فرسٹ ایئر کلاس میں داخل ہو گیا۔ سر ٹامس آرنلڈ نے مجھے داخل کیا اور سر تھیوڈور مارِسن سے، جو قائم مقام پرنسپل تھے، تعارف کرایا۔ مجھے اُس بارک میں کمرہ ملا جسے کچّی بارک کہتے تھے۔ میرے کمرے کے آس پاس بہت سے ممتاز طالب علم رہتے تھے جیسے خواجہ غلام الثقلین، خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ۔

دوسرے یا تیسرے دن مَیں نے کچھ معززین کے خطوط، جو لاہور سے اپنے ساتھ سرسید کی خدمت میں پیش کرنے لایا تھا، کوٹھی پر جا کر اُن کے حوالے کیے۔ اس ملاقات کے بعد سرسید نے بڑی شفقت اور مہربانی سے فرمایا کہ کبھی کبھی آکر ہم سے مل جایا کرو؛ چنانچہ مَیں اُن کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتا رہتا۔

سرسید صُبح چار بجے اُٹھ جاتے۔ اُن کے پلنگ کے پاس جو میز تھی اُس پر وہ ایک موم بتّی جلا کر رکھ دیتے اور اُس کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے یا مضامین لکھتے۔ جاڑوں میں دو گھنٹے اس شغل میں صرف کرتے۔ اس کے بعد اُٹھ کر غسل خانے جاتے اور ضروریات سے فراغت پانے کے بعد چائے نوش فرماتے۔ پھر ایک بڑی میز کے پاس بیٹھ جاتے تھے جہاں گدّے بچھے ہُوئے تھے اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیتے۔ اسی دوران میں ڈاک آ جاتی تو سب کام بند کر کے اُس کی طرف متوجہ ہوتے۔ پھر منشی اور کلرک آ جاتے، انھیں خطوط کے جوابات لکھواتے۔

حکومت کے نام انگریزی میں جو خطوط بھیجنے ہوتے، وہ کسی انگریز پروفیسر، بالخصوص مسٹر بیک پرنسپل کالج کو ضرور دکھائے جاتے اور بعض خط کتابت، جو بہت اہم ہوتی، اُس کا مسودہ بھی مسٹر بیک ہی سے بنواتے۔

دن کے کھانے میں اکثر اُن کے احباب شریک ہو جاتے جیسے نواب محسن الملک، خان بہادر سید زین العابدین وغیرہ۔ پنجاب یا حیدر آباد سے جو لوگ ملنے آتے، وہ انھی کے مکان پر ٹھہرتے۔ اُن کے ہاں کھانا کسی نجی اہتمام سے تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک شخص کو دو سو روپے ماہوار پر ٹھیکہ دے رکھا تھا کہ وہ اُن کا اور مہمانوں کا کھانا مہیا کرے۔ ٹھیکے کا یہ طریقہ اُس وقت تک رہا جب تک سید محمود الٰہ آباد سے ججی چھوڑ کر علی گڑھ نہ آ گئے۔ سید محمود کے علی گڑھ آنے پر پھر کھانا گھر ہی میں پکنا شروع ہو گیا کیونکہ بیگم محمود بہت منتظم خاتون تھیں۔

سرسید کی ذاتی آمدنی بہت قلیل تھی۔ انھیں چار سو روپے پنشن اور دو سو روپے ۱۸۵۷ء کی خیر خواہی میں انعام ملتے تھے۔ وہ چار سو روپے تو اپنے خرچ کے لیے رکھ لیتے اور دو سو روپے ماہانہ اپنے مرحوم بیٹے حامد کی بیوہ کو دیتے تھے۔ سید محمود نے ججی ہی کے زمانے میں ایک کوٹھی خریدی تھی جو بعد میں انگلش ہاؤس کے نام سے مشہور ہُوئی۔ اس کو خریدنے سے قبل سرسید جیل خانے کے نزدیک اُس مکان میں رہتے تھے جسے اب سمیع منزل کہتے ہیں اور جس کے مالک مولوی سمیع اللہ خاں تھے۔ بعد ازاں سرسید انگلش ہاؤس میں آ گئے۔ مَیں نے اُن کے متعلق لوگوں سے یہ بھی سُنا کہ اگر مہینے کے آخر میں اپنی قلیل رقم میں سے کچھ بچ جاتا تھا تو وہ بھی کالج کے فنڈ میں دے دیتے تھے۔

سرسید دن کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتے اور پھر تصنیف و تالیف کی میز پر بیٹھ جاتے۔ اُس وقت شمس العلما مولانا شبلی، مولوی وحید الدین سلیم اور بعض دیگر بزرگوں کو بھی سرسید کی میز کے گرد بیٹھے مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سرسید اکثر مسائل پر اپنے احباب سے، جو اُس وقت موجود ہوتے، بحث کیا کرتے اور اُن کی رائے بھی لیتے۔

شہزادی مارگریٹ کا حال ہی میں آپریشن ہُوا۔ اور سرجنوں نے اُن کے بائیں پھیپھڑے کا ایک چھوٹا سا حصّہ نکال دیا جو خراب ہو چُکا تھا۔ چوّن سالہ شہزادی مارگریٹ بہت زیادہ سگریٹ نوشی کرتی تھیں۔ بتایا گیا ہے کہ وہ قریباً چالیس سگریٹ روزانہ پیتی تھیں لیکن اب اُنھوں نے ڈاکٹروں سے وعدہ کیا ہے کہ سگریٹ نوشی ترک کرنے کی کوشش کریں گی۔

سرسید کو اللہ تعالیٰ نے ہنسی مذاق کا مادّہ وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا جس کا اظہار اُن کی نجی محفلوں میں بخوبی ہوتا رہتا۔ اُن کی محفل میں روزانہ حاضر باش جو لوگ دکھائی دیتے، اُن میں بجنور کے ایک صاحب محمد سعید خاں نامی بھی تھے جن کو سرسید نے عمارات کی نگرانی کے لیے ملازم رکھا ہُوا تھا۔ وہ صاحب پٹھان تھے لیکن اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ولی کہلانے کے قابل تھے۔ انھیں لوگ بہت چھیڑا کرتے۔ اکثر وہ خاموش رہتے لیکن کبھی کبھی چڑ بھی جاتے تھے۔ عمارتوں کی نگرانی کرنے کی وجہ سے لوگ انھیں گڑھ کپتان کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ایک موقع پر سرسید کی محفل میں کسی نے کہا کہ حضرت امام حُسین رضی اللہ عنہ کو پٹھانوں نے شہید کیا تھا۔ یہ مذاق تھا مگر اس الزام کو گڑھ کپتان صاحب برداشت نہ کر سکے اور بڑے زور زور سے کہنے لگے کہ یہ پٹھانوں پر سخت بہتان ہے۔ پٹھانوں نے ہرگز امام حُسینؓ کو شہید نہیں کیا۔ نواب محسن الملک بھی اُس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے بھی درمیان میں لقمے دینے شروع کیے۔ اس پر وہ اور برہم ہُوئے کہ پٹھانوں کو مار ڈالو اور ان کا نام و نشان مٹا دو۔ نواب

محسن الملک اُن کی باتیں سُن کر بہت ہنسے اور فرمانے لگے کہ میاں یہ تو مذاق تھا۔ بھلا پٹھان کہاں اور کربلائے معلّٰی کہاں! اس پر وہ خوش ہو گئے اور کہا: "جزاک اللہ! آپ نے ایمان کی بات کہی ہے۔"

ایک مرتبہ چودھری خوشی محمد ناظر، جو ہمارے کالج کے طالب علم تھے، میری موجودگی میں سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چودھری صاحب چھریرے بدن کے ساڑھے چھ فٹ لمبے آدمی تھے۔ اُن کے برخلاف سرسیّد کے ایک منشی، منشی نجم الدین کوئی ساڑھے چار فٹ قد کے تھے۔ سرسیّد نے اُنہیں آواز دی اور چودھری خوشی محمد سے کہا کہ میاں اس غریب پر رحم کرو اور ایک ٹکڑا اپنے قد کا اسے بخش دو۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

روزانہ سہ پہر کے بعد اور مغرب کی نماز سے قبل سرسیّد اپنی فٹن میں بیٹھ کر کالج میں پہنچ جاتے۔ کالج میں اُن دنوں اسٹریچی ہال کی عمارت بتدریج تیار ہو رہی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ سرسیّد معماروں کے پاس جا کر مونڈھے پر بیٹھ جاتے اور ہدایات دیتے کہ اینٹوں کے ردے تم غلط لگا رہے ہو، اس طرح لگاؤ۔ ایک روز اُنہوں نے بہت سے ردے اُکھڑوا دیے کہ انہیں دوبارہ چنو۔ اُنہوں نے جب علی گڑھ کالج کے اندر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو دہلی کی جامع مسجد کے چاروں طرف کی لمبائی اور چوڑائی ڈوریوں سے ناپی۔ پھر اس کے بعد ڈوری چوہری کر لی یعنی دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر ایک چوتھائی پیمانے اور وسعت پر کالج کی مسجد تعمیر ہوئی۔

سرسیّد کے زمانے میں اسٹاف میں انگریز ہوتے تھے یا مولوی صاحبان۔ ہندوستان میں انگریزی خواں یا تو ملتے نہ ہوں گے یا اتنے قابل نہ ہوتے ہوں گے کہ اُنہیں طلبہ کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے، اس لیے کالج کی جماعتوں کو پڑھانے کے لیے انگریز پروفیسر رکھے جاتے۔ اگر ایک نوکری چھوڑ دیتا تو ولایت کے اخباروں میں اشتہار دے کر دوسرے کو ملازم رکھ لیتے۔ ریاضی کی تعلیم کے لیے کسی ہندو کو ملازم رکھتے۔ مسلمان ریاضی دان اُس زمانے میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ جب کالج کا آغاز ہوا تو کسی ہندو کو ریاضی کی تعلیم کے لیے عارضی طور پر مقرر کیا لیکن جب سرسیّد خود کلکتہ گئے تو بابو جادو چندر چکرورتی کو، جو ضلع باریسال بنگال کے رہنے والے تھے، اس مقصد کے لیے ساتھ لے آئے۔ انگریز پروفیسروں سے وہ محبت اور یگانگت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ بھی سرسیّد کے گرویدہ تھے اور اُن کی بہت عزت کرتے۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ سر تھیوڈور ماریسن کو سامنے بٹھا کر اپنے ہاتھ سے مٹھائی اُن کے مُنہ میں دیتے جاتے۔ مسٹر بیک تو اُن کی تعریف میں ہر وقت رطب اللسان تھے۔

سر ٹامس آرنلڈ ایک بڑے عالم اور محقق آدمی تھے۔ سر تھیوڈور ماریسن نے بھی کتابیں تصنیف کیں لیکن سر ٹامس آرنلڈ نے 'پریچنگ آف اسلام' ایک ایسی کتاب تصنیف کی کہ تمام دُنیا میں اُس کی شہرت ہو گئی اور آج بھی وہ ایک مستند کتاب جانی جاتی ہے۔ ہمارے مسلمان اسٹاف میں تین بڑے عالم تھے اور وہ تینوں اپنے اپنے فن میں اعلیٰ رکھتے تھے۔ اُن میں ایک تو مولوی خلیل احمد تھے جو عربی کے بڑے عالم تھے۔ جو طالب علم پرائیویٹ طور پر عربی ایم اے کا امتحان دینا چاہتے، وہ اُن سے مدد لیا کرتے۔ عام طور پر یہ مشہور تھا کہ اُن کی تعلیم سے جس کو فیض پہنچ گیا وہ عربی کے امتحان میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔

دوسرے مولانا عبّاس حسین صاحب اثنا عشری بھی ایک بڑے عالم تھے۔ تیسرے مولانا شبلیؒ تھے جنہوں نے متعدد کتابیں اُردو زبان میں محققانہ انداز میں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے اہم 'سیرت النبیؐ' ہے۔ وہ اس کی دو جلدیں لکھنے پائے تھے کہ دُنیا سے رخصت ہو گئے اور بعد ازاں یہ سلسلہ اُن کے شاگردِ رشید مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے مکمل کیا۔

مولانا شبلی مرحوم میں قابلیت تو بہت تھی لیکن اُن کی قابلیت میں رُوح پھونکنے والے سرسیّد احمد خاں ہی تھے۔ مولانا مرحوم، سرسیّد کی کوٹھی کے قریب ایک چھوٹی سی بنگلیا میں رہا کرتے تھے۔ میں نے اکثر انہیں سرسیّد کی محفل میں حاضر پایا۔ کتب خانۂ سرسیّد کے تو وہ عاشقِ زار تھے۔ اُنہوں نے اس کتب خانے سے بہت استفادہ کیا۔

سرسیّد کو میں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ روزے کے متعلق میں شہادت نہیں دے سکتا کیونکہ جس وقت میں کالج میں داخل ہوا، اُس وقت اُن کی عمر کم و بیش پچھتر سال کی تھی۔ ہم لوگ سالانہ 'یوم النبیؐ' مناتے اور سرسیّد اور دیگر اکابرِ قوم کو، جو علی گڑھ میں موجود ہوتے، مدعو کیا کرتے۔ سرسیّد کو متعدد مرتبہ محفل میں پایا۔ اُن کے دل میں قوم کا اس قدر درد تھا کہ اگر جلسے میں کوئی مقرر مؤثر طریقے سے قوم کی موجودہ حالت بیان کرتا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ چند مرتبہ یہ بھی دیکھا کہ اپنی تقریر میں قوم کی حالت بیان کرتے وقت اُن کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور سفید ریش مبارک پر سے ٹپکتے ہوئے اُن کی اچکن پر گرنے لگے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے جب مسدّس لکھی اور قوم کی حالت کا نہایت پُردرد اشعار میں نقشہ کھینچا تو سب سے زیادہ اثر سرسیّد کے دل پر ہوا۔ اُنہوں نے مسدّس کی رسید کے طور پر جو خط مولانا حالی کو لکھا، اُس میں یوں خراجِ تحسین پیش کیا: "کتاب جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی، اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ ختم کیوں ہو گئی۔ بہرحال متعدد بند اُس میں ایسے ہیں کہ بے چشمِ نم پڑھے ہی نہیں جا سکتے۔ حق ہے کہ جو دل سے نکلتی ہے، دل میں پہنچتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے رنگ کی ہے۔ میری نسبت جو اشارہ پایا جاتا ہے، اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بیشک میں اس کا محرّک ہوں، بلکہ میں تو اب یہ بھی کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جب خدا مجھ سے پوچھے گا تو دُنیا سے کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا کر لایا ہوں۔"

سرسیّد کے دوستوں کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اُن میں مسلمان بھی تھے، ہندو بھی اور انگریز بھی۔ مولانا حالی اور مولوی ممتاز علی ایڈیٹر 'تہذیبِ نسواں' کو متعدد مرتبہ اُن کے دربار میں حاضر دیکھا۔ حیدرآباد سے کچھ لوگوں کو جب ریاست فارغ کر دیتی تو اُن میں سے بعض افراد اپنے وطن جانے کے بجائے علی گڑھ کا رُخ کرتے۔ نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک تو مستقل علی گڑھ ہی میں رہنے لگے۔ نواب فتح نواز جنگ نے بھی کچھ عرصہ علی گڑھ میں قیام کیا۔ اس طرح دو تین اور صاحبان بھی علی گڑھ ہی میں عارضی طور پر مقیم ہوئے۔ کئی اصحاب حیدرآباد سے آنے کے بعد علی گڑھ میں قیام پذیر ہوئے تو اخبار 'اودھ پنچ' نے لکھا کہ علی گڑھ کیا ہے، یہ تو تکیۂ مردوداں ہے یعنی جو شخص کسی جگہ سے نکال دیا جاتا ہے، وہ علی گڑھ میں آ کر پناہ لیتا ہے۔

خلیفہ محمد حسن اور خلیفہ محمد حسین وزرائے ریاست پٹیالہ، سرسیّد کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ اسی طرح نواب عماد الملک، مولوی حسین بلگرامی اور اُن کے دو بھائی مولوی سیّد علی بلگرامی اور ڈاکٹر سیّد حسن بلگرامی بھی اُن کے بڑے معتقد اور دوست تھے۔ پنجاب کے نواب محمد حیات خاں اور ڈپٹی برکت علی خاں، باغبانپورہ لاہور کے میاں شاہ دین ہمایوں اور سر محمد شفیع اور مراد آباد کے ایک ہندو رئیس جے کشن داس بھی اُن کے بڑے گہرے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔

سرسیّد کے دو بیٹے تھے۔ سیّد حامد اور سیّد محمود۔ سیّد حامد سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ سیّد محمود نے ولایت جا کر تعلیم پائی اور وہاں سے بیرسٹری پاس کر کے آئے۔ وہ قانون دانی میں نہایت ممتاز تھے۔ پہلے ڈسٹرکٹ ججی پر فائز رہے، پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہو گئے اور یہ سلسلہ کوئی نو دس برس تک جاری رہا۔ بعد ازاں چیف جسٹس سے اختلاف ہوا تو استعفا دے دیا۔ میرے علی گڑھ میں آنے

کے تقریباً تین سال بعد وہ علی گڑھ آ گئے اور کالج کے کاموں میں سرسید کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جب میں نے اوّل اوّل اُن کو دیکھا، اُس وقت اُن کی جسمانی حالت، جس کا اثر اُن کے دماغ پر بھی تھا، قابلِ اطمینان نہیں رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی حالت خراب ہوتی گئی اور باپ بیٹے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ سیّد محمود چاہتے تھے کالج کا سارا مالی انتظام اُن کے سپرد کر دیا جائے لیکن سرسیّد اس پر کسی طرح بھی رضامند نہیں ہوتے تھے۔ ۱۸۹۷ء کے آخر میں تو اُن کے درمیان یہ تنازع بدترین صورت اختیار کر گیا۔ سیّد محمود نے باپ سے کہہ دیا کہ یہ کوٹھی جس میں آپ رہتے ہیں میری ہے، آپ اپنے رہنے کا انتظام کسی اور جگہ کر لیجیے۔

مَیں ۱۸۹۷ء میں ایم اے او کالج کے احاطے میں ایک بنگلیا میں رہتا تھا جو یونین کلب سے کچھ فاصلے پر واقع تھی ـــــ یونین کلب سے بہت قریب ایک اور بنگلیا تھی جس میں اعلیٰ جماعتوں کے بعض طلبہ رہتے تھے۔ ایک روز کام ختم ہونے کے بعد مَیں اپنے مکان پر آیا تو ملازم سے معلوم ہُوا کہ سرسیّد اپنا کچھ سامان لے کر اُس بنگلیا میں آ گئے ہیں۔ مَیں نے باہر نکل کر دیکھا واقعی سرسیّد برآمدے میں تشریف رکھتے تھے۔ مَیں چائے پی کر فوراً اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بنگلیا کے چاروں طرف مزدور صفائی کر رہے تھے اور سرسیّد کا کچھ سامان لوگ سر پر اُٹھائے لا رہے تھے۔ مَیں سمجھ گیا کہ آج سیّد محمود سے کوئی ایسا جھگڑا ہُوا ہے جو سرسیّد کی برداشت سے باہر ہو گا اور وہ کوٹھی چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ شام ہونے سے پہلے ٹرسٹیوں میں سے چند معززین سرسیّد سے آ کر ملے جن میں مرزا عابد علی بیگ، نوّاب محمدّ اسماعیل خاں اور سیّد محمدّ احمد برادر زادۂ سرسیّد کے نام یاد ہیں۔ اُن لوگوں نے اُسی وقت سیّد محمود اور سرسیّد میں صلح و صفائی کی گفتگو شروع کر دی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی اپنی بات سے نہ ہٹتا تھا۔ سرسیّد اس بنگلیا میں فقط چند روز رہے اور پھر بعض ٹرسٹیوں کے درمیان پڑنے سے اُن میں مفاہمت ہو گئی اور سرسیّد کوٹھی میں واپس چلے گئے۔

سرسیّد جنوری ۱۸۹۸ء سے کم و بیش ہر روز کچھ نہ کچھ تکلیف محسوس کرنے لگے تھے۔ عمر اسّی سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تفکّرات بہت تھے۔ سیّد محمود کی مخالفت اور دن رات کی کِل کِل کا دل پر بہت اثر تھا جو اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کے پاس بیٹھنے والوں نے اس قسم کی باتیں بھی سُنیں کہ اب سُورج اُفق کے قریب پہنچ چُکا ہے۔ سرسیّد بھی کبھی کبھی فرماتے کہ طبعی عمر گزر چکی ہے اور بقائے زیست کی اُمیّد بہت کم ہے۔ ان دنوں غذا میں بہت کمی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن کالج کی ڈاک روزانہ دیکھنے کا معمول بدستور قائم تھا۔ لوگ ملاقات کے لیے آتے، اُن سے بات چیت بھی ہو جاتی اور موقع موقع سے بذلہ ظرافت کی جھلک بھی دکھائی دیتی۔

مارچ کے آغاز سے اُن کے چہرے پر بہت زیادہ تفکّر کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اُنھی دنوں سیّد محمود سے تعلّقات پھر خراب ہو گئے اور سرسیّد نواب حاجی محمدّ اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کی کوٹھی میں چلے آئے۔ مَیں اپنی نجی ضرورت سے دہلی گیا اور وہاں چند روز لگ گئے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو دہلی سے واپس آیا تو ریلوے اسٹیشن علی گڑھ پر یہ خبر سُنی کہ سرسیّد کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا ہے۔

زنانہ ویٹنگ رُوم کی آیا نے یہ خبر سُن کر مردانہ انتظار گاہ کے بیرے سے کہا: "باپ رے باپ! سُنا ہے کہ بڑے سیّد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب کیا اُن کا سر کٹے گا اور کٹ کر لندن جائے گا؟"

بیرے نے کہا: "نہیں! سیّد محمود صاحب نے کہہ دیا ہے کہ ہم سر نہیں کٹنے دیں گے اور نہ لندن جانے دیں گے۔"

اُن دونوں میں اس گفتگو کی وجہ وہ افواہ تھی جو مسلمانوں میں عام طور پر پھیلی ہُوئی تھی کہ لندن کے بعض ڈاکٹروں نے سرسیّد کے سر کے لیے بہت بڑی رقم دینی منظور کی ہے کہ جب سرسیّد کا انتقال ہو، اُن کا سر کاٹ کر ہمیں دیا جائے تاکہ ہم دیکھیں کہ اُن کے دماغ میں ایسی کونسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ اتنے بڑے عقل مند ہیں۔ گویہ شہرت سراسر غلط تھی لیکن چھوٹے طبقے کے لوگ سچ مانتے تھے کہ اُن کا سر کٹ کر لندن جائے گا۔

مَیں اپنے مکان پر آیا اور وہاں سے اُس کوٹھی کی تلاش میں گیا جس کا نام بھی پہلے نہیں سُنا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی دو تین کمروں کی کوٹھی تھی جہاں مَیں رات کے گیارہ بجے پہنچا۔ معلوم ہُوا کہ تین چار دن سے سرسیّد کو بخار آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کا علاج تھا اور پیشاب سلائی کے ذریعے نکالا جاتا تھا کیونکہ وہ بار بار بند ہو جاتا تھا۔ آخر میں شدید جاڑے کا بخار چڑھا اور اسی میں انتقال ہو گیا۔

مَیں نے اس موقع پر سیّد محمود، سرسیّد کے بھتیجے سیّد محمد احمد یا کسی اور عزیز کو نہیں دیکھا۔ وہاں ملازم تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، نوّاب محمدّ اسمٰعیل خاں اور مولوی وحید الدین سلیم بھی تھے۔ مَیں بارہ بجے شب اپنے مکان پر آ کر سو گیا۔ صبح اُٹھ کر پھر موقع پر گیا تو ایک عجیب بات معلوم ہُوئی کہ سرسیّد کی تجہیز و تکفین کے لیے روپیہ بھی نہیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اُس روز علی گڑھ میں نہیں تھے۔ اُن کا ملازم ولی محمدّ میرے سامنے نوّاب محسن المُلک کے پاس گیا اور وہاں سے واپس آ کر اُس نے کہا کہ دیکھیے کسی نے کفن دفن کے لیے روپیہ نہیں دیا، مَیں نوّاب صاحب سے پچاس روپے مانگ کر لایا ہُوں؛ حالانکہ اُس وقت سیّد محمدّ احمد بھی وہاں موجود تھے۔ وہیں یہ معلوم ہُوا کہ سیّد محمود رات کے دو بجے کالج کی مسجد گئے اور اُس کے شمال مشرقی جانب ملحقہ اراضی پر قبر کھُدوانی شروع کر دی۔ اتنے میں مسٹر بیک وہاں آئے اور کہا کہ اسٹیشن کے انگریز جنازے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے چار بجے شام کا وقت جنازہ اُٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اُسی وقت خواجہ محمدّ یوسف، نوّاب اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں بھی وہاں تشریف لائے۔ اُنھیں اعتراض تھا کہ مسٹر بیک جنازہ اُٹھانے کا وقت مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں جبکہ اُن کے وارث یہاں موجود ہیں۔

یہ اعتراض، اعتراض ہی کی حد تک رہا۔ اس پر مزید کوئی گفتگو نہ ہُوئی۔ تقریباً گیارہ بجے دن سرسیّد کی میّت کو خواجہ محمدّ یوسف نے اپنے ہاتھ سے غسل دیا۔ خواجہ صاحب بہت روئے اور سرسیّد کے ورثا کی شکایت کے چند الفاظ بھی زبان پر لائے۔ غسل کے بعد اس کوٹھی کے درمیانی کمرے میں جنازہ رکھّا گیا۔

ایک بجے ہم تین چار دوست سیّد محمود کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ چار بجے جنازہ اُٹھے گا، آپ کو جنازے میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ سرسیّد کی بیماری یا انتقال کے وقت یا اس کے بعد سیّد محمود اُس کوٹھی میں، جہاں سرسیّد کا انتقال ہُوا، نہیں آئے تھے۔ اب سیّد محمود نے ہمیں دیکھتے ہی سر پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے آہیں بھرنا شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ ہائے میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ میرے گھر میں تو بوریا بھی نہیں کہ مہمانوں کو بٹھاؤں۔ جب وہ ذرا خاموش ہُوئے تو ہم نے کہا کہ آپ کا آنا ضروری ہے، بھُول نہ جائیے گا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہاں مَیں آؤں گا۔ ہم وہاں سے لَوٹ آئے۔ کالج کے طالب علم، ارکانِ عملہ، انگریز اور ہندوستانی حکّام اور بعض رؤسا جنازے کے ساتھ گئے اور شہر کے لوگ بھی خاصی تعداد میں راستے میں شریک ہوتے رہے۔ جنازہ کرکٹ لان میں رکھّا گیا۔ اتنے میں سیّد محمود بھی عربی جُبّہ پہنے آ موجود ہُوئے۔

جنازے کی نماز مولوی عبداللہ انصاری نے، جو صدر شُعبۂ دینیات تھے، پڑھائی۔ سیّد محمود بھی ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ بیک صاحب اور ماریسن صاحب بھی شریکِ نماز ہُوئے۔

میّت قبر میں اُتارتے وقت ہم طالب علموں کی آنکھوں میں تو آنسو تھے ہی، بیک صاحب اور مارلیسن صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ قبر میں دفن کرنے اور مٹّی دینے کے بعد نوّاب محسن الملک نے سرسیّد کے ورثا کو خوب کھری کھری سُنائیں اور کہا: "جس شخص کی بدولت ان لوگوں کو دُنیا میں عزّت و ثروت حاصل ہوئی، اُن میں سے کسی کی جیب سے پچاس روپے بھی نہ نکلے کہ تجہیز و تکفین ہوتی۔ مَیں سرسیّد کا دوست ضرور تھا لیکن اُن کا وارث نہیں۔ یہ وارثوں کا فرض تھا کہ وہ تجہیز و تکفین کرتے لیکن اُنہوں نے غفلت برتی۔"

سرسیّد کی پیدائش ۱۸۱۷ء کی تھی اور ۱۸۹۸ء میں اُن کا انتقال ہُوا۔ اس حساب سے اُن کی عمر ۸۱ برس ہُوئی۔ اُن کی ذات سے مسلمان قوم کو جو فائدہ پہنچا وہ ہندوستان کے اور کسی مسلمان سے نہیں پہنچا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں قومی احساس پیدا کیا، اُن کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا اور اُنہیں سرکاری ملازمت کے مختلف شعبوں میں داخل کرانے کے لیے جدّوجہد کی۔ وہ اُردو زبان کی حفاظت کے لیے عمر بھر سینہ سپر رہے۔ ۱۸۵۷ء میں سخت مصیبتیں جھیلیں۔ اُس زمانے میں جبکہ ہزاروں مسلمان روزانہ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے اور زبان سے بات نکالنا موت کو دعوت دینا تھا، اُس وقت اُنہوں نے کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھی اور مسلمانوں کو انگریزوں کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کی۔ یہ کتاب لکھنے پر بہت سے انگریز سخت برہم ہُوئے اور اُنہوں نے اصرار کیا کہ اس شخص کو پھانسی ہونی چاہیے لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

یہ تھے سرسیّد احمد خاں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے!

◎

گاندھی کیپ، مسلمانوں کی ایجاد

بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ گاندھی ٹوپی، جو متّحدہ ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس کا نشان اور ہندوؤں کے لیے قومی حیثیّت کی حامل بنی، تحریکِ خلافت کے ممتاز رہنما مولانا محمّد علی جوہر کی ایجاد ہے اور پہلی گاندھی کیپ اُن کی والدہ بی امّاں نے تیّار کی تھی۔ رام پور کے نوّابزادہ عبدالکریم خان عرف دلّن، جو ان دنوں کراچی میں قیام پذیر ہیں، اس کی ایجاد کا پس منظر یُوں بیان کرتے ہیں:

"مہاتما گاندھی، مولانا محمّد علی جوہر کی صاحبزادی کی شادی میں شرکت کے لیے پہلی بار رام پور آئے تو مولانا جوہر نے والیٔ ریاست سے ملاقات کی تجویز پیش کی۔ گاندھی آمادہ ہو گئے لیکن ملاقات سے قبل مولانا کو تشویش ہُوئی کہ وہ مروّجہ آداب کے خلاف کس طرح ننگے سر نوّاب صاحب سے ملاقات کریں گے۔ اُس وقت رام پوری کیپ درآمدی اجزا سے تیّار کی جاتی تھی جبکہ گاندھی جی کوئی بدیشی چیز استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس موقع پر پگڑی کا استعمال بھی مناسب نہ تھا، چنانچہ مولانا جوہر کو اس مسئلے کا ایک ہی فوری حل نظر آیا کہ اُنہوں نے نئے کھدر کا ایک ٹکڑا اپنی والدۂ محترمہ کے پاس بھیجا اور اُن سے درخواست کی کہ اس سے رام پوری کیپ جیسی ایک ٹوپی فوری طور پر تیّار کر دیں۔ بی امّاں نے جلدی سے ٹوپی تیّار کر دی جو گاندھی جی نے پہن کر نوّاب رام پور سے ملاقات کی۔ یہی ٹوپی بعد میں گاندھی کیپ کے نام سے پُورے ہندوستان میں ہندوؤں کی قومی شناخت بن گئی۔

(مُرسلہ: ظفر نظامی۔ کورنگی، کراچی)

بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی

اِسلام آباد

نمبر شمار	کورس	اہلیت
۱	پی ایچ ڈی (شریعہ) (۲ - ۵ سالہ کورس بعداز تکمیل ابتدائی ضروری مدّت)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایل ایل ایم (شریعہ) یا اس کے مساوی تعلیمی سند۔ عربی اور انگریزی پر عبور ضروری ہے۔
۲	پی ایچ ڈی (اصولُ الدین) (۲ - ۵ سالہ کورس بعداز تکمیل ابتدائی مدّت)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے (اُصول الدین) یا اس کے مساوی تعلیمی سند۔ عربی اور انگریزی پر عبور شرط ہے۔
۳	پی ایچ ڈی (اقتصاد) (۲ - ۵ سالہ کورس)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (اقتصاد) یا اس کے مساوی تعلیمی سند۔ انگریزی، عربی، فقہ اور اسلامی اقتصادیات پر عبور ضروری ہے۔ ایسے طلبہ جنہوں نے دیگر جامعات سے ایم اے یا ایم ایس سی (اقتصاد) کیا ہو مطلوبہ ابتدائی کورسوں کی تکمیل کے بعد جن کا تعیّن اسلامی یونیورسٹی کرے گی، اور داخلے کا امتحان دینے کے بعد پی ایچ ڈی میں داخل کیے جا سکتے ہیں۔
۴	ایل ایل ایم (شریعہ) (۲ - ۳ سالہ کورس)	اِسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایل ایل بی (شریعہ) یا اس کے مساوی تعلیمی سند۔ عربی اور انگریزی پر عبور شرط ہے۔ ایسے طلبہ جنہوں نے دیگر جامعات سے ایل ایل بی کیا ہو یا تسلیم شدہ دینی مدرسے سے فقہ میں تخصّص کیا ہو داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مطلوبہ ابتدائی کورسوں میں کامیاب ہوں۔
۵ (i) (ii)	ایم اے (اصول الدین) (تفسیر و حدیث) (اصول الدین: تقابلِ ادیان) (۲ - ۳ سالہ کورس)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے بی اے (آنرز اصول الدین) یا اس کے مساوی تعلیمی سند یا تسلیم شدہ دینی مدرسے سے مساوی تکمیلی سند، عربی انگریزی پر مکمل عبور ضروری ہے۔ ایسے طلبہ جنہوں نے دیگر جامعات سے کسی اور مضمون میں ایم اے

(باقی اگلے صفحے پر)

		کیا ہو وہ ضروری ابتدائی کورسوں کی تکمیل کے بعد داخل کیے جاسکتے ہیں۔
۶	ایم ایس سی (اقتصاد) (۱ - ۳ سالہ کورس)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے بی ایس سی (آنرز) اقتصاد یا مساوی تعلیمی سند۔ عربی اور انگریزی پر عبور ضروری ہے۔ ایسے طلبہ بھی جنہوں نے کسی اور جامعہ سے بی اے یا بی ایس سی اقتصاد یا کسی اور مضمون میں کیا ہو، داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں لیکن اُنہیں ضروری ابتدائی کورسوں کی تکمیل کرنا ہوگی۔
۷	ایم اے (عربی) (۲ - ۳ سالہ کورس)	اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے بی اے آنرز (عربی) یا اس کے مساوی تعلیمی سند۔ انگریزی پر عبور شرط ہے۔ ایسے طلبہ بھی جنہوں نے دیگر جامعات سے بی اے کی سند حاصل کی ہو، اور کم از کم ۶۰ فیصد نمبر عربی میں لیے ہوں، داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں لیکن اُنہیں ضروری تکمیلی کورسوں میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔
۸ ۹ ۱۰ ۱۱	ایل۔ایل۔بی (شریعہ) بی اے آنرز (اصولُ الدین: دعوۃ) بی اے آنرز (اصول الدین: قرأت وعلوم القرآن) بی ایس سی آنرز (اقتصاد) بی اے آنرز (عربی) ۴ سالہ کورسز)	انٹرمیڈیٹ سیکنڈ ڈویژن یا اس کے مساوی دینی مدرسے کی سند۔ بی اے آنرز (عربی) کے اُمیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ انٹر کی سطح تک اُنہوں نے عربی بطور اختیاری مضمون پڑھی ہو۔
۱۲	ایل ایل بی (آنرز) (۳ سالہ کورس)	کسی پاکستانی جامعہ سے بی اے / بی ایس سی (۱۹۸۲ء کے بعد پاس شُدہ) عربی کی قابلِ فہم استعداد ضروری ہے یا تسلیم شدہ دینی مدرسے سے مساوی تعلیمی سند اور انگریزی میں قابلِ فہم استعداد۔ نشستوں کی ۲۵ فیصد (پچیس فیصد) تعداد دفتروں میں ملازم افراد کے لیے مخصوص ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے دفتر سے عدمِ اعتراض کا سرٹیفیکیٹ حاصل کر کے درخواست کے ساتھ فراہم کریں۔
۱۳	ڈپلومہ (قضا) (ایک سالہ کورس)	پاکستانی جامعات سے ایل ایل بی، عربی میں قابلِ فہم استعداد کے ساتھ یا تسلیم شدہ دینی مدرسے سے فقہ میں تخصص، انگریزی میں قابلِ فہم استعداد کے ساتھ۔

(باقی اگلے صفحے پر)

نوٹ: (۱) پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ شُدہ طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ انہوں نے متعلقہ سند میں کم از کم سیکنڈ ڈویژن حاصل کی ہو۔

(۲) ایسے امیدوار جنہوں نے انٹرمیڈیٹ / یا اس کے مساوی امتحان دیا ہو اور نتیجہ ابھی نہ آیا ہو، درخواست برائے داخلہ دے سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کا نتیجہ ۳۱ / اگست ۸۵ء تک آجائے اور وہ سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوجائیں۔

(۳) ایک محدود مقدار میں اسکالرشپ اور مالی امداد مستحق طلبہ کو فراہم کیے جانے کی توقع ہے۔ طلبہ کی اقامت گاہ میں بھی محدود پیمانے پر رہائش کا انتظام ہے۔ یونیورسٹی ایل ایل بی آنرز یا ڈپلومہ قضا کے طلبہ کو کسی قسم کی مالی یا رہائشی سہولت فراہم کرنے کی مجاز نہیں۔ داخل ہونے والے طلبہ میں سے کوئی طالب علم / طالبہ سکالرشپ یا رہائشی سہولت کا مطالبہ بطور استحقاق کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

(۴) مزید تفصیلات اور معلومات یا داخلہ فارم کے لیے متفقہ اُمیدوار انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی پوسٹ آفس بکس ۱۲۴۳ - اسلام آباد کے اسسٹنٹ سیکرٹری (تعلیمی اُمور) سے رابطہ قائم کریں اور جواب کے لیے ۱۰ × ۲۳ سنٹی میٹر کا جوابی لفافہ جس پر ایک روپیہ بیس پیسے کے ٹکٹ لگے ہوں ہمراہ بھیجیں۔

(۵) تمام اُمیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سندات کی مصدّقہ فوٹو کاپی (دو عدد) اور جس تعلیمی ادارے میں تعلیم پائی ہو، اُس کی جانب سے ایک سرٹیفیکیٹ جس میں تکمیل شدہ مدتِ تعلیم کی تصدیق کی گئی ہو، فراہم کریں۔ یہ شرط خاص طور پر دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ہے۔ یہ سرٹیفیکیٹ کی متعلقہ کاغذات مع درخواست (دو عدد) اسسٹنٹ سیکرٹری (تعلیمی اُمور) کے دفتر میں ۳۰ / جون ۱۹۸۵ء تک لازماً پہنچ جانے چاہئیں۔ ایسی درخواستیں جو نامکمل ہوں، نظرانداز کی جاسکتی ہیں۔

(۶) ایسے امیدوار جو داخلے کی شرائط پوری کریں گے، اُنہیں مقررہ تاریخ پر تحریری اور زبانی امتحان پاس کرنا ہوگا جس کے بعد اُن کے داخلے کا اعلان کیا جائے گا۔

دستخط

صدّیق کامل

اسسٹنٹ سیکرٹری (تعلیمی امور)
انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)
پوسٹ بکس ۱۲۴۲
فون ۸۵۲۹۵۰

پی آئی ڈی (اسلام آباد) ۱۲۲/۱۵/۷۴

خلیق تبسم

خواتین کے لیے مفید نفسیاتی مشورے

بچّوں کی صحت مند نشوونما

ہم عام طور پر بچّوں کی عادات اور خصائل کا نفسیاتی جائزہ نہیں لیتے اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچّوں میں عقل نہیں ہوتی؛ حالانکہ اُن کا مشاہدہ بہت گہرا اور اثر قبول کرنے کی صلاحیت بے پناہ اور بے حساب ہوتی ہے۔ وہ بچے نفسیاتی طور پر صحت مند ہوں گے جو اپنی عُمر کے مطابق شوق اور دلچسپیاں رکھتے ہوں اور معاملات میں عمر کے مطابق ہی دخل دیتے ہوں۔ بعض بچّے کم عُمری میں بڑوں کی سی باتیں کرتے ہیں اور اپنی عُمر سے زیادہ پختہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نفسیاتی طور پر صحت مند نہیں ہوتے۔

بچّوں کی فطری نشوونما صحت کے لیے ضروری ہے۔ بچّہ پیدائش کے بعد ہی سے عادات و خصائل کی تشکیل میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ ایک صحت مند بچّے کی ہر عُمر میں خواہشات کا رنگ اور مزاج کیسا ہوتا ہے۔ پیدائش سے ایک سال تک کے عرصے میں ایک بچّہ اپنی بھوک کے احساس کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور محبت تلاش کرتا ہے۔ اگر اُسے صحیح وقت پر دُودھ نہ دیا جائے تو وہ ماں کی توجّہ اپنی طرف کھینچنے کے لیے رونا شروع کر دیتا ہے۔ ماں اپنا دُودھ پلائے تو سب سے اچھی بات ہے۔ اگر کسی وجہ سے اپنا دُودھ نہیں پلا سکتی یا پلانا نہیں چاہتی تو بچّے کو گود میں لے کر بڑے پیار سے دُودھ پلانا چاہیے۔ اس طرح اُس کے اندر محبّت کی جو پیاس ہے وہ سیراب ہو گی۔ بچّہ بات چیت تو خود نہیں کر سکتا مگر دوسروں کی باتیں سُننا اور اُن کے ساتھ کھیلنا پسند کرتا ہے۔ ایک سال سے تین سال کی عُمر کے بچّے میں خود مختاری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ ہر کام خود کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس عُمر کے بچّے ایسے کھلونے پسند کرتے ہیں جنہیں وہ رسّی یا ہینڈل کی مدد سے خود چلا سکیں۔ اسی طرح نرم بالوں والے یا موٹے موٹے ربڑ کے کھلونے مثلاً بھالو، گڑیا یا اونٹ وغیرہ اُن کے کھیلنے کے لیے بہت موزوں ہوتے ہیں۔

اس عُمر کا بچّہ ایک وقت میں ایک کام کرنا پسند کرتا ہے۔ وہ کوئی کام بھول جائے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہو سکتا ہے وہ کوئی اور بات سیکھ رہا ہو۔ بچّے کو ہر وقت بُرا بھلا کہنا یا مارنا کسی طور مناسب نہیں۔ وہ بُری عادتوں کا شکار ہو جائے گا۔ اُسے بُرے کاموں پر پیار سے سمجھانا چاہیے۔

ایک سال سے تین سال کی عُمر کا بچّہ جس قدر دوسروں کی توجّہ کا محتاج ہوتا ہے اُسی قدر زبردست نقّال بھی ہوتا ہے۔ آپ اُس کی کسی بات پر توجّہ نہیں دیں گے تو وہ اُسے چھوڑ دے گا۔ اُسے جس کام پر توجہ ملے گی، بچّہ وہی کام شوق سے کرے گا۔ اصلاح کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اُس کے اچھّے کاموں پر توجہ دی جائے اور بُرے کاموں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس عُمر کا بچّہ انگوٹھا اُس وقت چوستا ہے جب وہ تھکن، خوف، حد درجہ خوشی یا رنج محسوس کرے یا اُسے اپنی انوکھی زندگی دشوار معلوم ہوتی ہو اور پریشانی کا شکار ہو۔ ایسے حالات میں اُسے توجّہ، پیار اور ہمدردی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ دراصل وہ انگوٹھا چُوسنے سے وہی راحت اور سکون محسوس کرتا ہے جو اُسے ماں کی گود میں ملتا ہے۔

تین سے پانچ سال عُمر کا بچّہ پُھرتیلا ہوتا ہے؛ چنانچہ ہر وقت کھیل میں مست رہتا ہے اور اُسے تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس عمر کے بچّے کے مسائل کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔ اُنہیں ٹھیک طور پر سمجھ لینے سے والدین بچّوں کو نفسیاتی لحاظ سے بہت صحت مند بنا سکتے ہیں۔ دوسرے بچّوں کو مارنا، اُن سے لڑنا جھگڑنا، چیزیں توڑنا پھوڑنا، دوسرے بچّوں کو کھیل میں شریک نہ کرنا، انگوٹھا چوسنا، بستر میں پیشاب کر دینا اور اچانک خوف یا ڈر محسوس کرنا اس عُمر کے عام مسائل ہیں۔

ایک بچّہ دوسرے بچّے کو اُس وقت مارتا ہے جب وہ کسی چیز سے محرومی یا حسد کا شکار ہو۔ دوسرے بچّے کی وجہ سے اُس کی محبت تقسیم ہو جائے یا پھر اپنے سے بڑے سے ڈانٹ سُنے یا مار کھائے تو وہ بدتمیزی پر اُتر آتا ہے۔ اچھّے ماحول سے مُراد یہ ہے کہ بچّے سے پیار کیا جائے۔ اُسے کسی کے سامنے مارا نہ جائے اور اُس کی فطری خواہشات کا خیال رکھّا جائے۔ وہ بستر پہ پیشاب کر دے تو اُسے پیار سے سمجھانا چاہیے۔ اس طرح وہ بستر پر پیشاب کرنا چھوڑ دے گا — اور اُس کی عادتوں میں حُسن پیدا ہو گا۔ ایک بچّہ کھلونوں یا دوسری چیزوں کو اس لیے توڑتا پھوڑتا ہے کہ اُس میں جذبۂ تجسّس بہت ہوتا ہے۔ اس جذبۂ تجسّس کو دبانے کے بجائے اس کی نشوونما کا خیال رکھّا جائے اور ایسے کھلونے دیے جائیں جو عمر کے مطابق ہوں۔ چار پانچ سال کا بچّہ مل جُل کر کھیلنے اور کام کرنے اور خود کو بڑا سمجھنے اور شیخی بگھارنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ صفائی رکھنا، کپڑے بدلنا اور چھوٹے موٹے کام خود کرنا چاہتا ہے۔ پانچ سے سات سال کی عمر کا بچّہ ہوشیار اور پُھرتیلا ہونے کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی میں مضبوط ہوتا ہے۔ یہ عُمر اسکول جانے کی ہوتی ہے۔ چونکہ ماحول کی تبدیلی وہ آسانی سے قبول نہیں کرتا اس لیے دوبارہ انگوٹھا چوسنا، بستر میں پیشاب کر دینا اور ناخن چبانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ دراصل نئے ماحول میں ذہنی اُلجھن اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر کام میں وہ دلچسپی لیتا ہے لیکن اُس کی دلچسپی وقتی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ دانت صاف کرنا، اپنے بالوں میں کنگھی کرنا، جُوتے کے تسمے باندھنا وغیرہ اور گھریلو چھوٹے موٹے کاموں میں مدد کرنا اُس کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ اُسے اپنی حفاظت کے طریقے بھی آجاتے ہیں۔ وہ سڑک پار کرنا، گرم استری سے محفوظ رہنا اور چُولھے سے ہٹ کر بیٹھنا سیکھ جاتا ہے۔

آٹھ سے دس سال کی عمر کا بچّہ اپنے کام میں زیادہ دیر تک دلچسپی قائم رکھتا ہے۔ ایک بار جو کام بھی شروع کر لیتا ہے اُسے مکمل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مل جُل کر کام کرنے اور دوسروں کے فیصلوں پر عمل کرنے میں وہ فخر محسوس کرتا ہے۔ اب وہ عزّت اور توجّہ کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اُسے بھوک بھی خُوب لگتی ہے۔ صحیح تربیت کی جائے تو وہ گھر کے کام کاج میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ دس برس سے سنِ بلوغت تک بچّہ اپنے آپ سے اور دوسروں

سے شرم محسوس کرتا ہے۔ اب اُس میں بلوغت کی نشانیاں پیدا ہونی شروع ہوتی ہیں۔ یہ علامتیں اُس میں خود اعتمادی بھی اُبھارتی ہیں۔

پیدائش سے لے کر سنِ بلوغت تک اُسے ذمہ داری کا احساس دلایا جائے اور اُس کی مناسب وقت پر اچھے انداز میں رہنمائی کی جائے۔ اُس کے دل میں خاندان، قوم اور مُلک سے محبت اور اُس کی خدمت کا جذبہ بیدار کیا جائے تو وہ ایک صحت مند بچے کی حیثیت سے نشوونما پاکر معاشرے کا ایک مفید فرد بن جائے گا۔ اُس کی نفسیاتی اور اخلاقی تربیت میں نقص رہ جانے سے وہ قاتل اور ڈاکو کا رُوپ دھار لیتا ہے اور آوارہ ہو جاتا ہے۔ اس آوارگی کی روک تھام پہلے محبت اور شفقت سے کی جانی چاہیے۔

یہ طریقہ ناکام ہو جائے تو مناسب سزا بھی اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ معمولی باتوں پر وحشیانہ مار پیٹ سے بچّے کے اندر ایک ضد سی پیدا ہو جاتی ہے جو اُس میں حیرت انگیز قُوتِ مدافعت بھر دیتی ہے۔ بچّہ پٹتا رہتا ہے اور انتقام کی آگ اُس کے تحت الشعور میں پھیل جاتی ہے۔ تربیت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بچّے کو اتنا پیار دیا جائے جتنا اُسے درکار ہے۔ محبت اور شائستگی کے ماحول میں پلے ہُوئے بچّے بالعموم نفسیاتی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار یا حد سے بڑھی ہُوئی تعریف بچّے کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے وہ توازن کھو بیٹھتا ہے اور اپنی عمر سے بڑا بننے کی غیر فطری کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اُس کی نفسیاتی صحت بگڑ جاتی ہے۔

ایس پی ایس کے ہال موری دروازہ لاہور میں مشاعرہ گرم ہُوا تو میز کے قریب سے، جہاں صاحب صدر شیخ ناظر حسین عقیل بیٹھے تھے، ایک آواز آئی۔ شعر پڑھا گیا مگر شاعر نظر نہ آتا تھا۔ اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا: "شاعر کہاں ہے؟ شاعر کہاں ہے؟"

شیخ صاحب اپنی کرسی سے اُٹھے اور بولے: "حضرات! شاعر آپ کے سامنے موجود ہے۔ حیرت ہے آپ اُسے دیکھ نہیں پا رہے۔"

مَیں نے دیکھا کہ میز کے کنارے سہا مجدّدی علیگ کھڑے شور و غوغا تھمنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اِدھر ہنگامہ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں: "نابالغ شاعر۔ بچّہ شاعر۔"

اتنے میں حکیم احمد شجاع پاشا، سہا صاحب کے پاس آ کھڑے ہُوئے اور گرجتی ہُوئی آواز میں کہنے لگے: "لاہور کو اپنی مہمان نوازی کی جن عظیم روایات پر ناز تھا، وہ آج پامال ہو گئی ہیں۔ لاہور کو اس کے فرزند بدنام کرنے لگے ہیں۔ جو شخص سہا کا احترام نہیں کر سکتا، اُسے مشاعرے سے فی الفور نکل جانا چاہیے۔"

مجمع میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا: "شاعر صاحب کو میز پر کھڑا کر دیجیے۔"

"ہرگز نہیں۔" حکیم صاحب گرجے۔ "سہا صاحب یہیں رہیں گے۔ آپ کی نظر کمزور ہے تو گھر جا کر آنکھوں میں سُرمہ ڈالیے۔"

اس پر قہقہوں کا ایک طُوفان اُٹھا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سہا صاحب نے پُوری غزل سُنائی اور بے پناہ داد پائی۔ یاد رہے سہا مجدّدی جسمانی طور پر ابنارمل تھے۔ (مرزا ادیب۔ 'مٹی کا دیا')

ایک بدویہ کی غیر معمولی ذہانت

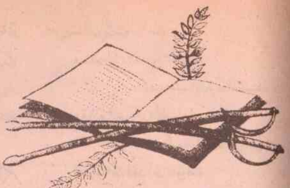

عبدالرزاق کوثر

خلیفہ مامونُ الرّشید، جو خاندانِ عباسیہ کا ایک مایۂ ناز حکمران گزرا ہے، ایک روز دل بہلانے اور سیر و تفریح کے لیے اپنے قصر سے نکلا۔ وہ آبادی سے دُور تک تفریحاً چلتا رہا۔ مضافاتِ شہر سے نکل کر صحرا میں جا رہا تھا کہ ایک کمسن لڑکی دکھائی دی جس کے شانے پر پانی کا مشکیزہ تھا۔ معصوم بچّی اُس کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اچانک اُس نے اپنے باپ کو دُور سے دیکھا۔ باپ پر نظر پڑتے ہی وہ دُور سے چلّائی:

"یَا اَبَتِ اَدْرِکْ فَاهَا ــــ فَقَدْ غَلَبَنِیْ فُوْهَا۔ لَا طَاقَةَ لِیْ بِفِیْهَا"

(ابّا جان! دوڑ کر آیئے اور مشکیزے کا مُنہ تھام لیجیے۔ اس کے دہانے پر میرا زور نہیں چلتا اور یہ میرے قابُو سے باہر ہے)

مُنہ یا دہانے کو عربی میں "فُو" کہتے ہیں۔ اور اُس معصوم بچّی نے اس لفظ کو نحوی ترکیب سے بدل بدل کر ایسی خوبی اور حُسن کے ساتھ ادا کیا جس کا لُطف اہلِ ذوق ہی جانتے ہیں۔

مامونُ الرّشید بہترین ادبی ذوق رکھتا اور فصاحت و لطافت کا دلدادہ تھا۔ ایک معصُوم بچّی سے پُرلطف کلام سُن کر وہ پھڑک اُٹھا اور چلتے چلتے رُک کر اُس نے بچّی سے کہا: "معلُوم ہوتا ہے تم فصاحتِ عرب کا مذاق رکھتی ہو۔"

لڑکی نے معصُومانہ انداز میں جواب دیا: "کیا مَیں عرب کی رہنے والی نہیں ہُوں۔"

مامون نے لُطف لیتے ہُوئے کہا: "عرب کی رہنے والی ہو تو بتاؤ کہ عرب کے کس گروہ سے تعلق رکھتی ہو۔"

کہا: "یمنیہ ہُوں۔"

مامون نے پُوچھا: "یمن کے کس قبیلے سے ہو؟"

جواب دیا: "بنی قضاعہ سے۔"

سوال کیا: "بنی قضاعہ کی کس شاخ سے تعلّق ہے؟"

بتایا: "بنی کلب سے۔"

اس پر مامونُ الرّشید نے مسکرا کر کہا: "تو معلُوم ہُوا تم کلاب (کُتّوں) میں سے ہو۔"

اس تعریض پر وہ جھینپ کر بولی: "جی ایسا نہیں ہے۔ عرب کے ایک قبیلے نے اپنا نام کلب رکھ لیا ہے۔ مَیں

اُسی قبیلے کی لڑکی ہُوں۔" پھر اُس نے انتہائی سادگی کے ساتھ کہا: "میرا تو حسب نسب پُوچھ لیا اور مَیں نے سچ سچ بتا بھی دیا۔ اب یہ تو بتائیے آپ کن لوگوں میں سے ہیں؟"

خلیفہ نے متانت سے جواب دیا: "اُن لوگوں سے جن سے تمام اہلِ یمن بُغض رکھتے ہیں۔"

لڑکی نے ذرا تامّل کے بعد کہا: "لگتا ہے آپ بنی مضر بن عدنان میں سے ہیں۔ مگر یہ تو بتا دیجیے کہ مضریوں کے کس گروہ سے ہیں؟"

مامون بولا: "اُس گروہ سے جس کے ساتھ سارے مضری قبائل کو بُغض ہے۔"

کہنے لگی: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ قریشی ہیں۔ اب ذرا ارشاد فرما دیجیے کہ قریشیوں کے کس گروہ سے آپ کا تعلّق ہے۔"

متبسم ہو کر مامون نے کہا: "اُس گروہ سے جس کے ساتھ سارے قریش کو بُغض و عناد ہے۔"

لڑکی یہ سُن کر مخاطب ہُوئی: "تو یہ کہیے کہ آپ ہاشمی ہیں۔ اب ذرا مزید تکلیف فرما کر واضح کیجیے کہ آپ ہاشمیوں کے کس خاندان کی یادگار ہیں۔"

خلیفہ نے لُطف لیتے ہُوئے جواب دیا: "اُس خاندان کی یادگار جس سے تمام ہاشمی کینہ رکھتے ہیں۔"

لڑکی ایک لمحے کے لیے جھینپ سی گئی اور کہنے لگی: "آپ پھر یقیناً آلِ عبّاس سے ہیں لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ بنی عبّاس کے کس گھرانے سے تعلّق رکھتے ہیں۔"

مامون نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا: "وہ گھرانا جس پر سارے بنی عبّاس کو حسد ہے۔"

یہ سُنتے ہی وہ لڑکی چونک کر بولی: "تو قسم ہے ربّ کعبہ کی، آپ امیر المومنین مامونُ الرّشید کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔" اتنا کہا اور مشکیزہ ایک طرف رکھ کر نہایت ادب سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور ایک خوبصورت سی چھوٹی بحر میں چند فی البدیہہ شعر موزوں کر کے مامونُ الرّشید کی تعریف میں پڑھے۔ ؎

مامون ذو المنن الشّریفه
وصاحب المرتبة المنیفه
وقائدِ العساکرِ الکثیفه
هل لک فی ارجوزة لطیفه
اظرف من فقهِ ابی حنیفه
لا۔ والّذی انت له خلیفه
ماظلمت فی حیّنا ضعیفه
عاملتنا بموؤن خفیفه
اللّص والتّاجر فی قطیفه
والذّئب والنّعجة فی سقیفه

(اے شریفانہ احسانات والے مامونُ الرّشید! اے عالی اور مکمل ترین مرتبے والے اور اے بڑے بڑے عظیم الشّان لشکر لے جانے والے! ایک پاکیزہ نظم سُنے گا جو امام ابو حنیفہ رح کی فقہ سے بھی زیادہ لطیف ہے؟ اُس دین کی قسم جس کا تُو خلیفہ ہے۔ ہمارے قبیلے میں کبھی کسی کمزور بُڑھیا پر بھی ظلم نہیں ہُوا۔ اور آپ کے پُرامن دورِ حکومت میں چور اور تاجر ایک چادر میں اور بھیڑیا اور بکری ایک چھت کے نیچے عُمر بسر کرتے ہیں۔)

اُس معصوم اور الّھڑ لڑکی کی بدیہہ گوئی نے مامون کو اور زیادہ ششدر کر کے رکھ دیا۔ اب انعام و اکرام دینے اور اُس کی ذہانت و ذکاوت کا امتحان لینے کے خیال سے لڑکی کو مخاطب کر کے پُوچھا: "بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ ایک لاکھ درہم کا وعدہ یا دس ہزار درہم نقد؟"

لڑکی بے تامّل بولی:

"ایک لاکھ درہموں کا وعدہ، اس لیے کہ مَیں جانتی ہُوں وعدہ کرنے والا عہد کا سچّا اور بات کا پکّا ہے۔"

یہ جواب سُن کر مامون مزید خوش اور محظوظ ہُوا۔ اُس نے ایک لاکھ درہم منگوا کے اُس لڑکی کو بخش دیے اور خوش خوش اپنے محل واپس چلا آیا۔

خواجہ گیسو دراز رح

سندھ سے ہردوار اور شمالی ھند سے جنوبی ھند تک قرآن و سنّت کا نُور پھیلانے والی صاحبِ دل شخصیّت کا روشن تذکرہ

رحمان مُذنب

گھنے پیڑ کی شاخوں میں دو چیلیں گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ ان کی چیخیں فضا کا سینہ چاک کر رہی تھیں۔ قریب سے گزرنے والا دیکھتا تو بے اختیار کہتا: "اللہ خیر کرے! کوئی نئی آفت نہ ٹُوٹے۔ دلّی پر تو پہلے ہی بڑی آفتیں ٹُوٹی ہیں۔" چیلیں ایک دوسرے کو لہولہان کر کے بے حال ہو گئیں تو شاخوں سے اُلجھتی اٹکتی ہُوئی خانقاہ کے احاطے میں آن گریں۔ کچھ دُور خانقاہ کے حُجرے کی دیوار سے ٹیک لگائے دو چار درویش سو رہے تھے۔ نمازِ ظہر کے بعد اُنھیں نیند آ گئی تھی۔ چیلوں کی چیخوں نے انھیں جگا دیا۔ آنکھیں ملتے ملتے اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حُجرے کی نالی میں سے خُون بہہ رہا ہے۔ چیخ مار کر اندر گئے دیکھا کہ قاتل چھری سے وار کیے جا رہا ہے اور حضرت اُف تک نہیں کر رہے۔ باہر چیلوں کا شور اور یہاں کامل خاموشی۔ درویشوں نے قاتل پر قابو پا لیا۔ ایک درویش نے اُس کا ہاتھ مروڑ کر چُھری چھین لی۔ قریب تھا کہ چھری اُس کے پیٹ میں گھونپ دیتا کہ حضرت نے منع کیا اور نیم جانی کے عالم میں کہا: "ترابی قلندر کو چھوڑ دو! یہ نادان ہے۔"

درویشوں نے اُسے چھوڑ دیا لیکن اُس کے پاؤں وہیں زمین میں گڑ گئے۔ یُوں لگتا تھا جیسے اُسے کیل دیا گیا ہے۔ حضرت کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔

"اُٹھ کم عقل! سجدہ خدا کی ذات کے سوا کسی کو روا نہیں۔ گنہگار مت بن!"

درویش اُٹھا کر اُسے باہر لے گئے۔ وہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ جب ذرا سنبھلا تو وہاں سے کِھسک گیا۔ خبر شہر میں پھیل گئی اور لوگ ترابی قلندر کے ٹکڑے کرنے کے لیے اُس کی تلاش میں نکلے لیکن اُس کا کہیں سراغ نہ ملا۔

جرّاح کو بلایا گیا۔ زخم کاری تھے لیکن جرّاح بھی بڑا کاریگر تھا۔ اُس نے مرہم پٹّی کی۔ زخم مُندمل ہو گئے لیکن حضرت نے دشمن کو معاف کر کے اُس کے دل پر ایسا زخم لگایا کہ عمر بھر مُندمل نہ ہُوا۔

حضرت مخدوم نصیر الدّین محمود چراغ دہلی رح ایک دوپہر نماز پڑھنے کے بعد حجرے میں آئے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ ملامتی فرقے کا قلندر مریدوں کو محوِ خواب دیکھ کر حجرے میں چلا گیا۔ حضرت پر حملہ آور ہُوا۔ آپ نے گیارہ زخم کھائے لیکن اپنی جگہ سے نہ سرکے، ذکر میں خلل نہ آنے دیا۔ درویش مدد کو نہ آتے تو قلندر نے ان کا کام تمام کر دیا تھا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دلّی والوں نے اس کا بڑا اثر لیا اور اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ اکثر و بیشتر کی ایک ہی رائے تھی ـــــ "فقیر کا پہرہ بدلنے کو ہے۔"

چراغ دہلیؒ فقط صوفی ہی نہیں، عالمِ باعمل بھی تھے۔ مریدین کے حلقے میں قرآن و سُنّت کی پابندی امرِ لازم تھی۔ اُن کے معاصرین میں ایسے اہلِ طریقت بھی تھے جن پر ذوق و جذبہ غالب رہتا اور وہ وجدانی مشاہدات و کیفیات اور قلبی واردات کو شریعت کے تابع نہ کرتے۔ اُن سے چشمک رہتی۔ حضرت اُن کی صحبت سے گریز کرتے۔ ملامتی فرقے کے لوگ اُن سے بیر رکھتے۔

آج اُنہیں غیر شرعی امور کی مخالفت کی سزا بھگتنی پڑی لیکن وہ اپنے رویّے پر قائم رہے۔ اُن کے مرید علومِ ظاہری پر جب تک عبور حاصل نہ کرتے، اُنہیں علومِ باطنی کے آداب و رموز نہ بتاتے۔ قرآن، تفسیر، فقہ اور منطق کے درس کی تکمیل کے بغیر ان کے حلقے میں باریاب ہونا مشکل تھا۔ سید محمدؒ اس کا ثبوت تھے جو ہدایہ، بزدوی، شمسیہ، کشّاف، مفتاح و صحائف اور دیگر کتبِ دینی پڑھنے اور علما کی صحبت میں رہنے کے بعد ہی مرشد کی نظرِ کرم کے مستحق ہُوئے۔

چراغ دہلیؒ ترابی قلندر کے حملے سے جانبر تو ہو گئے لیکن زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکے۔ تین سال کے بعد وصال ہو گیا۔ وصال سے تین دن قبل ـــــ ۱۵ رمضان المبارک ۷۵۷ھ (۱۳۶۵ء) کو سید محمدؒ گیسو دراز کو خرقۂ خلافت دیا۔ لوگوں کی پیشگوئی سچ ثابت ہُوئی ـــــ فقیر کا پہرہ سچ مچ بدل گیا۔

بادشاہِ وقت محمد بن تغلق خود جیّد عالمِ دین فقیہ تھا۔ قرآن کا حافظ، نماز روزے کا پابند، عربی فارسی میں طاق۔ تصوّف کی تحریک سے بوجوہ مطمئن نہ تھا۔ اُس کے دَور میں بزرگانِ دین اور صُلحا کے علاوہ ایسے لوگ بھی فقر کا جامہ پہن کر میدان میں آ گئے تھے جن کا مبلغِ علم واجبی تھا۔ ہندوانہ عقائد و رسوم، عجمی تصوّف اور ویدانت سے متاثر تھے۔ معتزلہ رُجحان کے حامل تھے ـــــ توہمات اور بدعات کے سوا اُن کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔

دلّی بہت بڑا تہذیبی مرکز تھا۔ علما، صُلحا، صوفیا اور دانشور بہ تعدادِ کثیر یہاں موجود تھے۔ فلسفے کا چرچا تھا۔ ایسے نکتہ وَر بھی تھے جو اپنے علم کا سکّہ جمانے کے لیے اپنی گمراہ کُن تاویلات، متضاد و متنوّع خیالات، فلسفیانہ موشگافیوں اور لادینی سوچ سے عوام کے دماغوں میں خلل ڈالتے۔ اس طرح جو فکری تاراج پیدا ہوتا وہ علما کے کام کو مشکل بنا دیتا۔ علاوہ ازیں سیاسی دھڑے بندیاں تھیں۔ منُو دھرم کے اجارہ دار برہمنوں نے نیچی ذات کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا ـــــ ایسے میں نیک دل بادشاہ کے علاوہ چراغ دہلیؒ اور گیسو درازؒ جیسے اصحاب کا دم غنیمت تھا۔

راجو قتّال جن کا اصل نام سید یوسف تھا، قلعۂ دہلی کے ملازمِ خاص تھے۔ گھر میں ہر قسم کا آرام، ہر نوع کی آسائش کا سامان مہیّا تھا لیکن بیگم ـــــ بی بی رانی بزرگ پر فقر کا غلبہ تھا۔ عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتیں۔ چوتھی رجب ۷۲۰ھ کو بچّہ پیدا ہُوا جس نام سید محمّد رکھا اور جس نے بڑے ہو کر آزاد منش قلندروں، بدعت پھیلانے والوں اور کتاب و سنّت سے انحراف کرنے والوں کا مقابلہ کیا۔ برہمنوں سے مباحثے کیے اور انہیں زیر کیا۔

پانچ سال کے ہوئے تو دلّی سے رخصت ہونا پڑا۔ محمد بن تغلق نے سلطنت کے استحکام، بغاوتیں کچلنے، دیوگیر کو اسلام کا قلعہ بنانے اور وہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی غرض سے دلّی چھوڑ کر مملکت دکن میں نیا پایۂ تخت بنانا چاہا۔ دلّی اُس وقت تصوّرات کے ہجوم، شرعی اور غیر شرعی رویّوں کی کثرت اور فکری تضادات کے باعث پریشان کُن ہو چکا تھا۔ نقل مکانی کے احکام صادر ہُوئے تو سید یوسف ۲۰ رمضان المبارک ۷۲۵ھ کو دلّی سے روانہ ہُوئے اور سات سو کوس کی مسافت چار ماہ میں طے کر کے دولت آباد (دیوگیر) پہنچے۔

والد نے بسم اللہ پڑھائی۔ عابدہ و زاہدہ ماں کی تربیت سے سید محمّدؒ آٹھ سال ہی کی عمر میں بڑوں کی طرح نماز اور روزے کے پابند ہو گئے۔ نو سال کی عمر میں مروّجہ دینی کُتب، قدوری اور مصباح پڑھنے لگے۔ ۱۱ سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کیا اور دولت آباد کی مسجد میں محراب سُنائی۔

چھ سال بعد ایک اور جانکاہ سانحہ ہو گیا۔ ۵ شوال ۷۳۱ھ کو والد انتقال کر گئے۔ دولت آباد سے تین کوس دُور خطیرۂ بزرگانِ دین میں بیرونِ حصار انہیں دفن کیا گیا جہاں نوچندی جمعرات کے میلے کا آغاز ہُوا۔ ہندو اور مسلمان سبھی اس میں شریک ہوتے۔

باپ کا سایہ اُٹھتے ہی بھرا گھر لُٹنے لگا۔ بی بی رانی بزرگ اپنے بھائی ملک الامرا ملک ابراہیم مستوفی سے کبیدہ خاطر ہو گئیں اور غیظ و غضب کی حالت میں سید محمّد اور بڑے بیٹے سید چندا کو لے کر دلّی لوٹ آئیں۔ سید محمّد کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ پندرہ برس کی عمر تک اتنی استعداد پیدا کر لی کہ عربی اور فارسی زبان میں ہر مروّجہ مضمون کی درسی کتاب پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات و مسائل بآسانی بیان کر دیتے۔ یکم رجب ۷۳۶ھ میں ان کی زندگی نئے موڑ پر آئی۔ نظام الدین اولیا کے خلیفہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کے مرید ہُوئے۔ ان کے بڑے بھائی سید چندا نے بھی بیعت کی۔ کتب بینی اور اکتسابِ علم کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ پیشوا کا حکم تھا کہ تمام درسی کتب ختم کریں۔

سید محمّد کی حیران کُن ذہانت دیکھ کر ایک مرتبہ اساتذہ میں سے کسی نے چھیڑنے یا آزمانے کی غرض سے پوچھ لیا: "راہِ سلوک کی لغزشیں اور طریقِ عشق کی خطائیں کتنی ہیں؟" انہوں نے بے تکان کہا: "سات ـــ اعراض، حجاب، تفاضُل، سلبِ فرید، سلبِ قدیم، تسلّی، عداوت۔" پھر ان میں سے ایک ایک کی تفصیل بیان کی۔ ان کے

۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ میونسپل کمیٹی ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ دِلّی کے انگریز ڈپٹی کمشنر بھی تشریف فرما تھے۔ جوشؔ ملسیانی کا نام پکارا گیا۔ وہ اسٹیج پر آئے۔ میانہ قد، سانولی رنگت، کُرتے پہ موٹے کپڑے کا کوٹ پہنے ہُوئے جس کی جیبوں میں کاغذات بھرے تھے۔ غزل شروع کرنے سے پہلے عرض کرتا ہُوں' خاص انداز اور لب و لہجہ میں کہا جسے سُن کر سامعین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ بھی آ گئی۔ غزل بھی اپنے طرز کی نرالی تھی جس کی ردیف دو بٹے تین (۲/۳) تھی۔

...... بشر میں بھی ہے شر ۲/۳

ہر مصرع میں ردیف ۲/۳ کا نباہنا مشکل کام تھا مگر جوشؔ ملسیانی کی قدرتِ بیان نے اسے نباہ کر دکھایا۔ داد ملی مگر اس میں قدرے مزاح بھی شامل تھا۔

اُستاد نے تشفّی بخش جواب سُن کر سمجھ لیا کہ شاگرد واقعی غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے۔

کتابی علوم سے فارغ ہونے کے بعد مکمّل طور پر پیر و مُرشد کی خدمت میں رہنے لگے۔ چراغ دہلیؒ اپنے نوجوان مرید کے جوش و خروش اور جذبے سے بہت متاثر ہُوئے۔ انہیں دیکھ کر انہیں اپنا ستّر سال قبل کا عہد یاد آتا، دل میں عشقِ الٰہی کی شورش از سرِ نو پیدا ہو جاتی۔ صوفیا ان کا حال دیکھ کر اعترافاً کہتے: "گیسو دراز نے جوانی ہی میں عارفِ کامل کا مقام حاصل کر لیا ہے۔"

مرشد عبادت اور قلبی فراغت کی غرض سے خطیرۂ شیر خاں میں رہتے تھے۔ قدردانی کا یہ عالم تھا کہ چل کر مرید کے پاس جاتے اور بہ اشتیاق زرِ نقد بھی دیتے۔

صفائے قلب اور خشوع و خضوع کی عبادت سے خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین کی حضوری تک رسائی ہو گئی جہاں سب کچھ تھا۔ عشقِ رسولؐ مقدم تھا اور

پھر وہ عشق کی متاع کو مخلوقِ خدا میں بانٹتے۔ عشق وہ دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ زندگی کے آخری لمحے تک آدمی کا ساتھ دیتی ہے، لازوال ہے۔

گیسودراز جب تک مرشد کی صحبت میں رہے، اُن کی خدمت پر مامور رہے۔ آدھی رات کو بیدار ہوتے، پہلے خود وضو کرتے، پھر مرشد کو وضو کراتے۔ اُنھی کے حجرے میں اُنھی کے ساتھ نمازِ تہجد پڑھتے۔ اس کے بعد حجرے سے باہر آجاتے۔ پانی کا آفتابہ اور سلفچی پاس رکھ لیتے۔ ذکرِ الٰہی کرتے۔ کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔ نمازِ فجر کے لیے اُٹھتے۔ مرشد کو وضو کرواتے۔ خود وضو کرتے اور باجماعت نماز میں شریک ہوتے۔ مرشد وظائف میں لگ جاتے۔ یہ لوگوں کو راہِ سلوک کا سبق دیتے۔ مرشد دربار لگاتے۔ دربار برخاست کر کے حجرے میں جاتے، یہ بھی وہیں چلے جاتے۔ ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ چاشت کی نماز پڑھ کر زوال کے وقت تک قرآن شریف کی تلاوت کرتے۔ نمازِ ظہر کے لیے پہلے خود وضو کرتے، پھر مرشد کو کرواتے۔ الغرض نمازِ عشا تک یہی معمول رہتا۔

گیسودراز کا لقب ایک خاص موقع پر ملا۔ مرشد شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ فرمانروائے وقت (بادشاہ محمد بن تغلق) کے رویّے سے ناخوش ہو کر پالکی میں بیٹھے اور دلّی سے روانہ ہوئے۔ ارادہ تھا کہ ٹھٹھ میں قیام کریں گے۔ جن مریدوں نے پالکی اُٹھا رکھی تھی، ان میں گیسودراز بھی تھے۔ نارنول کی سرحد پر پہنچے تو پالکی رکوائی گئی۔ شیخ نیچے اُترے۔ اُس وقت گیسودراز کے بالوں سے خون بہہ رہا تھا۔ دیکھ کر بولے: "بابا! خیر تو ہے؟" اُنھوں نے تو کہہ دیا: "سب خیریت ہے۔" لیکن شیخ کے بھتیجے علاء الدین نے کہا: "ان کے بال ڈنڈے میں اُلجھ کر دب گئے اور برابر کھنچے جاتے رہے ___ حضور کے آرام میں خلل پڑنے کے اندیشے سے اِنھوں نے کاندھا نہیں بدلا جس کے باعث بالوں سے خون بہنے لگا۔"

یہ سُن کر شیخ نے اُنھیں گلے لگایا اور فرمایا ؎

ہر کہ غلامِ سیّد گیسو دراز شُد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شُد

(جو کوئی گیسو دراز کا مرید ہُوا ___ واللہ، غلط نہیں کہ وہ سچّا عاشق ہو گیا۔)

اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی ہے۔ جیسے خود گیسودراز بیان کرتے ہیں: "مَیں نے پہلے پہل شیخ چراغ دہلوی کی خدمت میں بہ حصولِ ارادت حاضری دی تو اُس وقت شیخ بالاخانے پر تھے۔ ہم نیچے ٹھہر گئے۔ خادم نے اُوپر سے آکر پُوچھا سیّد محمد کون ہیں؟ کئی شخصوں نے یہی نام بتائے۔ خادم حیران ہُوا کہ اس نام کے کس شخص کو شیخ کی خدمت میں لے جائے۔ فوراً اُوپر گیا، اُلٹے پاؤں نیچے آیا اور بولا، سیّد محمد گیسودراز تشریف لائیں۔" پھر دوسرے لوگوں میں سے تمیز کر کے اُنھیں اُوپر لے گیا۔ شیخ نے دیکھتے ہی فرمایا: "آؤ گیسودراز!" اُس دن سے نام گیسودراز پڑ گیا۔

دوسرا لقب بندہ نواز تھا۔ یہ بھی مرشد کی دین تھی۔ سیّد محمد کی عادت تھی اُنھیں جو کچھ فتوح ہوتا ___ یعنی لوگ جو نذرانہ دیتے، اُسے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے۔ طالب علموں کا بطورِ خاص خیال رکھتے اور اُن کی قدر کرتے۔ عالم بھی تھے اور علم دوست بھی۔ ان کی مخیّر طبعی دیکھ کر شیخ نے اُنھیں غریب نواز کے لقب سے نوازا۔

بڑے مؤدّب تھے۔ علومِ ظاہری و باطنی کے حصُول کی تڑپ رکھتے تھے۔ شیخ نے اُنھیں سفر و سیاحت کا حکم دیا کہ اُن وقتوں میں بلادِ اسلامیہ کے طول و عرض میں علمائے کرام اور بزرگانِ دین پھیلے ہُوئے تھے جن کے پاس جا کر طالبانِ حق اکتسابِ علم و عرفان کرتے ___ گیسودراز دلّی سے نکلے تو حضرت معین الدین اجمیریؒ کے مزار پر پہنچے۔ تین دن حاضری دی۔ اپنی رسیلی باتوں سے لوگوں

پی آئی اے کے ذریعے سیدھے نیویارک جائیے

ہر منگل، جمعرات اور ہفتے کے روز

منگل	جمعرات	ہفتہ
پی کے ۷۰۳ (بی ۷۴۷، کومبی)	پی کے ۱۵، (ڈی سی ۱۰)	پی کے ۱۱، (بی ۷۴۷، کومبی)
روانگی کراچی: ۱۲ بجے شب	روانگی: اسلام آباد ۱۱:۵۰ بجے شب	روانگی: کراچی ۲:۳۰ بجے علی الصبح
آمد نیویارک: ۱۱:۵۰ بجے دوپہر	آمد نیویارک ۲ بجے بعد دوپہر (جمعہ)	آمد نیویارک: ۳:۲۰ بجے سہ پہر

راستے میں جہاز بدلنے کی ضرورت نہیں

ہفتے میں تین بار نیویارک کے لیے ہمارے کشادہ طیاروں میں آرام دہ سفر کا لطف اٹھائیے اور اگر آپ کو راستے میں کہیں اترنا نہیں، تو سامان لے جانے کی معیاری سہولتوں سے بھی فائدہ اٹھائیے۔

درجہ اوّل کے مسافروں کے لیے ہمارے ۷۴۷، بوئنگ طیارے میں نہایت آرام دہ، بڑی پُرسکون اور فرحت بخشنے والی، سونے کے لیے ۱۶ نشستیں مخصوص ہیں۔ آپ اپنی نشست کو پھیلا لیجیے اور اپنا سفر آرام سے سوتے ہوئے گزاریے یا ہماری مہمان نوازی سے لطف اٹھائیے۔

جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر آپ بعد دوپہر پہنچیں گے۔ یہ نہایت ہی مناسب وقت ہے، آپ بڑی آسانی سے ریاستہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا یا لاطینی امریکہ کے لیے اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے جہاز پکڑ سکتے ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے
اپنے ٹریول ایجنٹ یا اپنے قریبی پی آئی اے بکنگ آفس سے رجوع کیجیے۔

PIA پی آئی اے
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ - لاجواب پرواز

PID (ISLAMABAD)

IAL - IPP · 15 · 85

کا دل موہ لیا۔ چوتھے دن چلنے کا ارادہ کیا تو اہلِ شہر جمع ہو گئے اور اُنھوں نے چند دن مزید ٹھہرنے کو کہا لیکن یہ نہ ٹھہر سکے۔ بولے: "یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ سلطان الہند کا حکم ہے کہ کچھ دن اور سفر و سیاحت اور صحرانوردی کروں۔"

لوگوں کی محبّت اور اُن کے جذبۂ خلوص سے سرشار ہو کر چوتھے دن اجمیر سے روانہ ہُوئے۔ قصبہ سروار پہنچے۔ خواجہ معین الدّین اجمیری کے فرزند خواجہ فخر الدّین کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور وہاں سے رخصت ہُوئے۔ ناگور پہنچے۔ قاضی حمید الدّین ناگوری کے فرزندوں سے ملے۔ مزاروں پر فاتحہ خوانی کی۔ احمد آباد (گجرات) چلے گئے اور ایک قبرستان میں مقیم ہُوئے۔ حضرت قطبِ عالم کے مرید شاہ عالم ملنے آئے۔ اُنھوں نے خانقاہ میں چل کر قیام کرنے کو کہا لیکن خواجہ گیسُو دراز نہ مانے۔ نماز پڑھانے کی غرض سے احمد آباد کی جامع مسجد میں گئے۔ بچپن ہی سے ماں نے صوم و صلوٰۃ کا پابند کر دیا تھا۔ حاکمِ وقت بھی موجود تھا۔ عام فہم اور نصائح سے بھرپور عربی زبان میں برجستہ خطبہ دیا اور نمازِ جمعہ پڑھائی۔ قدر شناس حکمران نے احمد آباد میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی لیکن اُنھوں نے شیخ کے حکم کی وجہ سے معذرت کی۔ نمازِ جمعہ کے بعد اکثر لوگ قبرستان میں اُن کی قیام گاہ تک گئے۔ سہ پہر کو بادشاہ قاضیٔ شہر اور دیگر مشائخ کو لے کر آ گیا۔ زر و جواہر کی کشتیاں نذر کیں۔ اُنھیں دیکھ کر بولے: "دُنیاوی دولت کو طلاقِ بائن دے چکا ہُوں۔ قیمتی زر و جواہر کی یہ کشتیاں فقیر کے کام کی نہیں۔"

بالآخر بادشاہ کے حکم سے تمام زر و جواہر فُقرا اور مساکین میں بانٹ دیے گئے۔ شام تک لوگ چلے گئے۔ خواجہ گیسُو دراز نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے رخصت ہُوئے۔ گجرات کے دیگر اہم مقامات کی سیر کی۔ گورو ناتھ پہاڑ پر گئے جہاں ہندوؤں کا مشہور تیرتھ تھا۔

مندر کے باہر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ شورِ محشر برپا تھا۔ لوگ چیخ چلّا رہے تھے، گالی گلوچ کر رہے تھے، آپے سے باہر ہُوئے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ گھونسے تان کر ایک دوسرے پر ہلّہ بولنے کی سعی کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ ایک گروہ وردھمن مہاویر کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا، دوسرا گروہ شِو، پاربتی اور دُرگا کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کر رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے آدمیت رخصت ہو گئی ہے اور ان کے اندر درندے سما گئے ہیں۔ جین مت اور شِو کے پجاری مذہبی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ویسے جین مت کے پُجاری صلح جُو تھے لیکن وِشنُو پنتھی اُنھیں چین سے بیٹھنے نہ دیتے۔ ہندوؤں نے اُن کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ قریب تھا کہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور نوبت خونریزی تک پہنچتی کہ خواجہ بیچ میں آ گئے اور گرج کر بولے: "کیا ہو رہا ہے۔ ہٹو ایک طرف!" آواز میں ایسا دبدبہ تھا کہ فریقین ڈر سہم گئے۔

"کون ہو تم؟" وِشنُو مَت کے مہنت نے ہمّت کر کے پُوچھا۔

"یہ مت پُوچھو کہ مَیں کون ہُوں بلکہ تم مجھے بتاؤ کیوں لڑ جھگڑ رہے ہو۔"

فریقین نے اپنے اپنے طور پر نزاع کی تفصیل بتائی۔ اس پر خواجہ نے اُنھیں سمجھایا اور جھگڑا ختم کر دیا۔ اُنھوں نے قرآن و سُنّت کی تعلیم دی اور اپنے وعظ سے لوگوں کو متاثر کیا۔ اُن کی دلپذیر تقریر سُن کر لوگ اُن کے قدموں میں جُھک گئے۔ اُنھوں نے اُنھیں ٹوکا اور بتایا کہ اُن کے مذہب میں سجدہ صرف خدا کو روا ہے۔ آدمیوں کو سجدہ نہیں کیا جاتا۔ اُن کی باتیں سچّی ہی نہیں، رسیلی بھی تھیں۔ انسانوں سے محبّت، ایثار، مساوات، بھائی چارہ اور اسی قسم کے الفاظ کی تشریح سُن کر لوگوں کو اپنا معاشرہ

گھناؤنا لگا جس میں اُونچ نیچ، ذات پات اور باہمی نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو پہلے ایک دوسرے کے خُون کے پیاسے تھے، خواجہ کی دلآویز باتیں سُن کر بغلگیر ہو گئے۔ اُنھوں نے خواجہ کے ساتھ مل کر بلند آواز میں "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ" کا ورد کیا۔ ساری بستی ہل گئی۔ اب کوئی جینی رہا، نہ وِشنُو مت کا پُجاری۔ جلد ہی لوگوں میں اسلام پھیل گیا۔ خواجہ اُنھیں اسلامی تعلیم دے کر اور نماز پڑھنا سکھا کر اگلی منزل کو روانہ ہُوئے۔

اُس زمانے میں اتنی بستیاں تھیں اور نہ پختہ گزرگاہیں۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھے۔ خواجہ اُنھی میں گزرتے گزرتے ٹھٹھہ پہنچے۔ یہاں بھی ہندوؤں سے پالا پڑا۔ خواجہ نے اپنی سادگی، سادہ اصول و عقائد، عبادت کے سہل طریقوں، شیریں بیانی اور پند و نصائح سے لوگوں کو ہمنوا کیا۔ بڑے بڑے ہندو حلقہ بگوشِ اسلام ہُوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ یہاں ایک جادوگر تھا جو مسلمانوں کے درپے آزار رہتا۔ آج کی طرح اُس زمانے میں بھی ہندو اپنی اکثریت کے علاقے میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے تھے۔ خواجہ گیسُو دراز کے آنے سے وہ اور بھی بھڑکا۔ اُس نے اُنھیں للکارا۔ خواجہ سے اُس کے بڑے مقابلے ہُوئے۔ جادو کی حقیقت کچھ نہ تھی۔ ضعیفُ الاعتقاد مسلمان اُس سے ڈرتے تھے لیکن خواجہ نے حق پرستی، صفائے باطن، قرآن و سُنّت پر عمل، عزم و حوصلہ، صاف گوئی اور بے باکی سے اُن کا خوف دُور کیا۔ اُنھوں نے جادوگر کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ جو بے معنی جنتر منتر، دھمکیوں اور ظلم و تشدّد سے کام لیتا تھا۔ جادوگر کی اصلیت تو کسی کو معلوم نہ تھی، خود جادوگر اس سے بے بہرہ تھا لیکن لوگوں پر نفسیاتی اثر ڈال لیتا تھا۔ وہ خواجہ کے قیام اور مسلسل تبلیغ سے متاثّر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ راہِ راست پر آ گیا اور اُس نے اپنے تمام کارکنوں سمیت اسلام قبول کر لیا۔

خواجہ گیسُو دراز بہ اطمینان یہاں سے روانہ ہُوئے۔

ایک امریکی نوجوان نے مایُوسی کی حالت میں خُودکشی کی۔ اُس کی جیب سے ایک پُرزہ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا:

"مَیں اپنی زندگی ختم کرنے چلا ہُوں لیکن مَیں نے شرط لگائی ہے کہ اگر گھر سے دریا کے پُل تک پہنچتے پہنچتے کسی نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا یا مجھ سے صاحب سلامت کی تو مَیں خُودکشی نہیں کروں گا۔"

شیخ عیسیٰ بن شیخ یوسف فاروقی اور لعل شہباز سندھی سے ملے۔ وہاں سے بلوچستان اور افغانستان ہوتے ہُوئے لاہور آئے۔ شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش کی درگاہ میں قیام کیا جو طریقت کو شریعت سے الگ نہیں کرتے تھے۔ علم و عرفان کے نکتہ شناس تھے۔ اُنھوں نے قرآن و سُنّت کو لحظہ بھر کے لیے نظر انداز نہیں کیا جو بھی یہاں آتا ایمان تازہ کر کے جاتا۔ خواجہ کا مسلک بھی یہی تھا، اپنے عمل کو سُنّتِ نبوی کے تابع رکھنا اور بدعات سے کامل طور پر احتراز کرنا اُن کا شیوہ تھا۔

لاہور سے رُخصت ہو کر ہردوار گئے۔ یہ سرزمین جو ہندوؤں کا گڑھ تھی، نئی کیفیت سے دوچار ہوئی۔

ہر طرف گہما گہمی ہے۔ فضا 'ہری اوم، ہری اوم'، 'جے جگدیش ہرے' کی آوازوں سے گونج رہی ہے۔ مہنت اور سادھو ہاتھوں میں پیتل کی گڑویاں لیے، گلوں میں جنیو اور مالائیں ڈالے سُوئے دریا جا رہے ہیں۔ کاندھوں سے جھولے لٹکائے ہُوئے ہیں۔ ان میں برہنہ اور نیم برہنہ سبھی شامل ہیں۔ جگہ جگہ بھجن گانے والوں کی منڈلیاں اپنا رنگ جما رہی اور پیسے بٹور رہی ہیں۔ مجمع گیر رامائن کے قصّے سُنا رہے ہیں۔ کچھ لوگ دُھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو رَستے بستے گھر چھوڑ آئے ہیں، اُنھوں نے سنیاس لے لیا ہے۔ ایسے بھی ہیں جنھیں عوام کی ٹہل

سیوا نے خوب موٹا تازہ کر دیا ہے۔ مندروں میں بڑی رونق ہے۔ دُرگا، پاربتی، لکشمی، شو، گنیش اور دوسری مورتیوں کے آگے لوگ ڈنڈوت کر رہے ہیں۔ ہار پھول چڑھا اور خوشبوئیں سُلگا رہے ہیں۔ مندروں کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں تاکہ بلائیں دُور رہیں۔

ایکاایکی اشنان گھاٹ پر ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ مہنت، اُس کے چیلے چانٹے اور دوسرے لوگ بہ تعدادِ کثیر جمع ہو کر چیخ چلّا رہے ہیں۔ ادھر گھاٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہے، شور و غل اور ہنگامے سے بے خبر۔ بڑے اطمینان اور استغراق سے اپنی دُنیا میں کھویا ہُوا ہے۔ کسی میں اُس کے پاس جانے کی ہمت نہیں۔ آخر ہردوار کے مہامہنت کو خبر ملتی ہے۔ وہ چند مشٹنڈے لے کر آتا اور کچھ فاصلے پر جا کر رُک جاتا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے اُسے کسی نے کیل دیا ہے۔ وہ اس شخص کی شانِ بے نیازی، عالمِ محویت اور جاہ و جلال دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ مندروں کی گھنٹیاں تیز اور مسلسل ہو جاتی ہیں۔ اُن کے شور سے مہامہنت میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ سنبھلتا اور پھر قریب جا کر پُوری قوّت سے شور مچانے لگتا ہے۔ وہ شخص، بہزارِ دقت باطن کی دُنیا سے باہر آتا ہے۔ آنکھیں کھولتا اور مہامہنت کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ لوگ جو ڈرے سہمے پہلے ہی دُور کھڑے ہیں اور بھی دُور جا کھڑے ہوتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص بہت بڑا جادُوگر ہے جس نے نظروں کے بان سے مہامہنت کو چت کر دیا ہے۔ مہامہنت کی موت پر رونے پیٹنے لگتے ہیں لیکن مہامہنت مرا نہیں ــــ وہ حقیقت آشنا شخص مسکراتا، اپنی جگہ سے اُٹھتا، کلمہ پڑھتا اور مہامہنت کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا ہے: "اُٹھ بحکمِ الٰہی۔"

مہامہنت اُٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ ہر طرف غُل مچ جاتا ہے۔ لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اُن کے مہامہنت سے بھی بڑا جادُوگر ہے۔ مہامہنت زمیں بوس ہوتا ہے۔ وہ شخص اُسے اُٹھا لیتا اور کہتا ہے: "مجھکو تو صرف اللہ کے آگے جو سب کا پالنہار ہے، سب کو جنم دینے والا ہے" مہامہنت کو کلمہ پڑھاتا ہے۔

پھر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جہاں کھڑا ہے وہ عورتوں کے اشنان کا استھان ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھتا ہُوا وہاں سے چل دیتا ہے۔ ایک جمِ غفیر ہمراہ ہو لیتا ہے۔ کلمے کی آوازیں قدم بہ قدم بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ مردِ حق آگاہ خواجہ گیسُودراز تھے جنہوں نے مہامہنت کو مسلمان کر کے اُس کے کتنے ہی پجاریوں اور دوسرے لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔

خواجہ نے ہردوار میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے [illegible] اور سادہ ضابطۂ حیات سے باخبر کیا۔ اُنہیں صدق و صفا اور توکل الی اللہ کا درس دیا۔ لوگ متحیر تھے کہ خواجہ دین کی ہوس تو رکھتے ہیں لیکن مال و متاع سے رغبت نہیں رکھتے۔ پھر جب اُن کی باتیں سُنیں تو سمجھ گئے کہ وہ کسی جنجال میں نہیں پھنستے، مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک دن لوگوں سے کہا: "قیامت کے دن اللہ ہر ایک سے حساب کتاب لے گا۔ مال و متاع والے کو بھی حساب کتاب دینا پڑے گا۔ جتنی دیر اُسے حساب کتاب دینے میں لگے گی، اتنی دیر میں کتنے ہی متوکل فقیر جنت میں پہنچ جائیں گے۔"

توکل کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا: "توکل یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رضا پر ایسا مضبوط و مستحکم ہو جیسے شیرخوار بچہ اپنی ماں کے دُودھ پر قانع ہوتا ہے۔" نومسلم مہامہنت اور دوسرے نومسلم خواجہ کا وعظ بڑے اشتیاق سے سُنتے اور ہدایت پاتے۔

رُخصت ہونا چاہا تو نومسلم مہامہنت اور دوسرے پیروکاروں نے ہمرکاب ہونے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن خواجہ نے اُنہیں روک دیا اور کہا کہ یہیں رہ کر دینِ اسلام کی

تبلیغ اور مخلوقِ خدا کی خدمت کریں۔ بھائی بھائی بن کر رہیں اور اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھامیں۔

◄►

ہردوار سے لکھنؤ گئے۔ اُن کے پیر بھائی شیخ قوام الدین نے استقبال کیا۔ دونوں اپنے مرشد چراغ دہلوی کی یاد میں آبدیدہ ہُوئے۔

یہاں سے بہرائچ اور دریائے گھاگرہ کی بستی میں پہنچے۔ تبلیغ کی مہم یعنی جہادِ باللسان جاری رہا۔ وہاں سے بندیل کھنڈ آئے جہاں پران ناتھ جوگی کے ظلم وستم سے لوگ تنگ آئے ہوئے تھے۔ مسلمان دین سے بے گانہ تھے۔ اپنی جہالت کے باعث اس سے بہت ڈرتے۔ جانتے نہ تھے کہ جادُو فریبِ نظر اور نفسیاتی عمل کے سوا کچھ نہیں۔ کلام الٰہی کے سامنے یہ نہیں ٹھہرتا۔ پران ناتھ جوگی دندناتا پھرتا تھا۔ خواجہ گیسُو دراز طویل سفر، مشاہدات و تجربات اور زندگی کی کھُلی کتاب کے مطالعے کی بدولت علم و عرفان میں پختہ ہو چکے تھے ——— بصیرت اور بصارت دونوں ہی کو خوب فروغ ملا تھا۔ اُن کے بُشرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ پاکیزگی اور پاکبازی نے پُوری شخصیت کو جِلا بخشی تھی۔ پراُن ناتھ جوگی دیکھتے ہی ان کی ظاہری اور باطنی حیثیت کو سمجھ گیا لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بڑی تمکنت سے اپنے استھان پر براجمان رہا۔ خواجہ کو دیکھ کر مسلمان اُن کے پاس جمع ہو گئے اور اُن سے جوگی کے بارے میں فریادی ہُوئے کہ ظالم نے جینا اجیرن کر رکھّا ہے۔ ایک تو خواجہ صاحبِ کمال تھے، دوسرے محمد تغلق کی سلطنت دُور دُور تک پھیلی تھی، اس لیے صوفیا بے دھڑک ہر کہیں آتے جاتے۔ اپنی ذات پر اعتماد ہوتا، مسلمان حکمران کی چھتری سر پر ہوتی۔ مسلمان فقرا اور صوفیا سے مقامی جوگیوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں کی کو ردبتی تھی۔ خواجہ نے جب اُس کی شہرت سُنی اور لوگوں نے بتایا کہ وہ پہنچا ہُوا ہے تو سیدھے اُس کے پاس گئے۔ کلمۂ طیبہ پڑھ کر نعرۂ تکبیر داغا۔ وہ خواجہ کی شخصیت سے مرعوب ہُوا۔ خواجہ نے بڑے ہمدردانہ انداز میں اُسے سمجھایا۔ اُسے جادُو اور بُت پرستی کے کھوکھلے پن سے آگاہ کیا۔ اُس نے جو ڈھونگ رچایا تھا، اُس کا بھانڈا پھوڑا۔ اُسے توحید اور رسالت کا مفہوم سمجھایا۔ بندہ سیانا تھا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ مسلمان ہو گیا۔ اُس کے چیلے اور پُجاری بھی مسلمان ہو گئے۔

یہاں سے خواجہ نئی منزل کی طرف روانہ ہُوئے۔ جہاں جہاں سے گزرتے توحید و رسالت کا درس دیتے۔ ہندوؤں کو کلمہ پڑھاتے جاتے۔ آخر کار دولت آباد پہنچے جہاں اُن کے والد سیّد یوسف کا وصال ہُوا تھا۔ والد کی قبر بھی یہیں تھی۔ کچھ دن یہاں رہے، وہاں سے گلبرگہ چلے گئے۔ گردو نواح کا سارا علاقہ جسے سلطان فیروز شاہ بہمنی نے شہزادہ حسن خاں کے نام پر آباد کیا، حسن آباد کہلاتا تھا۔

۸۱۵ھ میں ان کی سیر و سیاحت کا زمانہ تمام ہُوا۔ گلبرگہ میں آکر قیام کیا۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ تادمِ واپسیں اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔ یہاں قیام کے دوران محلّاتی سازشوں اور خانہ جنگی کا دور آیا۔ فیروز شاہ اور احمد خاں خانخاناں آپس میں اُلجھ گئے۔ خانخاناں فتحیاب ہُوا اور اُس نے احمد شاہ بہمنی کے نام سے سلطنت کا کاروبار سنبھالا ——— خواجہ اُس کے طرفدار تھے۔ چنانچہ اُس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اُن کے مکان اور خانقاہ کی تعمیر کا انتظام کیا۔ کئی گاؤں خانقاہ کے نام وقف کر دیے۔ یہ انتظامات ۱۹۴۸ء تک قائم رہے۔

خواجہ کا طریقہ سُنّت کے مطابق تھا۔ حنفی مسلک کے تھے۔ ہر مذہب و ملّت کا آدمی اُن کی خانقاہ میں آتا اور اُن کی باتیں سُنتا۔ رات دن درس و تدریس اور پند و نصائح کا سلسلہ جاری رہتا۔ خواجہ کی خانقاہ تبلیغ کا مرکز تھی۔ عوام و خواص بھی اس مرکز سے فیض یاب ہُوئے۔ بڑے بڑے صوفیا بھی حلقۂ ارادت میں آگئے۔

چونکہ خواجہ صرف پیر و مرشد ہی نہیں، عالم بھی تھے اس لیے تالیف و تصنیف کا شغل بھی روزمرّہ کے معمولات میں شامل رہا۔ ملتقط بہ قالبِ سلوک کے نام سے قرآن کی تفسیر بطریقِ کشّاف، حواشیٔ کشّاف، شرحِ فصُوصُ الحکم مصنّفہ ابنِ عربی، شرحِ معارف، ترجمہ عوارف، شرح آداب المریدین اور اسی نوع کی متعدد کتابیں لکھیں۔ اس سے قطعِ نظر کہ بعض کتابیں متنازع فیہ ہیں، یہ عیاں ہے کہ خواجہ زبردست علمی شغف رکھتے تھے۔

کتاب الاسما میں حکایتیں درج ہیں جو ذومعنی ہیں۔ ایک حکایت جسے شیخ عبدالحق مُحدّث دہلوی نے اخبارالاخیار میں نقل کیا ہے، یُوں ہے: "چند آدمی دریا میں اُترے۔ میں نے اُن میں ایک مہوش کو دیکھا جو بے حد حسین تھی۔ رنگ رُوپ، جوانی، قدوقامت سب میں دلکشی تھی۔ اُس کی دلآویزی اشاروں ہی اشاروں میں دعوت دے رہی تھی۔ ایک میل کے فاصلے پر تھی کہ اُس نے مجھے بُلایا اور میں اس شان و شوکت سے اُس کے پاس گیا جیسے کوئی بادشاہ اپنی دُلہن ملکہ کے پاس جاتا ہو۔ ملاقات ہُوئی۔ نظر ملتے ہی محبّت ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں بصورتِ عیسٰی فرزند تولّد ہُوا جس نے کہا۔ مَیں اللہ کا بیٹا ہُوں۔ آخر کار مجھ میں اور حسینہ میں جھگڑا چل پڑا کہ عیسٰی کس کے بیٹے ہیں۔ میں کہتا، عیسٰی میرے بیٹے ہیں، وہ کہتی، میرے بیٹے ہیں۔ اور عیسٰی دونوں کے اقوال سے بیزاری کا اعلان کرتے اور کہتے مَیں تم دونوں کا بیٹا نہیں۔ خود ہی آگیا ہوں۔"

اُن کے زمانے میں بعض بدعات مرّوج تھیں جنہیں اُنھوں نے ناپسند کیا اور اپنے حلقے میں آنے والوں کو اُن سے روکا۔ بعض لوگ شیخ کے بجائے کسی متوفّی کے مزار پر جا کر بیعت کرتے۔ اُنھوں نے ایسی بیعت کو بے معنی قرار دیا۔ اسی طرح بیعت در بیعت یعنی ایک مرشد کے بعد دوسرے کو مُرشد بنا کر اُس کی بیعت کرنے سے بھی منع کیا۔

لوگوں کو جب پند و نصیحت کرتے تو اظہارِ بیاں ایسا اختیار کرتے کہ ہر ایک کی سمجھ میں بات آجائے۔ سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشاد کو پیشِ نظر رکھتے:

"لوگوں سے اُن کی عقل کے مطابق بات کیا کرو۔"

علاقے میں ہندو مہنتوں اور برہمنوں کا زور تھا۔ اُنہیں خواجہ کھٹکتے تھے لیکن مسلمان حکمران اور خواجہ کی پاکیزہ زندگی کے باعث کچھ کر نہ سکتے۔ سازشیں تو کرتے لیکن ناکام رہے۔

اپنے مریدوں کو بہر صُورت قرآن کی تلاوت کے لیے بہ اصرار کہتے اور اس کے فوائد بتاتے۔ مرشد (نصیر الدّین محمود چراغ دہلوی) کا قول دُہراتے کہ قرآن پڑھنے والا مستحقِ ثواب اور دنیا والوں کی نظر میں مُتّقی ہوتا ہے۔ اسے پڑھنے سے انوار و برکات کا نزول اور دل پر اثر ہوتا ہے۔ سماع پسند کرتے تھے لیکن اس میں بڑی احتیاط برتتے۔ اُن کے

اس دُنیاوی مکان کی چھت میں سوراخ ہیں اور دھوآں دھار بارش والے سیاہ بادل چھا رہے ہیں۔ اس لیے یہاں سے اپنا سامان اُٹھالے۔ عیش و آرام کا نہ سوچ! یہ دُنیا اگرچہ چند روزہ ہے، تاہم قیامِ عارضی کو غنیمت جان اور نفس کی آمد و شد کو نعمت سمجھ! اللہ تعالٰی کی ہر آن عبادت کرتا رہ! اُسی کی طرف لَو لگا۔ اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھ! اس دُنیا کے تمام کاموں کا کفیل صرف اللہ کو جان! اگر مکمل طہارت کے ساتھ ایسا نصیب ہو جائے جس میں تمام شرطوں کے ساتھ اللہ کی طرف متوجّہ ہو سکے تو اس نعمت پر ہزار دو ہزار سجدۂ شکر ادا کر! جب اللہ سے لَو لگ جائے اور نفس میں پاکیزگی آجائے تو دُنیا میں اس طرح رہ کہ ایک لمحے کے لیے بھی سانس اللہ سے غفلت نہ کرے۔ پھر اس دنیا میں خوشحالی تیری پابوسی کرے گی اور تُو مُستغنی رہے گا۔

(خواجہ گیسو دراز کے ایک مکتوب کا اقتباس)

نزدیک سماع صرف دو صورتوں میں جائز تھا ــــ حق جوئی کے لیے ہو تو حلال ہے، حقیقت کی جانب توجہ دلائے تو مباح ہے، حقیقت و مجاز کے درمیان رہے تو مکروہ اور مجاز کی جانب لے جائے تو حرام ہے۔

بادشاہ محمد بن تغلق جو بلند پایہ عالم اور عاقل و دانا شخص تھا، بوجوہ قوّالی ناپسند کرتا تھا۔ لوگ وجد میں آکر سربسجود ہو جاتے تھے؛ چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ آئندہ محفلِ سماع خلوت میں ہو ــــ خواجہ گیسو دراز نے اس حکم پر عمل کیا۔

بادشاہ اوامر و نواہی، امورِ شرعی و فقہی مسائل سے بخوبی آگاہ تھا، اس لیے جہاں کہیں قرآن و سُنّت کے خلاف کوئی بات دیکھتا اُسے ناپسند کرتا۔ جہاد پسند تھا اُس کی ساری عمر اپنوں اور پرایوں سے لڑنے میں گزری۔ اُسے مجاہدینِ کبار سے عقیدت تھی؛ چنانچہ ۱۳۴۶ء (۷۴۶ھ) میں عین الملک (صوبہ دار اودھ) کی بغاوت فرو کرنے کے بعد بھرائچ گیا اور اُس نے غازی سلطان محمود غزنوی کے گھرانے کے سالار مسعود غزنوی شہید کے مزار پر حاضری دی اور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جسے ۵۷۵ھ میں ہندوؤں نے شہید کیا تھا۔

بہر حال خواجہ گیسو دراز اپنی خاص وضع کے بزرگ تھے۔ اُنھیں گھر سے اور بعد ازاں صوفیا سے خاص قسم کی تر... ملی تھی۔ اسی کے مطابق اُنھوں نے زندگی بسر کی۔ بڑ... پُر آشوب دَور سے گزرے۔ ملک میں بغاوتوں کا ز... بادشاہ نے سیاسی ضرورتوں کے تحت دہلی کو چھوڑا اور دو... (دیوگر) کو پایۂ تخت بنایا جس سے رعایا کو بڑی تکلیف... اُس دَور کے صوفیا نے بھی تکالیف کا سامنا کیا اور ا... آزمائش جانا۔

خواجہ نے ان حالات کا چنداں اثر نہ لیا۔ اپنے مشن... مصروف رہے۔ دنیاوی مفاد سے گریز کیا۔ قرآن و سُنّ... کا درس دیا۔ ترکِ دُنیا کے تصور سے دُور رہے کہ یہ ہنود... مسلک تھا۔ لذائذِ دنیا سے سروکار نہ رکھا۔ اُن کے نزدیک... دُنیا میں رہتے ہوئے اس سے دلچسپی رکھنا چاہیے... یہ بات زور دے کر کہتے کہ احکامِ شرعی کی تعمیل کرتے ہو... دُنیا میں رہنا اور فرائض کی تکمیل کرنا ضروری ہے۔

اُنھوں نے اپنے مسلک کے مطابق بھرپور زندگی گزا... ۴ رجب ۷۲۰ھ کو پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر ہی میں والد نے دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ بڑے ہو کر چراغ دہلوی... روشنی حاصل کی اور ۸۲۹ھ تک علم و عرفاں کی دولت بکھیر... رہے۔ آخر اسی عالم میں وصال ہُوا۔

ایک روز موٹر پر سوار آرہا تھا۔ موٹر راستے میں بگڑ گئی، دیر تک اُسے درست کرتے رہے۔ ایک دوسری موٹر گزری تو اُس سے بعض اوزار لے کر اُسے درست کیا۔ مَیں نے پوچھا کیا خرابی تھی۔ بتایا گیا کہ ایک بہت باریک سوراخ ہے جس سے پٹرول آتا ہے، اُس میں کچھ کچرا آگیا تھا، اُس کی وجہ سے موٹر کی ساری مشینری اور ساز و سامان بیکار ہوگیا۔ انجن کام کرتا تھا نہ پہیے ہلتے تھے۔ ایک چھوٹی سی خرابی سے پُوری موٹر دھری کی دھری رہ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا، اور آیاتِ قرآنی کی تفسیر نمایاں ہوگئی ــــ "وہی بندہ بامراد اور کامیاب ہُوا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی اور وہ نامراد رہا جس نے اس کے (اچھے رجحانات) دبا دیے۔" (اللّیل)

یہی انسان کے پُورے نظامِ زندگی اور پُورے معاشرے اور تمدّن کا حال ہے۔ آج زندگی کا سارا فساد اور سارا انتشار اسی اندرونی کثافت اور ظلمت کا نتیجہ ہے اور اسی کی طرف کسی کی توجّہ نہیں

پانچویں قسط

رابرٹ لڈلم کی ہر لمحہ نئی ڈرامائی کیفیت سے گزرنے والی سلسلے وار پُراسرار کہانی۔

میٹاریز سرکل

ٹالنکوف نے اودیلی ویراشٹن کے چہرے
نظریں جما کر ہولے سے کہا: "پیر
نوسٹرو... سر کچلو۔" اودیلی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب
ہوگئی اور اُس کا رنگ زرد پڑ گیا لیکن اُس نے بظاہر
حواس قابو میں رکھتے ہُوئے کہا: "یہ نعرہ بہت پُرانا ہو چکا
اور یہ کہ اب اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔"

ٹالنکوف نے دانستہ طور پہ ایک قدم اُس کی طرف
بڑھایا۔ محافظ نے اُس کے سر کا نشانہ لیا اور اُس کی اُنگلی
حرکت میں آگئی۔ ٹالنکوف دھم سے کوچ پر گر گیا اور دھماکے
سے کمرہ گونج اٹھا۔ عورت نے محافظ کو غصّے کی نگاہوں
دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اُس کی توجہ ہٹی تو ٹالنکوف نے
چھلانگ لگا کر پستول کی نالی اپنی گرفت میں لے لی۔
دو چار لمحے دو آدمیوں کی طاقت وری اور ہنر مندی کا امتحان
تھے۔ اس امتحان میں ٹالنکوف کامیاب ہُوا۔ اُس نے محافظ
کے پیٹ پر ہاتھ ڈال کر اُن اعصاب کو مروڑ دیا جو
نازک ہوتے ہیں۔ محافظ درد سے چلّایا۔ ٹالنکوف نے اُسے
اُٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور عین اُس

اُس نے اودیلی کا ہاتھ اپنے سمور کے چُغے کے اندر غائب ہوتے
دیکھا۔ اُس نے جھپٹا مار کر اُسے فرش پر گرا دیا۔ پستول دُور
جا گرا۔ ٹالنکوف اُس کے سینے پر گھٹنا رکھتے ہُوئے بولا:
"ادان! تم قتل کرنا چاہتی تھی مجھے!"

"تم ضرور مارے جاؤ گے۔" عورت نے گھٹی گھٹی آواز
میں کہا۔

"ممکن ہے مارا جاؤں لیکن تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں
گا۔"

"مَیں تمہاری جان بچا سکتی ہُوں اگر تم بتا دو کہ شیفرڈ بوائے
اس کل کہاں ہے۔"

"یہی بات مَیں تم سے پُوچھنے آیا تھا۔" ٹالنکوف نے
جواب دیا۔ اُسے کھڑا ہونے کا حکم دیا اور پستول اُس کی گردن کی
پشت سے لگا دیا۔

عورت نے کہا: "بے وقوف مت بنو۔ مَیں تمہاری جان
بچا سکتی ہُوں۔ بس یہ بتا دو کہ تم شیفرڈ بوائے کے متعلق کیا جانتے ہو۔"

"اگر بتا دوں تو اس کے بدلے تم کیا اہم بات بتا سکتی
ہو؟" ٹالنکوف نے پوچھا۔

"یہاں تو نہیں... میرے ساتھ باہر چلو... وہاں میرے
باپ کی کار کھڑی ہے۔ اُس میں بیٹھ کر ہم ایک دوسرے
سے راز معلوم کریں گے۔"

لموسین جب بیٹھ کر اودیلی ویراشٹن نے اسٹیئرنگ ہاتھ
میں پکڑی۔ کھلے پھاٹک سے نکل کر اُس نے کار کا رُخ بائیں
طرف موڑنا چاہا تو ٹالنکوف نے بریک پر پاؤں رکھ دیا اور
اسٹیئرنگ گھما کر کار کا رُخ دائیں طرف کر دیا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اودیلی نے پوچھا۔

"کیا معلوم تم نے پہلے ہی سے کسی ملاقات کا انتظام کر
رکھا ہو۔" عورت کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر ٹالنکوف کو
یقین ہو گیا کہ اُس کا خدشہ درست ہے۔ سڑک کے کنارے ایک
کھیت دیکھا تو اُس نے کہا: "کار کھیت میں لے جاؤ۔" کار
کھڑی ہُوئی تو عورت بے صبری کے انداز میں بولی: "بتاؤ تمہیں
شیفرڈ بوائے کے متعلق کیا کچھ معلوم ہے۔"

"پہلے تم اپنا راز بتاؤ۔" ٹالنکوف نے کہا۔

"تمہارا امریکی دوست ہلاک ہو چکا ہے۔ اب تم اکیلے رہ
گئے ہو۔" عورت نے آہستہ سے کہا۔

"کہاں؟" ٹالنکوف نے حیران ہو کر پوچھا۔
"واشنگٹن میں۔۔۔" عورت نے کہا۔ وہ کچھ اور تفصیل بتانے والی تھی کہ سڑک پر ایک طاقتور انجن کی آواز سُن کر خاموش ہو گئی۔ کار کی روشنیاں اندھیرے کو چیرتی ہوئی اُن تک آ پہنچیں اور چشم زدن میں تین آدمی کود کر کار سے نکلے۔ اودیلی نے کہا: "وہ آ گئے ہیں ٹالنکوف! مجھے پستول دے دو۔ مَیں تمہاری جان بچا سکتی ہُوں۔" عین اُسی لمحے ایک بوچھاڑ سی ہُوئی اور اودیلی اُس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ وہ لمبی لمبی گھاس میں سے ہوتا ہُوا جنگل میں گم ہو گیا۔ گولیاں دیر تک اُس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اندھیرا اُس پر مہربان تھا۔ کوئی گولی اُس تک نہ پہنچ سکی۔

ادھیڑ عمر کا موسیقار جہاز کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور وائلن اُس نے گھٹنوں پر رکھا ہُوا تھا۔ جہاز ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد پیرس میں اُترنے والا تھا۔ وہ کارسیکی لڑکی اینٹونیا سے مل کر سکوفیلڈ کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ سکوفیلڈ ہلاک نہیں ہُوا۔ اودیلی نے جان بُوجھ کر اُسے غلط خبر دی تھی۔ سکوفیلڈ کو یہ خبر پہنچانا ضروری تھی کہ ولیم ڈی میٹاریز کے مہمانوں میں سے ایک اور مہمان کا قصّہ بھی پاک ہو چکا ہے۔ اودیلی اشٹن کو خود سرکل نے اپنی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ اب اس خاندان کے دو وارث زندہ تھے ایک ڈیوڈ ولیورلے، فارن سیکرٹری، گریٹ برٹن۔ اور دوسرا جوشوا ایپلٹن سینٹر، یونائیٹڈ سٹیٹس کانگرس۔
" وہ آدمی کون ہے جس نے سکوفیلڈ کی موت کے بارے میں سرکل کو یقین دلایا ہے۔" ٹالنکوف نے سوچا۔ "کیا یہ آدمی سکوفیلڈ کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیوں؟"
اچانک ٹالنکوف کی نظر برابر کی سیٹ پر سوئے ہُوئے آدمی پر جا پڑی جس کے گھٹنوں پر اخبار کُھلا پڑا تھا۔ ایک تصویر اُسے مانوس سی نظر آئی ——— اُس نے اخبار اُٹھا لیا۔ تصویر کا مسکراتا ہُوا شفیق چہرہ ہنری کاسل کا تھا۔ خبر میں درج تھا: "ایبن کا مشہور اٹارنی ہنری کاسل قتل ہو گیا۔ اُسے بڑی بے دردی سے گلے میں پھندا ڈال کر قتل کیا گیا ہے۔ اُس کے سینے پر نیلی سیاہی میں ایک دائرے کا نشان نقش تھا۔ جب اُس کی لاش ملی تو یہ سیاہی ابھی تک تازہ اور گیلی تھی۔"
وسیلی ٹالنکوف نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہنری کاسل کی سزائے موت کا فیصلہ اُسی کے ہاتھوں ہُوا تھا۔ غم کی وجہ سے وہ نڈھال ہو گیا۔

"سکوفیلڈ!" یہ آواز اُس نے اپنی پشت پر سُنی۔ بڑی ہی حیران آواز۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ پکارنے والا ایک زرد رُو آدمی تھا۔ سکوفیلڈ تیزی سے دوڑا اور لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوے میں گُم ہو گیا۔ "یہ آدمی یقیناً سی آئی اے کا کوئی جاسوس ہے اور اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔" اُس نے سوچا۔ "مجھے کوئی پناہ گاہ تلاش کرنی پڑے گی۔" لندن میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جس کی اُس نے بارہا مدد کی تھی۔ وہ مدد کرنے والا آدمی ایم۔ آئی ۶ کے رجسٹر سے کب کا خارج ہو چکا ہوتا۔ اُس کا نام روجر سائمنڈز تھا۔ وہ چیرنگ کراس اسٹیشن سے اُترا اور بہیدل لوگوں میں شامل ہو گیا۔ ایک دُکان سے اُس نے نیا ہیٹ اور جیکٹ خریدی اور اپنی پُرانی جیکٹ اور ہیٹ دُکان کے ڈریسنگ رُوم میں اُتار کر پھینک دیا۔ دُکان سے باہر نکل کر وہ ٹیلی فون بوتھ پر گیا۔ نمبر ڈائل کیا تو اینٹونیا اُسے فون پر مل گئی۔ اُس نے کہا: "وسیلی ٹالنکوف پیرس پہنچ گیا ہے۔"
"اُسے فون دو۔"
"مسٹر سکوفیلڈ!" ٹالنکوف بولا۔ "مَیں نے وورڈس خاندان کا اتا پتا معلوم کر لیا ہے۔ اُس خاندان کی وارث ماری گئی ہے۔"
"اُسے کس نے مارا؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔
"میٹاریز سرکل نے۔" ٹالنکوف نے جواب دیا۔ "تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ ہماری ایک ایک بات سے واقف ہو چکے ہیں اور اُن کے فدائی راز فاش

ہونے سے پہلے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ مَیں تفصیل ملاقات پر بتاؤں گا۔"
"ملاقات کب ممکن ہے؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔
"کل رات یا صبح۔ مَیں یہاں سے پرائیویٹ طیارہ کرائے پر لے رہا ہُوں اور ہائیتھ اور ایش فورڈ کے درمیان جو پرائیویٹ ایئر پورٹ ہے، وہاں اُتروں گا۔" ٹالنکوف نے کہا۔
لندن کی ٹیلی فون ڈائرکٹری میں روجر سائمنڈز کا نام اُسے مل گیا۔ اُس نے نمبر زبانی یاد کر لیا۔ پکاڈلی سرکس کے ایک بوتھ سے روجر کو پہلا فون ساڑھے سات بجے کیا۔ ایک عورت نے چونگا اُٹھا کر کہا: "بس وہ ایک دو روز میں آیا ہی چاہتا ہے۔ آپ کا نام اُسے کیا بتاؤں؟"
"نام بتانے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ مَیں پھر فون کروں گا۔" سکوفیلڈ نے کہا۔
"اُس کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ یقیناً اُسے آپ کا نام یاد ہو گا۔" عورت نے اصرار کیا۔
"شکریہ!" سکوفیلڈ نے فون بند کرتے ہُوئے کہا۔
دس منٹ بعد اُس نے ایک اور جگہ سے فون کر کے پوچھا: "کیا آپ کے شوہر تشریف لے آئے ہیں؟"
"نہیں۔ ابھی ابھی ایک شراب خانے سے اُن کا فون آیا ہے۔ بس وہ آنے ہی والے ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔
سکوفیلڈ کو ایم آئی ۶ کا ایک خفیہ نمبر یاد تھا جو صرف دوست جاسوسی اداروں کو دیا جاتا ہے۔ اُس نے یہ نمبر ڈائل کیا۔ جواب آیا تو کہا: "مَیں مسٹر سائمنڈز سے ملنا چاہتا ہُوں۔ براہ کرم اس کال کو ترجیح دیجیے۔"
"مَیں سائمنڈز بول رہا ہُوں۔"
"تمہاری بیوی نے بتایا تھا کہ تم گھر پہنچ رہے ہو لیکن ایک شراب خانے میں رُک گئے ہو۔"
"تم کون ہو؟" سائمنڈز نے پوچھا۔
"ایک پُرانا دوست۔" سکوفیلڈ نے جواب دیا۔

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے، دیگر ممالک کی طرح جاپان میں بھی کینسر سپیشلسٹ مفقود تھے۔ ۱۹۳۰ء میں کینسر انسٹی ٹیوٹ ہسپتال کے تازاکی یُوزو نے کینسر کے خصوصی مطالعے پر آمادگی کا اظہار کیا تو اُس کے اساتذہ اور طالب علم ساتھیوں نے یہ کہہ کر حوصلہ شکنی کی کہ اس میدان میں کوئی روشن مستقبل نہیں۔ دراصل اُن دنوں اس بیماری کا تصور ہی دہشت ناک تھا۔ اس کے باوجود تازاکی یُوزو اپنے ارادے پر ڈٹا رہا اور پھر ایک روز 'مردِ سرطان' کی حیثیت سے اُس کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل کر رہی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عشرہ ۱۹۶۰ء کے شروع میں تازاکی خود بھی بالائی جبڑے کے سرطان سے مرا۔ (جاپان ایکو)

"حیرت ہے تم پُرانے دوست ہو کر بھی نہیں جانتے کہ مَیں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔"
"بہت جلدی کی ضرورت ہے۔ مجھے کوئی خفیہ نمبر دو جس کے ذریعے تمہیں تفصیل بتا سکوں۔"
"تم ہو کون؟" سائمنڈز نے پُوچھا۔
"دو ہزار پاؤنڈ!" سکوفیلڈ نے کہا۔ سائمنڈز کو سمجھنے میں ایک دو ثانیے لگے۔ پھر اُس نے ایک خفیہ نمبر بتایا اور بارہ منٹ کا وقفہ دیا۔ سکوفیلڈ دوڑتا ہُوا آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک فون بوتھ پر پہنچا۔ خفیہ نمبر ڈائل کرنے پر روجر سائمنڈز سے اُس کی فوراً بات ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ کورٹ روڈ پر چلے جاؤ۔ بیس منٹ بعد ایک منی بس آکسفورڈ سٹریٹ سے آئے گی۔ فٹ پاتھ کے قریب آ کر اُس کا انجن خراب ہو جائے گا۔ اُس کا ڈرائیور کالا آدمی ہے۔ وہ انجن دُرست کرنے لگے تو تم اُس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ جانا۔"
ڈرائیور نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں سکوفیلڈ کا فوٹو تھا۔ سکوفیلڈ نے اپنے سر سے ہیٹ اُتارا

تو ڈرائیور نے "شکریہ" کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "میرا نام اسرائیل آئیلز ہے۔" کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر بولا: "ہم اپنی پہلی منزل پر پہنچنے والے ہیں۔" اُس نے گاڑی کی رفتار کم کی اور اُسے اُسی سمت میں گھمایا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ تقریباً تیس لمحوں بعد ایک اور گاڑی آئی اور سکوفیلڈ اس گاڑی سے نکل کر دوسری میں جا بیٹھا۔

ایک جگہ جہاں لوگ پکنک کے لیے آئے ہوئے تھے اور میلہ سا لگا ہوا تھا، کار ٹھہر گئی۔ یہاں ایک اور کار اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ روجر سائمنڈز اس میں بھی نہیں تھا۔ دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک نے کار میں سے نکل کر اُسے خوش آمدید کہا۔ تب ایک ٹیکسی آئی۔ اُس میں سے روجر سائمنڈز نے اُترتے ہوئے کہا: "سکوفیلڈ! کیا حال ہے تمہارا؟ میرے ساتھ ساتھ آؤ۔"

پکنک گراؤنڈ میں روشنیوں کا سیلاب اُمڈا ہوا تھا۔ کہیں جھولے تھے اور کہیں ہنڈولے۔ ایک ہنڈولے میں آمنے سامنے بیٹھ کر روجر نے سکوفیلڈ سے اُس کی پوری کہانی سن لینے کے بعد کہا: "میں تمہاری مدد کروں گا حالانکہ جانتا ہوں کہ تم نے پوری کہانی نہیں سنائی۔ دو باتیں چھوڑ دی ہیں۔ تم نے یہ ذکر نہیں کیا کہ جاسکو بھی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اور ویسلی ٹالنکوف جو کبھی تمہارا دشمن تھا، اب اُس کے ساتھ تمہارا اشتراکِ عمل ہے۔" روجر سائمنڈز نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ابھی وقت نہیں آیا کہ اس اشتراکِ عمل کی وجہ بیان کروں۔" سکوفیلڈ نے وضاحت کی: "کیا تم ویورلے کے ساتھ میری ملاقات کا انتظام کر سکتے ہو؟"

"کوشش کروں گا۔" روجر سائمنڈز نے مختصر سا جواب دیا۔

سکوفیلڈ نے ایک نیوز سٹینڈ سے ٹائمز لیا اور ساتھ کے چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس وقت پونے دس بجے تھے اور سوا دس بجے اُس نے خفیہ نمبر پر سائمنڈز کو فون کرنا تھا۔ دیوار پر لگا ہوا پبلک فون اُس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اخبار میں اودیلی ویراشٹن کی موت کو بڑی اہمیت دی گئی تھی۔ اسی خبر سے معلوم ہوا کہ انگلستان اور امریکہ کے کاروباری حلقوں میں اُس کی موت شدت سے محسوس کی گئی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ لندن اور نیویارک کے ساتھ اس خاندان کا تعلق بہت گہرا ہے۔ عین اُسی لمحے دیوار پر لگے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ ریستوران کی ایک ویٹرس نے فون سن کر چڑی ہوئی آواز میں پوچھا: "کیا یہاں کوئی بی۔ آگیٹ موجود ہے؟" بی آگیٹ بیوولف آگیٹ .... یہ اُس کا فرضی نام تھا اور جاسوسی اداروں کی فائلوں میں اُس کا یہ نام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ اخبار ہاتھ میں لیے فون تک پہنچا، اُس نے چونگا کان سے لگایا اور پوچھا: "کون؟"

"گڈ مارننگ بیوولف آگیٹ۔" ایک نہایت شائستہ آواز نے آکسفورڈ کے لہجے میں کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" سکوفیلڈ بولا۔

"میرا نام تمہارے لیے بے معنی ہوگا کیونکہ تم مجھے نہیں جانتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے تمہیں تلاش کر لیا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو جھگڑا ہے اُس کا فیصلہ دوستانہ ماحول میں ہو جائے؟"

"مجھے قاتلوں پر بھروسہ نہیں۔" سکوفیلڈ نے جواب دیا۔

"وہ لوگ اور ہیں۔ ہم تو تمہاری اب تک حفاظت کرتے چلے آئے ہیں۔"

"تمہارا کوئی آدمی یہاں ریستوران میں موجود ہے؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔ گھڑی پر دس بج کر گیارہ منٹ ہو چکے تھے۔ چار منٹ کے بعد اُسے سائمنڈز کو فون کرنا تھا۔

"وہ آدمی جس نے اوورکوٹ پہن رکھا ہے اور جس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔"

"میں نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ وہ مجھ سے پانچ میزوں کے فاصلے پر بیٹھا ہے۔ مجھے اتنا موقع دو کہ میں ناشتہ ختم کر لوں۔" سکوفیلڈ نے فون کا چونگا دیوار کے ساتھ لٹکا

ہوئے کہا۔ اٹیچی کیس دائیں ہاتھ میں منتقل کر کے وہ اُس آدمی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا: "مجھے تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ فون پر سب کچھ طے ہو گیا ہے۔ مجھے ایک فون کرنا ہے جس کا نمبر اُنھوں نے دیا ہے۔ دیر ہو گئی تو نمبر مجھے بھول بھی سکتا ہے۔"

سوا دس بجنے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ وہ آدمی بے حس و حرکت گم سُم بیٹھا رہا۔

"مجھے بہت جلدی ہے۔ اُنھوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔" سکوفیلڈ نے کہا: "بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو چکا ہے۔"

"تم کہاں ہو؟ ہم تمہاری مدد کو آئیں گے۔" روجر سائمنڈز نے کہا۔

سکوفیلڈ نے اپنا اتا پتا بتاتے ہوئے کہا: "باقاعدہ پولیس کی سائرن والی دو کاریں کافی رہیں گی۔ یہ ظاہر کیا جائے کہ ریستوران میں آئرش تخریب کاروں کا پتہ چلا ہے۔"

"میں نے لکھ لیا ہے۔ کاریں روانہ ہو چکی ہیں۔" روجر نے کہا۔

"کیا ویورلے سے انٹرویو طے ہو چکا ہے؟"

"ہو چکا ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" روجر بولا۔ "کل رات تم ساڑھے چار بجے فون کر کے مجھے اپنا پتہ بتا دینا۔"

"تمہاری مدد پہنچ چکی ہے۔ شکریہ!" سکوفیلڈ نے فون بند کرتے ہوئے کہا اور پانچ میزوں کا فاصلہ طے کر کے میٹاریز سرکل کے قاتل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم کس سے بات کر رہے تھے؟" دھنسے ہوئے گالوں والے قاتل نے پوچھا۔

"اُس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔" سکوفیلڈ نے جواب دیا۔ "صرف کچھ ہدایتیں دی ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ ہمیں جلد سے جلد اس ریستوران سے نکل جانا چاہیے۔ اس علاقے میں آئرلینڈ کے تخریب کاروں کی اطلاع ملی ہے۔"

اُس آدمی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے اپنے دائیں طرف سر کا اشارہ کیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی نہایت کرخت چہرے والی عورت اُٹھی، اپنا پرس کندھے پر ڈالا اور ریستوران کے دروازے کی طرف ہو لی۔ سکوفیلڈ کیشیئر کے جنگلے کی طرف بڑھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو سیاہ رنگ کی کاریں فٹ پاتھ کے ساتھ آ لگی تھیں اور چار پولیس والے کود کر باہر نکلے تھے۔ اس سے پہلے کہ پولیس اندر داخل ہو، سکوفیلڈ دروازے کی طرف لپکا اور کھول کر باہر چلا گیا۔ پچکے ہوئے گالوں والا آدمی اور کرخت چہرے والی عورت بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھے کہ پولیس کو دروازے پر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ سکوفیلڈ نے ایک پولیس والے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "یہ ہیں وہ لوگ۔ ان کی تلاشی لو۔ ان کے کپڑوں سے پستول ضرور برآمد ہوں گے۔" پولیس میٹاریز کے دونوں قاتلوں پر جھپٹ پڑی اور سکوفیلڈ نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ہجوم میں گم ہو گیا۔ ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا وہ پبلک ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ گیا۔ فون پر رش بہت کم تھا۔ اُس کا ٹالنکوف سے فوراً رابطہ قائم ہو گیا۔ "میں چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔" ٹالنکوف بولا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم روانہ ہونے سے پہلے مجھے مل گئے۔ اینٹونیا کہاں ہے؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"وہ سبزی وغیرہ خریدنے گئی ہے۔ ابھی آ جائے گی۔"

"یہاں پہنچ کر تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"ٹاور کنٹرول پر پہنچ جاؤ۔" ٹالنکوف نے جواب دیا۔

سکوفیلڈ اپنے پرانے ٹھکانے پر نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ اُسے نئی پناہ گاہ تلاش کرنی پڑی۔ کونناٹ ہوٹل کے ایک ڈائریکٹر سے اُس کی پرانی شناسائی تھی۔ اُس کے توسط سے اُس شاندار ہوٹل کا کمرہ نمبر ۲۲۶ اُس کے لیے مخصوص ہو گیا۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ گلی میں پہنچ کر اُس نے ٹیکسی کرائے پر لی۔ ٹاور کنٹرول سے مراد واٹرلو برج سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے کا ایک مقام تھا۔ ٹیکسی سے اُتر کر اُس نے ٹیڑھی بینگی گلیوں میں اپنے آپ کو گم

کردیا اور دریا کے کنارے اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں ٹالنکوف سے ملاقات کا امکان تھا۔ یہاں اِکّا دُکّا جوڑے مستی کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ اُن میں کہیں اُسے ٹالنکوف نظر نہ آیا۔ اچانک اُس نے سگریٹ لائٹر کے شعلے کی مختصر سی چمک دیکھی۔ یہ ٹالنکوف کا مخصوص انداز تھا۔ اُس نے سفید بالوں والا ایک آدمی دیکھا جو سُرخ بالوں والی لڑکی کا سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ٹالنکوف تھا۔ سکوفیلڈ نے اُسے اشارے سے بتایا کہ وہ جنوب کی طرف چلنا شروع کر دے، کسی مناسب مقام پر وہ اُس سے آملے گا لیکن ٹالنکوف ٹس سے مس نہ ہُوا۔ سکوفیلڈ سڑک عبور کر کے ٹالنکوف کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لڑکی جو ٹالنکوف کے کندھوں سے لگی ہُوئی تھی، اینٹونیا تھی۔

"اسے بے ہوشی کی دوا پلائی گئی ہے۔" ٹالنکوف نے کہا۔

"کون سی دوا؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"سکوپولامین ... اس کا اثر دیر تک رہتا ہے۔" ٹالنکوف نے کہا۔

صبح ہونے والی تھی۔ کمرہ نمبر ۶۲۶ کے پلنگ پر اینٹونیا بے سُدھ پڑی تھی۔ پچھلی شام پیرس میں اُسے میٹاریز سرکل کے آدمیوں نے اغوا کر لیا تھا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ اگر سکوفیلڈ اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دے تو وہ اینٹونیا کو چھوڑ دیں گے۔ ٹالنکوف نے سکوفیلڈ بن کر اُسے اُن کے قبضے سے آزاد کرایا تھا۔ اس مہم میں اُسے بہت خطرہ مُول لینا پڑا تھا۔ "میں حیران ہوں مسٹر سکوفیلڈ! میٹاریز والے تمہیں زندہ گرفتار کرنا اور تم سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اینٹونیا کو اُن سے چھڑا لایا ورنہ ہر وقت اُن کی گولی کی زد میں تھا۔ اب تم بتاؤ اپنی مہم کا حال۔"

"شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ ویورلے آج رات آٹھ بجے اس کمرے میں ہم سے ملاقات کر رہا ہے۔" سکوفیلڈ نے کہا۔

ٹالنکوف نے حیران ہو کر پُوچھا: "یہ کیسے ممکن ہُوا؟"

سکوفیلڈ نے اُسے روجر سائمنڈز کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی رُوداد سُنائی تو اُسے حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گیا۔ اُس نے اُٹھتے ہُوئے کہا: "میں اب جا رہا ہُوں۔ کل دوپہر فُون کروں گا۔"

"تم یہاں بھی ٹھہر سکتے ہو۔" سکوفیلڈ نے پیشکش کی۔

"نہیں! یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لندن میں چُھپنے کے لیے میرے پاس درجنوں جگہیں ہیں۔ تم فکر مت کرو۔" ٹالنکوف نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

❋

اُس رات آٹھ بجے ٹالنکوف کونات ہوٹل کے کمرہ نمبر ۶۲۶ میں آیا۔ اینٹونیا پر بے ہوشی کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اُسے اگلے پروگرام کے لیے تیار کر رہا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی ہُوئی۔ سکوفیلڈ نے چونگا اٹھایا۔ روجر سائمنڈز کی آواز میں بہت دُکھ تھا۔ "وہ سب قتل کر دیے گئے۔ ویورلے، اُس کی بیوی بچے اور تین نوکر ... یہ سب تمہاری وجہ سے ہُوا ہے، سکوفیلڈ!"

"نہیں ... یہ غلط ہے۔" سکوفیلڈ نے بات کاٹتے ہُوئے کہا: "میں جو کچھ کر رہا تھا، اُس کا مقصد اس قتل کو روکنا تھا۔"

"انہیں جانوروں کی طرح ذبح کر دیا گیا ہے۔" روجر سائمنڈز کی آواز میں جنوں کی لرزش تھی۔

"روجر! خُدا کے لیے صبر سے کام لو۔ یہ وقت ہوشیاری اور عمل کرنے کا ہے، رونے پیٹنے کا نہیں۔" سکوفیلڈ کے لہجے میں غُصّہ تھا۔

"یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہُوا۔ تم برطانوی حکومت کی طرف سے اب نظر بند ہو۔" روجر بولا۔

"نہیں روجر! میں ٹھہر نہیں سکتا ... دیکھو! ایک آدمی کے ساتھ ایک ملاقات انتہائی ضروری ہے ... اگر تم مزید غارت کو روکنا چاہتے ہو تو یہاں آؤ۔ میں تمہیں نیچے لاؤنج کے کسی خالی اور تنہا بُوتھ میں مل جاؤں گا۔"

"اچھا!" روجر نے کہا۔ "دس منٹ کے اندر اندر میں

وہاں پہنچ رہا ہُوں۔"

"وہ تمہیں گرفتار کر لے گا۔" ٹالنکوف نے کہا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا ... بفرضِ محال اُس کی طرف سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہُوئی تو میں اُسے قتل کر دوں گا۔" سکوفیلڈ نے اپنے بیگ سے لمبے پھل والا شکاری چاقو نکالتے ہُوئے کہا۔ "میں ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس اِسی کمرے میں پہنچ جاؤں گا۔"

لاؤنج کے ایک تنہا بُوتھ میں بیٹھ کر سکوفیلڈ نے مناسب حد تک روجر سائمنڈز کو اپنے راز میں شریک کر لینے کے بعد کہا: "روجر! مجھے کچھ وقت دو۔ شاید میں اس راز کی تہہ تک پہنچ سکوں اور اس طرح دُنیا کو ایک بہت بڑے تخریبی طوفان سے بچا سکوں۔"

"ایک شرط پر ... اور وہ یہ کہ تم اس سرکل کی تفصیل لکھ کر مجھے دو۔ ورنہ اس وقت دو آدمیوں کے پستول کی نالیاں تمہارے جسم کا نشانہ لے رہی ہیں۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔" روجر نے کہا۔

سکوفیلڈ نے پوچھا: "میں تمہاری شرط مان لُوں تو مجھے کتنا وقت دو گے؟"

"صرف ایک ہفتہ۔" روجر بولا۔

سکوفیلڈ نے اپنی نوٹ بک سے ایک ورق پھاڑا اور اُس پر لکھنا شروع کیا:

۴ اپریل ۱۹۱۱ء: پورٹو ویکیو، کارسیکا ... سکوزی۔ وورونشن۔ ویورلے ... ایپلٹن۔

موجودہ: ولیم سکوزی مر چکا ہے ... اوڈیلی ویراشٹن مر چکی ہے ... جان ویورلے ... ٹھکانے لگ چکا ہے ... جوشوا ایپلٹن ... کچھ معلوم نہیں ... سکوزی پاراوسنی انڈسٹریز ... میلان میں ہیں ... ویراشٹن ورکس ... ایسن میں واقع ہیں ... ٹرانس کمیونیکیشن ... بوسٹن میں ہے ... ان ناموں اور کمپنیوں کے نیچے اُس نے ایک لفظ لکھا ... میٹاریز ...

لفٹ میں سوار ہو کر سکوفیلڈ نے سوچا: "اب ہمیں بوسٹن

جاپانیوں کے ایک گروہ سے جب یہ پُوچھا گیا کہ وہ دل کے دورے سے مرنا پسند کریں گے یا سرطان سے تو نوّے فیصد نے دورۂ دل کا انتخاب کیا، کیونکہ یہ جلد زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہی سوال ایک امریکی گروہ سے پُوچھا گیا تو تیس فیصد نے سرطان سے مرنے کو ترجیح دی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اُن کے کیس مہلک ٹھہرنے کے بعد بھی انہیں چار ماہ سے لے کر ایک سال تک زندہ رہنے کا موقع مل جائے گا جس سے وہ ضروری معاملات نپٹا لیں گے اور آگے کی سوچ سکیں گے۔

(جاپان ایکو)

جانا چاہیے۔ صرف جوشوا ایپلٹن چہارم باقی رہ گیا ہے جو اس زنجیر کی آخری کڑی ہے۔" اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا ... اُس کے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ یکایک اُس کے اعصاب شَل سے ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے اُس نے چاقو اپنی جیب سے نکالا اور دروازے کی طرف لپکا ... اندر کی ہر چیز پہلے کی طرح موجود تھی لیکن ٹالنکوف اور اینٹونیا غائب تھے۔ بیڈروم کے فرش پر خون کا ایک دھبّہ تھا۔ تازہ اور سُرخ سُرخ۔ اُس نے اُوپر نظریں اُٹھائیں۔ کھڑکی کا ایک چھوٹا سا شیشہ گولی سے اُڑا ہُوا نظر آیا۔ شکستہ اور چُور چُور ... اُس نے پکارا: "ٹونی!" کھڑکی کا ایک اور شیشہ ٹُوٹا۔ ایک گولی سامنے کی دیوار میں گڑ گئی۔ وہ فرش پر چِت لیٹ گیا۔ تب فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے لیٹے لیٹے تار کھینچ کر فون کو فرش پر گرا لیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔

"مسٹر بیوولف! کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ ہم جب چاہیں تمہیں قابو میں کر سکتے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اینٹونیا کہاں ہے؟"

"تم اینٹونیا کا پُوچھ رہے ہو۔ ٹالنکوف سے تمہیں کوئی تعلق نہیں؟"

"تم نے دونوں کا کیا حشر کیا؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"رُوسی جاسوس زخمی ہے لیکن وہ جلد ہوش میں آجائے گا... اور لڑکی ایک ایئر فیلڈ پر ہے۔"

"تم اُسے کہاں لے جارہے ہو؟" سکوفیلڈ نے پُوچھا۔

"تمہاری فہرست کے آخر میں ایک شہر کا نام درج تھا۔ تم بھُول گئے۔ ہم اُسے وہیں لے جارہے ہیں۔"

"بوسٹن میں... تمہیں یہ فہرست کہاں سے ملی۔ روجر سائمنڈز...؟"

"بیوُولف! وہ مرچکا ہے۔ ورنہ یہ فہرست ہمارے ہاتھ کیسے لگتی؟"

"تم وحشی انسان ہو۔" سکوفیلڈ نے بڑی نفرت سے کہا۔

"نہیں... یہ ہمارا پیشہ ہے۔ اگر تم لڑکی واپس حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں بوسٹن میں ایک شخص سے ملنا ہوگا۔"

"وہ کون ہے؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"احمق مت بنو... بوسٹن میں تم اپنی کوشش سے پہنچو گے۔ وہاں رٹز کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرنا اور رجسٹر میں وکرے نام لکھوانا۔"

"بوسٹن میں!" سکوفیلڈ نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

تیسرا شیشہ ٹُوٹا اور گولی سامنے کی دیوار میں جا گھُسی۔

"یہ گولی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں ورنہ یہ تمہاری کھوپڑی کو بھی پاش پاش کرسکتی تھی۔"

✕

سکوفیلڈ جانتا تھا کہ میٹاریز والے اُسے زندہ کیوں پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی تخریبی کارروائیوں میں استعمال کرنے کے بعد اُسے ٹھکانے لگا دینے کا پروگرام بنائے ہُوئے ہیں۔ اینٹونیا کی معیت میں جس پُرسکون زندگی کا خواب دیکھا تھا، وہ میٹاریز کا آدمی بننے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا؛ چنانچہ اُس نے سوچا کہ اب اینٹونیا کو بچایا نہیں جاسکتا البتہ میٹاریز سرکل والوں سے انتقام لیا جاسکتا ہے۔ اُس نے مانٹریال پہنچ کر اپنے ایک پُرانے شناسا کو تلاش کرلیا۔

اپنے ہاتھ سے دو ٹیلی گرام فارم بھرے۔ پہلے ٹیلی گرام میں اُس نے رٹز کارلٹن کے مینیجر سے کمرہ مخصوص کردینے کی درخواست کی تھی اور دوسرے ٹیلی گرام میں جو ایک دن بعد بھیجا جانا تھا، اُس نے اسی مینیجر کو اطلاع دی تھی کہ وہ چند وجوہ کی بنا پر اگلے روز تک ہوٹل نہیں پہنچ سکتا۔ دونوں ٹیلی گرام مسٹر وکرے کی طرف سے تھے۔ اب اُس کے پاس تین دن اور ایک رات کی مدت تھی جس میں اُسے میٹاریز سرکل کی آخری کڑی تک پہنچنا تھا۔ اس معمّے کی چابی سینیٹر جوشوا اپیلٹن کے پاس تھی۔

اب تک اُس نے جو تحقیق کی تھی، اُس کا لب لباب یہ تھا:

کوریا کی جنگ میں جوشوا اپیلٹن کپتان کی حیثیت سے لڑا تھا۔ وہ اچھا افسر تو نہیں تھا، اچھا انسان ضرور تھا۔ اپنے ماتحتوں پر بہت مہربان۔ کئی بار اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس نے اپنے ماتحتوں کی جان بچائی تھی۔ اُس بہادری کے اُسے تمغے ملے تھے۔ جنگ کے بعد اُس کی کار ایک انتہائی سنگین حادثے سے دوچار ہوگئی۔ اُس کے جسم کا انگ انگ شدید زخمی ہُوا تھا۔ اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن ڈاکٹروں نے اُسے معجزانہ طور پر بچا لیا تھا۔ اب وہ امریکہ کی صدارت کا اُمیدوار تھا۔ سکوفیلڈ اُس تک پہنچ جانا چاہتا تھا کہ اس معجزے کا سُراغ لگائے جو بڑا ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر مشتبہ اور پُراسرار تھا۔

وہ کیمبرج (امریکہ) جارہا تھا جہاں وہ قانون کے ایک پروفیسر کا شاگرد رہا تھا۔ یہ پروفیسر کارپوریٹ لا کا ماہر تھا۔ اُس کا نام تھیوڈور گولڈمین تھا۔ پروفیسر اپنے پُرانے شاگرد سے مل کر بہت خوش ہُوا۔ "اتنے عرصے بعد تم ملنے آئے ہو۔ کوئی کام ہے مجھ سے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"مَیں بوسٹن کی ایک کمپنی ٹرانس کمیونیکیشنز کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہُوں۔" سکوفیلڈ نے جواب دیا۔

"یہ ایک دیو ہے جو چالیس منزلہ عمارت میں مقیم ہے اور اُس کے بازو دُور دُور تک پھیلے ہُوئے ہیں۔ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں جو اس کے چنگل سے بچا ہو۔" پروفیسر گولڈمین نے کہا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ کوپن بھریے اور تپ دق کے مریض کو بچائیے

یہ سادہ سا سوالنامہ مکمل کیجیے اور کسی تپ دق کے مریض کی امداد کا ثواب حاصل کیجیے۔

ہر ماہ صرف ۱۰۰ رُوپے خرچ کرکے یہ نیک کام کیجیے۔ جس کے نتیجے میں ایک غریب خاندان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی محنتی لوگوں کو عزّت سے روزگار کمانے میں مدد مل سکتی ہے۔ آپ کے عطیے سے ایک غریب مریض کی مایوسی اُمید میں بدل سکتی ہے۔ آپ کے لیے تو ۱۰۰ روپیہ معمولی حیثیت رکھتا ہے، لیکن آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ یہی رقم جمع ہوکر عظیم کام سرانجام دے سکتی ہے۔

میرا نام : ____________________

پتہ : ____________________

آپ خود بتائیے کہ آپ مریضوں کی کہاں تک مدد کرسکتے ہیں۔؟

اور آپ مریض کے علاج کے لیے رقم کتنی مدت کے بعد بھیجنا پسند فرمائیں گے؟

ماہانہ ۱۰۰ رُوپے ☐

سہ ماہی ۳۰۰ رُوپے ☐

سالانہ ۱۲۰۰ رُوپے ☐

ظاہر ہے کہ آپ کی عطیہ دی ہُوئی رقم کے صحیح طریقے سے خرچ ہونے کے متعلق معلومات بھی آپ حاصل کرینگے۔ فرمائیے اس ضمن میں آپ کو سالانہ رپورٹ تفصیل اخراجات ارسال کی جائے؟"

ہاں ☐ نہیں ☐

آپ کے عطیات انکم ٹیکس سے مُستثنیٰ ہونگے۔

براہِ مہربانی چیک یا ڈرافٹ پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن سیونگ اکاؤنٹ نمبر ۵-۱۵۲۷۷ حبیب بینک لمیٹڈ گلبرگ نمبر ۲ (مین برانچ مارکیٹ) اور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ مین مارکیٹ گلبرگ کے نام تیار کیا جائے۔

نوٹ : اندرون یا بیرون ملک مقیم حضرات اپنے عطیات اس پتے پر روانہ کریں۔

پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن ۳۴-ایف گلبرگ نمبر ۲ نزد مین مارکیٹ لاہور

ٹیلیفون : ۸۷۳۲۶۸ تار : PUNTEEBEE

"لیکن یہ دیو وجود میں کیسے آیا؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"یہ ایک آدمی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ اُس کا نام نکلس گانڈرون ہے۔"

"میں نے بھی اُس کا نام سُنا ہے۔ وہ جدید دور کا کارنیگی اور راک فیلر ہے۔" سکوفیلڈ نے کہا۔

"نہیں ... یہ لوگ اُس کے مقابلے میں بونے لگتے ہیں، مسٹر سکوفیلڈ! ایسا آدمی اور اس صدی نے تو پیدا نہیں کیا۔ اسے یورپ کے ہر ملک نے اعزاز بخشنا ہے حتیٰ کہ رُوسی بلاک اور خود ماسکو میں بھی اُس کی بہت قدر و منزلت ہے۔ اُس کی عمر اُسّی سال سے تجاوز کر چکی ہے اور ابھی تک وہ ویسا ہی چاق چوبند ہے جیسا اُس دن تھا جب وہ بوسٹن میں پہلی بار آیا تھا۔"

"کیا اُس کا تعلق بوسٹن سے ہے؟"

"ہاں ... یہ بھی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ وہ اس ملک میں دس یا گیارہ سال کی عُمر میں وارد ہُوا۔ اُس کے ساتھ اُس کا اَن پڑھ دیہاتی باپ تھا۔ ایک جہاز کے تہہ خانے میں بیٹھ کر یہاں پہنچے۔" گولڈمین نے کہا۔

سکوفیلڈ کو اچانک یُوں محسوس ہُوا جیسے اس خبر پر اُس کے اعصاب تن گئے ہوں "یہ جہاز کہاں سے آیا تھا؟"

گولڈمین نے چائے کی ایک چُسکی لیتے ہُوئے کہا: "اٹلی کے جنوبی حصّے سے ؛ سسلی یا کسی اور جزیرے سے۔"

"کیا نکلس گانڈرون اپیلٹن فیملی کے کسی مرد سے واقف تھا؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"اُس کا باپ اپیلٹن خاندان کے ہاں ملازم تھا۔ موجودہ سینیٹر کے دادا نے اس بچّے پر خصوصی توجّہ صَرف کی ... اور اس بچّے نے بڑا ہو کر اُس کے ایک ایک احسان کا بدلہ چکایا۔ سینیٹر کی کھوئی ہُوئی ساکھ اُسے واپس مل گئی۔"

سکوفیلڈ سوچ میں پڑ گیا۔ گانڈرون کا لفظ گانڈ سے نکلا تھا۔ گانڈ رہبر ہوتا ہے اور رہبر گڈریے کا کردار ادا کرتا ہے۔

"آج سے سات آٹھ ماہ پہلے گانڈرون نے جنرل اسمبلی سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ اُس کا نام گانڈ سے مشتق ہے اور وہ اپنے آپ کو گڈریا خیال کرتا ہے جو اہلِ دُنیا کو کھائیوں اور گھاٹیوں سے محفوظ رکھنا اپنا ایک فرض سمجھتا ہے۔" پروفیسر گولڈمین نے سکوفیلڈ کی خُفیہ سوچ کی تصدیق کر دی۔

"کیا آپ نے اُس کی تقریر سُنی؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"سارے بوسٹن نے سُنی۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"اُس کی آواز کیسی تھی؟" سکوفیلڈ نے پُوچھا۔

"آواز! ... اتنے بوڑھے آدمی کی آواز میں تُندی و تیزی میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔ بڑی کرخت اور درشت آواز لیکن ایک ایک لفظ واضح تھا۔" گولڈمین نے کہا۔

سکوفیلڈ نے آنکھیں بند کر لیں اور کارسیکا کی پہاڑیوں میں اُس اندھی اور بوڑھی عورت کو دیکھا جس نے کہا تھا کہ اب بھی ریڈیو پر میں کبھی کبھار وہ آواز سُنتی ہُوں جو تند و تیز ہواؤں سے بھی زیادہ دُرشت اور ظالمانہ ہے۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ شیفرڈ بوائے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

❋

بلاشبہ وہ شیفرڈ بوائے کی شخصیت سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن کس قیمت پر؟ اُس نے اینٹونیا کھو دی تھی اور اپنے ایک دُشمن کو بھی جو اَب اُس کا مخلص دوست تھا ... واسلی ٹالنکوف ... کے جی بی کا ایک خطرناک کارکن ... سانپ کی طرح تیز اور زہریلا ... اور اب وہ میٹاریز سرکل کی قید میں تھا۔ انھی پریشان خیالات میں سرگرداں سکوفیلڈ پروفیسر گولڈمین کے گھر سے نکلا۔ گولڈمین نے اپیلٹن خاندان کا بھرپور انداز میں تعارف کروایا تھا۔ سینیٹر جوشوا اپیلٹن کا باپ آج سے کئی سال پہلے وفات پا گیا تھا۔ اُس کا محل جو اپیلٹن ہال کے نام سے مشہور تھا، نکلس گانڈرون نے کئی گُنا زیادہ قیمت دے کر خرید لیا تھا۔ سینیٹر کی ماں مسز اپیلٹن بیکن ہل کے ایک مکان میں منتقل ہو گئی تھی۔ کیا سینیٹر کی بُوڑھی ماں سے اُسے کچھ مواد مل سکتا ہے؟ مائیں دوسری عورتوں کی نسبت اپنے بیٹوں کو بہتر طور پر جانتی ہیں۔ نو بج کر بیس منٹ ہو گئے تھے۔ بوسٹن میں اُس کی موجودگی کا انہیں پتہ نہ چل جائے۔ اُس نے اپنی چھٹی حِس سے مشورہ لیا اور اُسے ہاں میں جواب ملا۔ مکان کے قریب ایک عمارت کے سائے میں کھڑے ہو کر اُس نے دُوربین آنکھوں سے لگائی۔ مسز اپیلٹن کے مکان کے اِردگرد اُسے کوئی کار نظر نہ آئی جس میں میٹاریز سرکل کے آدمی چھُپ کر بیٹھے ہوں۔ رات سخت سرد تھی۔ اور برفانی ہوا کے جھکّڑ چل رہے تھے۔ اُس نے پھاٹک پر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ ایک نرس نے دروازہ کھولا۔ وہ اُسے فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی عورت تھی جسے لندن میں اُس نے چکمہ دیا تھا۔ عورت نے بھی اُسے پہچان لیا۔

"مَیں مسز اپیلٹن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ اپنی خوابگاہ میں چلی گئی ہیں۔ اب وہ کسی سے نہیں مل سکتیں۔" عورت نے دروازہ بند کرتے ہُوئے کہا۔ سکوفیلڈ نے اپنا بایاں پاؤں دروازے کے پٹ کے سامنے اڑا کر اُسے کندھوں کا زور لگا کر کھول دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ مجھے تم جانتی ہو۔" اُس نے اندر پہنچ کر کہا۔ عورت کا ہاتھ اپنی یونیفارم کی جیب میں گیا ہی تھا کہ سکوفیلڈ نے جھپٹ کر اُس کی کلائی پکڑ لی اور بائیں ہاتھ سے اُس کی گردن دبوچ لی۔ وہ بے حس و حرکت ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اُس کی جیب سے اُس نے ریوالور نکال لیا۔ اچانک اوپر سے کسی موٹر کی گھرر گھرر کی آواز آئی۔ بجلی سے چلنے والی ایک وہیل چیئر نیچے اُتر رہی تھی۔ اُس میں ایک بُوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اُس نے کہا: "نوجوان آدمی! اس عورت کو قابو میں لانے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"مسز اپیلٹن! مَیں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا اور یہ عورت اس میں حائل ہو رہی تھی۔ مَیں حکومتِ امریکہ کا جاسوس ہُوں اور انتہائی نازک معاملے میں آپ سے ملنا چاہتا ہُوں۔" اتنا کہہ کر اُس نے بے ہوش عورت کو اُٹھایا اور ڈرائنگ رُوم میں لے جا کر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا اور دروازہ بند کر کے واپس مسز اپیلٹن کے پاس آ گیا۔ مسز اپیلٹن نے کہا: "بیٹھ جاؤ اور بتاؤ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"کچھ دن ہُوئے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو ایک خُفیہ رپورٹ ملی کہ آپ کا بیٹا یورپ کی ایک ایسی تنظیم سے میل جول رکھتا ہے جو بین الاقوامی جرائم میں بُری طرح ملوّث ہے۔" سکوفیلڈ نے کہا۔ بوڑھی عورت، جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شراب میں دُھت ہے، اُس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔ "کونسی تنظیم؟ ... کیا تم مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"نہیں! مذاق کی کوئی بات نہیں ... ایسا تعلق اُس کی شہرت پر بُرا اثر ڈال سکتا ہے۔"

"سینیٹر کی شہرت پر کوئی چیز بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مستقبل کا صدر ہے۔"

"جب وہ کوریا کی جنگ سے واپس آیا تو اُس تنظیم نے ..." سکوفیلڈ نے کہا۔

"کوریا کی جنگ کا ذکر اس گھر میں ممنوع ہے، نوجوان آدمی!" مسز اپیلٹن نے کہا۔ "جنگ انسان کی شخصیت مسخ کر دیتی ہے۔ جوشوا جب جنگ سے واپس آیا تو بالکل بدلا ہُوا تھا ... وہ کتنا خوبصورت لڑکا تھا ... کتنی محبّت کرنے والا نوجوان ... اور جب مجھ سے ملا تو اُس کے رویّے میں بڑی سرد مہری تھی ... جب کوریا میں تھا تو مَیں نے بے تحاشا پینی شروع کر دی تھی اور اب میں الکوحلک ہو چکی ہُوں۔"

"اس پر مُستزاد وہ حادثہ ..." سکوفیلڈ نے مسز اپیلٹن کو ایک گلاس میں وہسکی بھر کر دیتے ہُوئے کہا۔

"اس حادثے نے رہی سہی کسر پُوری کر دی ... میرا بیٹا اب میرا بیٹا نہیں رہا۔" بوڑھی عورت بولی۔

"اپیلٹن ہال میں اُس کا کمرہ جُوں کا تُوں ہے۔ پھر مجھے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں ایک کمرہ مَیں نے اُس کے لیے مخصوص کر دیا لیکن وہ یہاں کبھی نہیں آیا۔"

"کیا میں اُس کا کمرہ دیکھ سکتا ہُوں؟ مسز اپیلٹن!" سکوفیلڈ

نے پوچھا۔

"اس سے تمہیں کیا ملے گا؟" بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"بس کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ مَیں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا پتہ مَیں آپ کے بیٹے کی کچھ مدد کر سکوں۔" بوڑھی عورت نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سچّے آدمی ہو۔ اچھا آؤ میرے ساتھ۔"

سکوفیلڈ وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا جوشوا ایپلٹن کے مخصوص کمرے میں پہنچا جہاں وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ کمرہ ایک امیر کبیر نوجوان کا ذوق سامنے رکھ کر سجایا گیا تھا۔ اس میں جوشوا کی جوانی کی یادگار ہر چیز موجود تھی۔ تصویریں، کتابیں، سپورٹس کی چیزیں اور قیمتی فرنیچر۔۔۔ بوڑھی عورت دیوار پر لگے فوٹوگراف دیکھنے میں محو ہوگئی۔ ہر فوٹوگراف میں اُس کا بیٹا موجود تھا۔ ایک تصویر نے سکوفیلڈ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ۱۹۴۹ء کی ایک گروپ فوٹو تھا۔ اس میں کشتی کے تختے پر چار ملّاح کھڑے تھے جوشوا ایپلٹن اُن کے درمیان تھا۔ اُس کے ساتھ نوجوان کھڑا تھا، اُس کے اور جوشوا کے انداز اور رویّے میں بہت مماثلت نظر آتی تھی۔

"یہ دوسرا نوجوان کون ہے؟" سکوفیلڈ نے مسز ایپلٹن سے پُوچھا۔

"یہ اُس کا دوست ہے۔ فوج میں اکٹھے رہے لیکن وہ کوریا کی جنگ سے بچ گیا۔ اُس نے میرے بیٹے جوشوا کے ساتھ غدّاری کی۔ وہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں چھپا رہا اور میرا بیٹا جنگ کی بھٹّی میں جلتا رہا لیکن قدرت بڑی انصاف پسند ہے۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھتے ہُوئے پھسل گیا اور اتنا زخمی ہوا کہ مر گیا۔"

"اُس کا نام کیا تھا؟" سکوفیلڈ نے پُوچھا۔

بوڑھی عورت نے جو نام بتایا۔ اُسے سُن کر سکوفیلڈ کانپ گیا۔ اُس کا سانس رُک گیا۔ کمرے میں ہوا یکدم رُک سی گئی تھی۔ اُس نے شیفرڈ بولائے کو تلاش کر لیا تھا اور اب وہ ایک اور پُراسرار گھاٹی کے کنارے کھڑا تھا۔

بوڑھی عورت کو اُس کی خواب گاہ میں لاکر سکوفیلڈ نے ایک گلاس میں کچھ برانڈی ڈالی اور اُس کے ہاتھ میں تھما کر پھر اُسی مخصوص کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے دیوار پر سے ایک تصویر اُتاری اور کمرے کی بتّیاں بجھا کر نیچے کی منزل میں آ گیا۔ نرس ابھی تک بے ہوش تھی۔ گھر کی تمام بتّیاں بجھا کر وہ باہر آ گیا۔ ٹیکسی لے کر سیدھا ایک گھٹیا درجے کے ہوٹل میں پہنچا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی تحقیق اور تفتیش کی رُوداد لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ صُبح ہونے سے پہلے سترہ صفحوں میں مینا ریز سرکل کے متعلق ہر معلوم چیز محفوظ کر چکا تھا۔ دو تین گھنٹے کی نیند کے بعد اُس کی طاقت اور حواس بحال ہو گئے۔

اب اگلا مرحلہ بوسٹن کے جنرل ہسپتال جانے کا تھا جہاں جوشوا کا حادثے کے بعد علاج ہُوا تھا۔ ہسپتال کے ریکارڈز اور بلنگ ڈیپارٹمنٹ کی خاتون کلرک کے سامنے اُس نے حکومت کی طرف سے ایک شناختی کارڈ پیش کیا۔ جس سے وہ خاتون بہت متاثر ہُوئی اور ملاقاتی کی بات بڑی توجہ سے سُننے لگی:

"آج سے پچّیس برس پہلے ۱۹۵۳ء اور ۵۴ ۱۹ء کے چند مہینے سینیٹر جوشوا ایپلٹن اس ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں اُسے اس ہسپتال کے ڈاکٹروں اور عملے کے دوسرے افراد نے اپنی انتھک محنت سے نئی زندگی بخشی۔ اس صحت یابی کے پچیس برس پُورے ہونے والے ہیں اور سینیٹر اس کی سلور جوبلی منانا چاہتا ہے۔" سکوفیلڈ نے کہا۔

"عجیب بات ہے!" خاتون کلرک بولی۔ "لوگ ایسے حادثات بھلا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"خاتون! آپ بھول رہی ہیں۔ جوشوا ایپلٹن ایک سیاستدان بھی تو ہے اور اگلے سال امریکہ کی صدارت کے لیے کھڑا ہونے والا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی ووٹ لینے کا کوئی حربہ ہو۔"

"ہاں، ہو سکتا ہے۔" وہ عورت کچھ سوچتے ہُوئے بولی۔ "اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے نومبر ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۴ء کا ریکارڈ چاہیے تاکہ اُن لوگوں کی فہرست بنا سکوں جنھوں نے سینیٹر کا علاج کیا تھا۔ سینیٹر اُنہیں ایک یادگار میڈیکل شیلڈ تحفے میں دینا چاہتا ہے۔" سکوفیلڈ نے جواب دیا۔ خاتون کلرک نے تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک فائل تلاش کی اور سکوفیلڈ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس فائل میں میڈیکل کی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں جن میں سے اکثر وہ سمجھ نہیں سکا تھا؛ تاہم اُس کے ذہن میں جو تصویر اُبھری، وہ نہایت دردناک تھی۔ حادثے کے بعد جب جوشوا ایپلٹن اس ہسپتال میں لایا گیا تو اُس کا بدن چُور چُور تھا، چہرہ پچکا ہوا تھا اور صرف سانس باقی تھا۔ یہ اس صدی کا معجزہ تھا کہ تین چار ماہ کے بعد اُس کا جسم بحال ہوگیا اور چہرہ درست ہوگیا۔ سکوفیلڈ نے فہرست تیار کرنا شروع کر دی۔ حادثے کے فوراً بعد دو عام سرجنوں اور ایک پلاسٹک سرجن کے علاوہ آٹھ نرسیں اس کیس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ دو تین ہفتوں کے بعد ان کی جگہ نئے ڈاکٹر اور نرسیں آگئیں۔ کُل ملا کر پندرہ نام تھے۔ اُس نے آخری دو ڈاکٹروں اور تین نرسوں کی تحقیق پر زیادہ محنت صَرف کرنے کا فیصلہ کیا۔

خاتون کلرک کو فائل واپس کرتے ہُوئے اُس نے کہا: "مجھے ان لوگوں کا پتہ درکار ہے۔"

"اس سلسلے میں مَیں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ آپ کمپیوٹر سیکشن میں چلے جائیے۔" کمپیوٹر کی بورڈ پر ایک داڑھی والا حبشی لڑکا بیٹھا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ مَیں آپ تکلیف دے رہا ہوں۔" سکوفیلڈ نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، آپ کی سفارش جس خاتون نے کی ہے، وہ میری دوست کی سہیلی ہیں۔" حبشی لڑکے نے کہا۔ "اور سہیلیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کام بتائیے۔"

سکوفیلڈ نے فہرست اُس کی طرف بڑھا دی۔ لڑکے نے کی بورڈ پر پہلا نام پنچ کیا اور کہا: "یہ ڈاکٹر تو کبھی یہاں رہا ہی نہیں۔"

"لیکن فائل میں اس کا نام موجود ہے۔"

"تو پھر اُس کا نام اس کمپیوٹر سے نکال دیا گیا ہے۔"

اُس نے دوسرا نام پنچ کیا تو معلوم ہُوا کہ یہ ڈاکٹر اکتیس مارچ ۱۹۵۴ء کو اسی ہسپتال میں مر گیا تھا۔ اُس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی اور اُس وقت اُس کی عمر بتیس برس تھی۔

"ایپلٹن ۳۰ مارچ کو اس ہسپتال سے ڈسچارج ہُوا تھا۔" سکوفیلڈ نے اپنے دل میں کہا۔

"یہ تین نرسوں کے نام ہیں۔ دیکھو تو بھلا ان کا کیا انجام ہُوا؟"

کیتھرائن، ایلس اور جینٹ ۲۶ مارچ ۱۹۵۴ء کو ایک ہی دن وفات پا گئی تھیں۔

"کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی موت کی وجہ کیا تھی؟" سکوفیلڈ نے پوچھا۔

"کمپیوٹر آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں! ایک آدمی کا نام یاد آیا جو ستر سال سے اس ہسپتال میں کام کر رہا ہے، اُس سے ملتے ہیں!" حبشی لڑکے نے مسکراتے ہُوئے کہا۔ اُس بُوڑھے آدمی سے ملاقات ہوئی تو حبشی لڑکے نے کہا: "دلوا جان! آپ کو یاد ہو گا کہ آج سے پچیس برس پہلے اس ہسپتال کی تین نرسیں ایک ہی دن فوت ہو گئی تھیں۔"

"بڑا دردناک حادثہ تھا۔ تینوں نوجوان لڑکیاں ڈوب کر مری تھیں۔" بُوڑھے نے کہا۔

"وہ کیسے؟" سکوفیلڈ نے پُوچھا۔

"کچھ بگڑے ہُوئے امیر لڑکے اُنہیں پکنک پر ساتھ لے گئے۔ رات کو اُنہیں کشتی کی سیر کی سوجھی اور کشتی ڈوب گئی۔"

"اُن لڑکوں کا کیا بنا؟" سکوفیلڈ نے سوال کیا۔

"امیر لڑکوں کو تیراکی بھی سکھائی جاتی ہے۔ وہ تیر کر بچ

پاکستان ریلویز

ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور

ڈپٹی چیف کنٹرولر آف پرچیز / آر ایم / کیرج فیکٹری، پاکستان ریلویز، ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور کو مندرجہ ذیل کے ضمن میں ایف او آر کی بنیاد پر پیشکشیں مطلوب ہیں۔

مشتہرہ ٹنڈر نمبر : C.F / 4 P / 726 . B / 85
برائے پلائی وڈ شیٹ : ۱ آئٹم
تواریخ فروخت : ۲۵ - ۵ - ۸۵ تا ۱۵ - ۶ - ۸۵
ٹنڈر کھلنے کی تاریخ : ۱۶ - ۶ - ۸۵
ٹنڈر کی قیمت : ۲۵/- روپے (ناقابلِ واپسی)

ٹنڈر فارمز دفتر ڈپٹی چیف کنٹرولر آف پرچیز / آر ایم / کیرج فیکٹری، پاکستان ریلویز ہیڈ کوارٹرز آفس، شاہراہِ عبدالحمید بن بادیس لاہور کے علاوہ دفتر ڈپٹی کنٹرولر آف سٹورز / انسپکشن / رتی لائن / پاکستان ریلویز، کراچی کینٹ اور چیف آفیسر / کیرج فیکٹری، پاکستان ریلویز، اسلام آباد سے تمام ایّامِ کار میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

چیف کنٹرولر آف پرچیز

آر ایم / کیرج فیکٹری
پاکستان ریلویز ہیڈ کوارٹرز آفس لاہور

پی آئی ڈی (لاہور) ۵۰۳۴

گئے۔" بوڑھے آدمی نے دُکھ سے کہا۔

"عجیب بات ہے!" سکوفیلڈ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تمہیں تھوڑی سی تکلیف اور کرنا پڑے گی، میرے دوست!" سکوفیلڈ نے کہا۔ "ابھی دو ڈاکٹروں اور آٹھ نرسوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا باقی ہیں۔"

ان آٹھ نرسوں میں سے چار زندہ تھیں اور ایک ڈاکٹر بھی۔ وہ ڈاکٹر جس نے جوشوا ایپلٹن کا چہرہ بحال کیا تھا، مر چکا تھا اور جو ڈاکٹر زندہ تھا، اُس کا نام نیتھینیل کرافورڈ تھا۔ سکوفیلڈ نے فون پر اُس سے رابطہ قائم کیا تو ایک عجیب انکشاف ہُوا کہ جوشوا ایپلٹن حادثے کے بعد زندہ رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے زندہ رکھنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کرافورڈ اور اُس کا ساتھی پلاسٹک سرجن ہسپتال کی ملازمت سے برطرف کر دیے گئے تھے اور اُن کی جگہ دو نئے ڈاکٹر لائے گئے۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر تو مر چکا تھا اور دوسرا جو زیورچ سے بلایا گیا تھا، اُس کا نام ہسپتال کے ریکارڈ سے مٹا دیا گیا۔

سکوفیلڈ نے پُوچھا: "ڈاکٹر کرافورڈ! آپ نے مریض کو ناقابلِ علاج کیوں قرار دیا تھا؟"

"جو ایکس ریز نتائج مجھے مہیا کیے گئے تھے، وہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ مریض کا بچنا کسی حالت میں ممکن ہی نہیں۔ ایکس ریز نتائج میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ ایکس ریز اگر حاصل ہو جائیں تو معمّہ حل ہو سکتا ہے۔" سکوفیلڈ نے سوچا۔

اُس نے حبشی لڑکے سے پوچھا: "کیا یہاں پُرانے ایکسریز فوٹو محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام موجود ہے؟"

"یقیناً ہے..." حبشی لڑکا بولا۔

"کیا آج سے پچیس سال پہلے کے جوشوا ایپلٹن کے منہ کا ایکس ریز فوٹو مل سکتا ہے؟" سکوفیلڈ نے پُوچھا۔

"مل سکتا ہے لیکن اس کے لیے بڑی محنت درکار ہو گی۔"

"مَیں مناسب خدمت کرنے کو تیار ہوں۔" سکوفیلڈ نے کہا۔ حبشی لڑکے کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہُوئے اُس نے مزید کہا: "نوجوان دوست! میں ایک اہم کیس کی تحقیق کر رہا ہوں اور اس پر پُوری انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہے۔"

"مجھے اس قسم کی باتوں پر یقین تو نہیں آیا کرتا۔" حبشی لڑکے نے کہا۔ "لیکن تمہارے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو، مَیں تمہاری مدد کروں گا۔"

کیا تم واشنگٹن جا کر وہاں سے مجھے ایک اور ایکس ریز فوٹوسٹیٹ لا کر دے سکتے ہو؟ میں تمہارے آنے جانے کا خرچ ادا کروں گا۔ کیا دس ہزار ڈالر کافی رہیں گے؟"

حبشی لڑکے کا حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"دس ہزار ڈالر!... کیا یہ کام غیر قانونی تو نہیں؟"

"نہیں..." "اور اس میں کوئی غیر اخلاقی پہلو بھی نہیں۔"

"مَیں تیار ہوں لیکن وہ ایکس ریز فوٹو ہیں کس کے؟"

"جوشوا ایپلٹن کے مُنہ اور جبڑے کے۔" سکوفیلڈ نے کہا۔ دوپہر کے وقت سکوفیلڈ بولسٹن سٹریٹ کی ایک لائبریری میں پہنچا۔ اُس کا حبشی دوست دو بجے واشنگٹن پرواز کر رہا تھا اور شام آٹھ بجے واشنگٹن سے واپس آ رہا تھا اور سکوفیلڈ کو اُسے ایئرپورٹ پر ملنا تھا۔ واشنگٹن میں اُس نے دو ٹیلی فون کیے تھے جن کے نتیجے میں سینیٹر جوشوا ایپلٹن کے ڈینٹسٹ سے اُس کے مُنہ اور جبڑے کے ایکس ریز فوٹو حاصل کر لیے تھے — یہ کارنامہ سکوفیلڈ کے ایک پُرانے شناسا نے سرانجام دیا تھا۔ حبشی لڑکے کو اس کا پتہ سکوفیلڈ نے زبانی یاد کرا دیا تھا۔

لائبریری کے جرنلزم ڈویژن سے سکوفیلڈ نے مارچ اور اپریل ۱۹۵۴ء کے پُرانے اخبارات کی فلمیں حاصل کیں۔ ان کے مطالعے سے اُسے نوجوان ڈاکٹر اور

نرسوں کی اموات کی خبریں مل گئیں لیکن ان میں جوشوا اسپلٹن کا ذکر نہیں تھا؛ البتہ ایک خبر میں اُس نوجوان کی المناک موت کا ذکر تھا جو پہاڑ پر چڑھتے ہُوئے گر پڑا تھا اور جسے سوئٹزرلینڈ کے ایک گاؤں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ یہ جوشوا اسپلٹن کا وہ دوست تھا جس نے کوریا کی جنگ سے بچنے کے لیے سوئٹزرلینڈ میں پناہ لی تھی۔ سکوفیلڈ سوچ رہا تھا کہ واقعی صندوق میں اسی نوجوان کی لاش ڈالی گئی تھی یا خالی صندوق دفن کر دیا گیا تھا۔ اُس شام اُس نے اسپلٹن ہال کا جائزہ لیا۔ یہ ایک قلعہ نما محل تھا جو ایک وسیع اور عریض پہاڑی کے اُوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ اُس نے کار میں بیٹھ کر پہاڑی کا چکر لگایا۔ محل کے گرداگرد فولادی دیوار کی اُونچائی کسی مقام پر بھی دس فٹ سے کم نہ تھی۔ ہر گیٹ پر بنکر بنا ہوا تھا جہاں یونیفارم میں ملبوس محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ یہ میٹاریز سرکل کا صدر مقام تھا اور شیفرڈ بولائے کی جائے رہائش!

رات ایرپورٹ پر حبشی لڑکے نے سکوفیلڈ کو ایکسریز فوٹوؤں کا لفافہ دیا اور اپنا معاوضہ وصول کیا۔ اس کے فوراً بعد سکوفیلڈ اُس ڈینٹسٹ کے ہاں گیا جہاں طالب علمی کے زمانے میں جوشوا اسپلٹن اور اُس کا دوست اپنے دانتوں کا معائنہ کروایا کرتے تھے۔ اُس زمانے کا ڈاکٹر تو زندہ نہیں تھا؛ البتہ اُس کا بھتیجا وہی کلینک چلاتا تھا۔ سکوفیلڈ نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سنیٹر جوشوا اسپلٹن کی طرف سے آیا ہے اور سینیٹر نے اپنے اور اپنے دوست کے مُنہ اور جبڑوں کے ایکسریز منگوائے ہیں۔ ڈینٹسٹ نے تیس سال پہلے کے ایکسریز فوٹو تلاش کیے اور جھاڑ پھونک کر اُس کے حوالے کر دیے۔ سکوفیلڈ نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے کہا:

"ایک زحمت اور دینا چاہتا ہوں۔ میرے پاس سنیٹر اور اُس کے دوست کے نئے ایکسریز فوٹو بھی ہیں۔ کیا آپ ان کا پرانے فوٹوؤں سے مقابلہ کر کے انہیں الگ الگ کر سکتے ہیں؟"

"یہ کون سا مشکل کام ہے اور اس میں دیر بھی زیادہ نہیں لگے گی۔" اُس نے سکوفیلڈ سے نئے فوٹو لیتے ہُوئے کہا۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو اُس نے جنرل ہسپتال سے چُرایا تھا اور دوسرا اُس نے واشنگٹن کے ڈینٹسٹ سے حاصل کیا تھا۔ ڈینٹسٹ نے بلب کی روشنی میں انہیں ایک نظر دیکھا اور دونوں سیٹ الگ الگ کر دیے۔ سکوفیلڈ نے انہیں الگ الگ لفافوں میں ڈال لیا۔ کلینک سے باہر آ کر وہ کار میں بیٹھا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے لفافہ کھولا اور نئے فوٹوؤں سے ٹیپ اُتاری۔ اُس کا شبہہ درست نکلا تھا۔ ثبوت اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شخص جو سینٹ میں بیٹھتا تھا اور جس کے آئندہ صدر منتخب ہونے میں کوئی شبہہ نہیں تھا، جوشوا اسپلٹن چہارم نہیں تھا ——— وہ تو شیفرڈ بولائے کا بیٹا جولین گائیڈرون تھا۔

(جاری ہے)

عربوں کا پہلا مواصلاتی سیّارہ

۸ رفروری ۸۵ء کو دُنیائے عرب کا مشترکہ مواصلاتی سیّارہ فضا میں پہنچا دیا گیا۔ اس روز تین بجے علی الصبح فرانسیسی راکٹ جوانا کے ذریعے ایرین ۳ مصنوعی سیّارہ 'عربسات' کے نام سے فضا میں اُٹھا اور ۲۰ منٹ کی مسافت کے بعد مطلوبہ مدار میں داخل ہو گیا۔ 'عربسات' ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹیلی ویژن نشریات، انٹل پوسٹ، موسمی اطلاعات اور اخبارات کی اشاعت میں بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔ دو ارب ڈالر کے اس منصوبے میں سعودی عرب کا حصّہ ۶ء۲۶ فیصد ہے۔ اس میں دُوسرا بڑا حصّہ لیبیا کا ہے۔

شاہ بلیغ الدین

شیخ الاسلام
بہاؤالدّین زکریا مُلتانیؒ

صبح کی نماز ختم ہوئی تو لوگوں سے مل ملا کر قاضی قطب الدین کاشانی نے شیخ بہاءُالدین زکریا ملتانی کا ہاتھ تھاما اور آگے کو قدم بڑھایا۔ باتیں کرتے کرتے فرمایا: "یہ آپ کہاں صُبح ہی صُبح اتنی دور میری مسجد میں آجاتے ہیں؟ آپ کو تو بڑی زحمت ہوتی ہو گی؟ پاس پڑوس میں بہت سی مسجدیں ہیں۔ ان میں سے کسی میں فجر کی نماز پڑھ لیا کریں۔"

قاضی قطب الدین ساتویں صدی ہجری کے بہت بڑے علما میں سے ہیں۔ ساری عمر ملتان میں پڑھاتے رہے۔ دُور دُور تک اُن کی شہرت پہنچی ہُوئی تھی۔ استادوں کے بھی استاد سمجھے جاتے تھے۔ انتقال ملتان ہی میں ہُوا۔ بڑے بڑے لوگوں نے اُن سے استفادہ کیا۔ شیخ بہاالدین ابومحمّد زکریا ملتانی ان سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ قباچہ بیگ حاکمِ ملتان قاضی صاحب کا بڑا گرویدہ تھا۔ اُس نے ان کے لیے خاص طور پر ایک مدرسہ بنایا اور اُن کے سپرد کر دیا۔ اس کی وجہ سے قاضی صاحب ملتان چھوڑ نہ سکے۔

شیخ بہاءُالدّین خود بھی ملتان کے آس پاس پیدا ہُوئے۔ بُخارا اور حجاز میں تعلیم پائی۔ کوئی پانچ سال مدینہ منوّرہ میں رہے۔ واپسی پر بیت المقدس اور بغداد ہوتے ہُوئے ملتان آئے۔ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ علم و عمل کی تربیت اور طویل سفر سے جب آپ واپس وطن آئے تو ملتان کے بعض لوگ جو جُبّہ و دستار کی نمائش میں لگے ہُوئے تھے، بڑے پریشان ہُوئے اور حسد کے مارے جل اُٹھے۔ ہم عمر، ہم مرتبہ اور ہم پیشہ لوگوں میں سے بعض دُنیا پرست اکثر دوسروں کی پگڑی اچھال کر اپنی دُکان جمانا چاہتے ہیں۔ یہ گھٹیا حرکتیں اللہ والوں کو زیب نہیں دیتیں۔ دنیا دار بھی یہ حرکتیں کریں تو بُری بات ہے۔ حضرت بہاءُالدین زکریا کو اُن حاسدوں نے دودھ سے لبالب ایک پیالہ بھیجا۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پیالہ ملتے ہی آپ نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ حاسدوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ حضرت! یہاں سے کہیں اور چلے جایئے۔ اس شہر میں علما اور فضلا بڑی کثرت سے ہیں۔

شیخ الاسلام شیخ بہاءُالدّین ابومحمّد زکریا تو بہت بڑے آدمی تھے۔ اُنہوں نے بحث مباحثے میں پڑنے کے بجائے دودھ کے لبریز پیالے پر ایک پھول رکھ کر واپس کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ تمہارے درمیان ہم اس طرح رہیں گے جس طرح دودھ پر یہ پھول ہے۔ شیخ بہاالدّین زکریا ملتانی سو برس تک زندہ رہے۔ ملتان ہی میں وفات پائی۔ یہ بات بطورِ خاص فرمایا کرتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے رہو اس سے دین سلامت رہتا ہے۔ قاضی قطب الدّین سے انہیں بے حد محبّت تھی۔ ہر روز اُن کے مدرسے جاتے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طویل عرصے تک فجر کی نماز روزانہ قاضی کاشانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے پیچھے پڑھتے رہے۔ ایک دن قاضی صاحب نے کہا کہ اتنی دُور آنا آپ کے لیے زحمت کا موجب ہوتا ہوگا تو جواب دیا کہ مَیں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث پر کاربند ہوں۔ مجھے میرے معمول سے نہ روکیے۔ قاضی صاحب خاموش ہو رہے۔ وہ ارشادِ نبویؐ جس کی طرف شیخ بہاءُالدین نے اشارہ کیا یہ ہے: جس کسی نے ایک عالم کے پیچھے نماز پڑھی اُس نے گویا نبیِ مُرسل کے پیچھے نماز پڑھی!

ٹنڈر نوٹس

محکمہ انہار کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے مندرجہ ذیل کاموں کیلئے شیڈول ریٹ ۱۹۷۹ء پر ٹنڈر مطلوب ہیں۔ ٹنڈر مورخہ ۱۶ر جون ۱۹۸۵ء کو دن کے ۱۲ بجے زیر دستخطی کے دفتر میں وصول کیے اور اُسی وقت حاضر آمدہ ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ ہر ٹنڈر فارم کے ساتھ کام کی کُل لاگت کا ۲ فیصد (آگے دی ہُوئی رقم) بصورت ڈیپازٹ ایٹ کال لبطور زرِ ضمانت منسلک ہونا ضروری ہے۔ جس کے بغیر ٹنڈر زیرِ مقابلہ نہیں کیے جائیں گے۔

مشروط یا بذریعہ تار ٹنڈر شاملِ مقابلہ نہیں کیے جائیں گے۔ کام کی تفصیل۔ تخمینہ جات و ڈیزائن زیر دستخطی کے دفتر میں کسی دن اوقاتِ کار میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ زیر دستخطی کو تمام یا کوئی بھی ٹنڈر بغیر وجہ بتائے مسترد کرنے کا اختیار ہوگا۔ کوئی ٹنڈر فارم مورخہ ۱۶ر جون ۱۹۸۵ء کو فروخت نہیں ہوگا۔

نمبر شمار	کاموں کی تفصیل	تخمینہ لاگت	زرِ ضمانت	میعادِ تکمیل
۱	مرمتی سٹون اپیرن بالمقابل در نمبر ۲، ۲۳ تا ۲۵، ۲۸ تا ۳۱، ۴۳ تا ۴۵ اور ۴۷ رسول بیراج نیچے کی طرف۔	-/۷۴۷۲۹	-/۱۵۰۰	دو ماہ
۲	مرمتی اسٹون اپیرن بالمقابل در نمبر ۲ تا ۶ ۱۳ تا ۱۸، ۳۶، ۴۲ اور ۴۶۔ رسول بیراج اوپر کی طرف۔	-/۱۰۶۵۰۵۴	-/۳۳۰۰	دو ماہ

مہتمم انہار

رسول ڈویژن، ایل جے سی

آئی پی ایل: ۳۲۸۰

رُوسی افواج میں مُسلمانوں کی بڑھتی ہُوئی طاقت

مستند اعداد و شمار اور سوویت یونین کی سرکاری دستاویزات سے اخذ شدہ پروفیسر ولیم فائرمین کے حیرت انگیز انکشافات

سوویت رُوس کے مسلمانوں کا ایک خاص ثقافتی، تہذیبی اور لسانی ورثہ ہے اپنے مخصوص رسم و رواج کی بدولت اُن کی ایک اپنی منفرد پہچان اور حیثیت ہے۔ سوویت رُوس میں مسلمانوں کی اکثر آبادی ازبک، قازق، تاجک، ترکمان اور کرغیز قومیتوں کے علاوہ آذربائیجانیوں اور تاتاریوں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت وسطی ایشیا اور دریائے والگا کے آس پاس آباد ہے اور تُرکی زبانیں بولتی ہے۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب سے لے کر اب تک رُوسی کمونسٹ پارٹی کو زار شاہی کے زمانے کے نسلی قومیتوں کے پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کمونسٹ پارٹی نے ابتدائی دَور ہی میں یہ پالیسی اختیار کی کہ مختلف قومیتوں کی ترقی اور استحکام کا خیال رکھتے ہوئے اُن کے مابین جو اقتصادی، سماجی، تہذیبی اور لسانی اختلافات اور تضادات پائے

جاتے ہیں، اُنہیں دُور اور ختم کیا جائے؛ تاہم تاریخ کے آئینے میں ہم دیکھتے ہیں کہ رُوسی کمونسٹ پارٹی اپنے مقاصد کے حصول میں اطمینان بخش کامیابی حاصل نہ کر سکی، کیونکہ اس کے حکمرانوں کا عملی رویّہ یہ رہا کہ سفید رُوسی نسل کی برتری قائم رکھی جائے۔

انقلابِ رُوس کے بعد ابتدائی برسوں اور پھر دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب کمونسٹ پارٹی کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تو اُس کے حکمرانوں نے غیر رُوسی قومیّتوں کی وفاداری اور اطاعت حاصل کرنے کی پُوری کوشش کی اور اُن کی بہتری کے لیے ایک لائحۂ عمل بھی بنایا۔ اس کا واحد مقصد اپنے لڑکھڑاتے ہُوئے اقتدار کو سہارا دینا تھا۔

زار کے زمانے سے یہ قانون چلا آ رہا تھا کہ تمام غیر رُوسی قومیّتوں اور نسلوں کو فوج میں نمائندگی نہ دی جاتی تھی۔ انقلاب کے بعد بالشویک رہنماؤں نے اگر اس پالیسی سے انحراف کیا تو یہ ان کی مجبوری تھی، کیونکہ سُرخ فوج کی افرادی قوت میں اضافے کی شدید ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ یُوں غیر رُوسی قومیّتوں سے وابستہ افراد کی ایک قلیل تعداد سُرخ فوج میں بھرتی ہوتی چلی گئی، تاہم رُوسی خانہ جنگی کے زمانے میں سُرخ فوج میں رُوسی سپاہیوں اور افسروں کی شرح ستّر سے اسّی فیصد تھی۔

خانہ جنگی کے زمانے ہی میں رُوسی حکمرانوں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ غیر رُوسی قومیّتوں پر انحصار اور اعتبار نہیں کر سکتے۔ رُوسی نسل کی برتری اپنے عروج پر تھی اور غیر رُوسی قومیّتوں کے سپاہی شک و شُبہے کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے۔ اسی لیے ۱۹۲۰ء میں جب علاقائی حدود کی بُنیادوں پر فوج کی تشکیلِ نو کی گئی تو غیر رُوسی قومیّتوں کے سپاہی مرکزی فوجی کمان کے تحت کر دیے گئے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اواخر اور تیسری دہائی کے اوائل میں کمونسٹ پارٹی نے قومی اور اجتماعی اختلافات ختم کرنے کے لیے نئی پالیسی اپنائی جسے کورینیزاسلیا کا نام دیا گیا۔ اس کے لُغوی معنی 'جڑوں' کے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت غیر رُوسی قومیّتوں کے افراد حکومت کے [illegible] عہدوں پر فائز کیے گئے۔ کمونسٹ پارٹی اور اقتصادی [illegible] سے متعلق سرکاری شُعبے میں اُنہیں کھپانے کی کوشش بھی ہُوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر رُوسی زبانوں کو وسعت [illegible] کے اقدامات بھی ہُوئے۔

کوریینزاسلیا کا منصوبہ نازک اور پیچیدہ مسائل [illegible] دوچار ہُوا، کیونکہ تجربے کار اور سیاسی طور پر قابلِ اعتبار غیر رُوسی افراد کی شدید کمی تھی اور جو نئے کیڈر تیار ہو[illegible] وہ ایسے طبقوں اور قومیّتوں پر مشتمل تھے جن پر کمونسٹ [illegible] اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس منصوبے کو سب [illegible] زیادہ نقصان رُوسیوں سے پہنچا جو اپنی نسلی برتری کی [illegible] سے ان چھوٹی اور حقیر قومیّتوں کی ترقّی کسی طور بھی پسند [illegible] تھے۔ یُوں کمونسٹ پارٹی کی یہ نئی پالیسی غیر مؤثر ثابت [illegible] اور اسے خود کمونسٹ پارٹی نے جلد ہی ترک کر دیا۔

غیر رُوسی قومیّتوں کی ترقّی اور نشوونما کے لیے جو [illegible] کمونسٹ پارٹی نے اختیار کی، اُس کے تحت فوج میں غیر رُوسی قومیّتوں کو شامل کرنے کی ایک حد تک کوشش [illegible] اور مختلف پسماندہ قومیّتوں کے افراد کی عسکری تربیت [illegible] اہتمام ہُوا۔ ان میں بیشتر افراد یا تو سرے ہی [illegible] تھے یا رُوسی زبان سے قطعی طور پر نابلد تھے۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں ابتدائی تعلیم کے اسکول اور فوجی تربیتی مراکز [illegible] ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں غیر رُوسی اقلیتوں کے [illegible] مردوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔ ان اداروں میں [illegible] کے لیے خاص کوٹہ مخصوص کیا گیا۔

وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے غیر رُوسی کیڈٹوں کی [illegible] فیصد تعداد اَن پڑھ تھی۔ وہ رُوسی زبان سے تقریباً [illegible] مشکل یہ تھی کہ غیر رُوسی زبانوں میں عسکری تربیت کے [illegible] میں لٹریچر سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ غیر رُوسی قومیّتوں کی زبانوں میں ایسے الفاظ ابھی رائج نہ ہُوئے تھے جو [illegible]

اور سیاسی اصطلاحوں کا پورا مفہوم ادا کر سکیں۔

یُوں کمونسٹ پارٹی نے غیر رُوسی قومیّتوں کی ترقّی کے لیے جو منصوبہ تیار کیا تھا تیسری دہائی کے اوائل میں اسے ترک کر کے اس پر عملدرآمد بند کر دیا۔ اس کے بعد ایک نئی پالیسی کا آغاز ہُوا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر چیز کو رُوسی انداز دیا جائے۔ اسی زمانے میں رُوسی کمونسٹ پارٹی نے غیر رُوسی آبادی کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہ وہ رُوسی زبان، کلچر اور سماجی رسوم اپنا لیں، یعنی وہ اپنی ثقافتی، تہذیبی اور لسانی شناخت کو فراموش کر کے رُوسی بن جائیں۔ اس منصوبے اور پالیسی کا خوب پروپیگنڈہ کیا گیا مگر نئی پالیسی کے تحت غیر روسی قومیّتوں کے افراد کو ریاست اور کمونسٹ پارٹی میں اہم اور ذمے دارانہ فرائض سونپنے سے احتراز ہوتا رہا۔

رُوسی افواج میں اگر اب غیر رُوسی قومیّتوں نے کسی حد تک نمایاں نمائندگی حاصل کی ہے تو اس کی بعض ٹھوس وجوہات ہیں جن کا تعلق ماضی کے حالات و واقعات سے بھی بہت گہرا ہے۔ انقلاب کے بعد افرادی قوّت میں کمی کے باعث اگر غیر رُوسی قومیّتوں کو سُرخ فوج میں شامل کیا گیا تو اسے روسی نسل پرستوں کی حمایت اور تائید حاصل نہ تھی۔ اس دَور کے رُوسی مصنّفوں نے غیر رُوسی قومیّتوں کی سُرخ فوج میں شمولیت کو فوج کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہُوئے یہ اپیل پیش کی تھی کہ اس طرح سُرخ فوج کا معیارِ کارکردگی پست ہو جائے گا۔

جب دوسری جنگِ عظیم سے پہلے جنگ کے خطرات محسوس کیے جانے لگے اور غیر رُوسی قومیّتوں کی عسکری نفری میں اضافہ ناگزیر تصوّر ہونے لگا تب بھی رُوسی نسل پرست یہ کہہ رہے تھے کہ غیر رُوسی قومیّتوں کے سپاہیوں پر انحصار اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اُن کی حُب الوطنی اور وفاداری مشکوک ہے۔ ماسکو میں حکمرانی کرنے والوں کا یہ بھی خیال تھا کہ علاقائی بُنیادوں پر غیر رُوسی قومیّتوں پر مشتمل فوج ناقابلِ اعتماد ہے اور اگر جرمنی یا جاپان نے حملہ کر دیا تو غیر ملکی قومیّتوں پر مشتمل فوج کی افادیت، اُن کی مشتبہ وفاداری کی وجہ سے خطرہ بھی بن سکتی ہے۔ اس کا توڑ رُوسی حکمرانوں نے اس طرح نکالا کہ علاقائی بُنیادوں پر فوج کی تشکیلِ نَو کا منصوبہ ختم کر دیا۔ یُوں غیر رُوسی قومیّتوں کے باصلاحیت افراد قومی رُوسی فوج میں اپنے استحقاق کے باوجود اعلیٰ عہدوں سے محروم رہے۔

۱۹۳۶ء میں سوویت یونین نے جو منشور اپنایا، اُس میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ یُونین ریاستوں کو اپنے فوجی یُونٹ بنانے کا آئینی اختیار حاصل نہیں ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں رُوسی افواج کی حالت کچھ پتلی ہونے لگی تو مجبوری کے تحت حکمرانوں کو رُوسی یُونٹوں میں بھی غیر رُوسی قومیّتوں کے سپاہی کھپانے پڑے۔ غیر رُوسی زبانوں کو بھی اس زمانے میں اہمیّت دی جانے لگی کیونکہ غیر رُوسی قومیّتوں کے سپاہی رُوسی زبان سے نابلد تھے۔

اس حقیقت سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا کہ غیر رُوسی قومیّتوں پر مشتمل سپاہیوں نے دوسری جنگِ عظیم میں اپنی فقیدالمثال بہادری سے رُوسی فوج کے حوصلے بلند کیے۔ برتر نسل کے رُوسی سپاہیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر عسکری کارنامے انجام دیے۔ ایک عام اندازے کے مطابق رُوسی فوج میں سات لاکھ ایسے سپاہی تھے جن کا تعلق رُوسی نسل کے بجائے غیر رُوسی قومیّتوں سے تھا۔ انہوں نے جرمنی کے خلاف شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

اس زمانے میں رُوسی حکمرانوں کے تقاضے کچھ مختلف تھے، اس لیے ضرورت کے تحت ہر چیز کو 'رُوسیانے' کی پالیسی التوا میں ڈال دی گئی۔ یہ تبدیلی عارضی تھی۔ جُونہی دوسری جنگِ عظیم ختم ہُوئی اور رُوسی رہنماؤں کی ضرورت پُوری ہو گئی تو پھر وہی پالیسی اختیار کی گئی کہ غیر رُوسی قومیّتیں اپنے آپ کو پُورے کا پُورا رُوسی سانچے میں ڈھال کر ہی ترقّی حاصل کر سکتی ہیں۔ غیر رُوسی قومیّتوں کے فوجیوں پر غدّاری اور عدم وفاداری کے الزامات بھی لگائے گئے۔ وہ فوجی یُونٹ جو غیر رُوسی قومیّتوں پر مشتمل تھے توڑ دیے گئے۔ غیر رُوسی

زبانوں کو دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جو تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہوئی تھی، اُسے ختم کرکے پھر سے رُوسی زبان کو فوج کی واحد سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

سٹالین کا دَور ختم ہونے کے بعد نئی رُوسی قیادت نے عنانِ حکومت سنبھالی تو واضح انداز میں یہ تسلیم کیا گیا کہ غیر رُوسی قومیتوں اور نسلوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کرنے سے ناقابلِ تلافی اقتصادی اور سماجی نقصان ہُوا ہے۔ خروشچیف کے زمانے میں ایک طویل المعیاد پالیسی اختیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس امر کا بھی تعین کیا گیا کہ کمونسٹ پارٹی اس ضمن میں کیا اور کتنا کردار ادا کرے گی۔ غیر رُوسی قومیتوں کو رُوسی بنانے کی پالیسی کو سٹالین کی ایک بھیانک غلطی قرار دیتے ہُوئے اُسے بظاہر ترک کر دینے کا اعلان ہُوا۔

۱۹۷۰ء کی مردم شماری میں اس [illegible] کا انکشاف ہُوا کہ غیر رُوسی قومیتیں کم سے کم رُوسی اندا[illegible] ہیں اور برتر رُوسی نسل کی شرحِ آبادی میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ۱۹۵۹ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے تحت رُوسی کُل آبادی کا ۵۹.۰۶ فیصد تھے۔ ۱۹۷۰ء میں اُن کی آبادی کم ہو کر ۵۲.۰۴ فیصد رہ گئی تھی۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ حقائق بھی سامنے آئے کہ سوویت یونین کی جنوبی ریاستوں بالخصوص مسلم علاقوں کی شرحِ پیدائش میں اضافہ ہُوا۔ اور رُوس اور سلاف نسلوں کی شرحِ پیدائش میں معتدبہ کمی واقع ہوئی ہے۔ حالات و واقعات نے یہ حقیقت بھی منکشف کر دی کہ مستقبل میں بھی غیر رُوسی قومیتوں کی شرحِ آبادی میں اضافہ اور رُوسی آبادی کی شرحِ پیدائش میں نمایاں کمی ہوتی رہے گی۔

ایک اور اہم حقیقت جو رُوسی حکمرانوں پر واضح ہُوئی۔ پہلے رُجحان یہ تھا کہ تمام غیر رُوسی قومیتیں ایک خاص انداز کے مراحل سے گزرتے ہوئے ایک وحدت میں مدغم ہوتی رہی ہیں لیکن ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے نتائج سے معلوم ہُوا کہ ادغام کا اجتماعی رجحان سرے سے مفقود ہو چکا ہے۔ وہ مصنّف جو پہلے اپنی تحریروں میں وسیع تر قومی ادغام اور وحدت کا پرچار کرتے تھے، اب وہ اصطلاحیں بالکل فراموش کر چکے تھے۔

دسمبر ۱۹۸۲ء میں ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر سوویت یونین کی کمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری یوری آندروپوف نے تقریر کرتے ہُوئے اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا:

"طبقاتی تضادات اور اختلافات کے مقابلے میں قومیتوں کے اختلاف و تضادات زیادہ عرصے تک قائم رہیں گے۔" اس تقریر میں ان تضادات اور اختلافات کے حوالے سے رسل و رسائل اور قومی نمائندگی کے شعبوں کا بطورِ خاص ذکر ہُوا۔ اپنی اس تقریر میں آندروپوف نے قومی یک جہتی اور اجماع کی ضرورت پر ایک نئے انداز سے زور دیا۔ اس سے پہلے ۱۹۷۷ء کے نئے رُوسی آئین میں بھی یہی نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا کہ رُوسی قومیتیں، اجتماعی ادغام کی منزل تک نہیں پہنچ پائیں۔ جب اس آئین کا خاکہ بن رہا تھا تو بحث کے دوران میں بعض اہم افراد نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اب وقت آ چکا ہے کہ سوویت یونین کی نیم آزاد ریاستوں کو سوویت یونین میں مدغم کر دیا جائے۔ یہ تجویز مسترد کر دی گئی تھی۔

ماضی میں سوویت یونین کے حکمران جو پالیسیاں اپناتے رہے، اُن کی روشنی میں خاصے یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر رُوسی قومیتیں اور نسلیں مستقبل بعید تک اپنی علحدہ شناخت اور وجود برقرار رکھیں گی۔ اس کی مثال یُوں بھی دی جا سکتی ہے کہ رُوسی مصنّفوں کا یہ نظریہ ہے کہ اگرچہ تمام قومی کلچر باہمی طور پر ایک دوسرے کو خوبصورت اور معنی خیز بناتے ہیں، اس کے باوجود وہ اپنی علحدہ اور آزادانہ قومی حیثیت میں بھی نشو و نما پاتے رہیں گے۔

۱۹۷۰ء میں قومیتوں سے متعلق جو پالیسی وضع ہُوئی، اس کے اثرات فوجی شعبے میں بھی نمودار ہوئے۔ یہ بات خاصی دلچسپ اور حیران کُن ہے کہ غیر رُوسی قومیتوں کی شرحِ پیدائش میں جس تیزی سے اضافہ ہُوا، اس سے کہیں زیادہ اضافہ رُوسی فوج میں غیر رُوسی نسلوں اور قومیتوں کے افراد کا ہُوا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں بھرتی ہونے کی عمر تک پہنچنے والے بالغ افراد کا ایک تہائی حصہ غیر رُوسی افراد پر مشتمل تھا۔ حکمرانوں نے یقیناً یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس صدی کے آخر تک یہ شرح یقینی حد تک چالیس فیصد تک پہنچ جائے گی اور اس کا تین چوتھائی حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہو گا۔

پچھلی دہائیوں میں لازمی بھرتی کی ذیل میں آنے والے مسلمانوں کو کنسٹرکشن بٹالینوں میں کھپایا گیا۔ اس کے علاوہ داخلی امور سے متعلقہ یونٹوں (ایم وی ڈی) میں بھی بھرتی کیا گیا۔ ان اُمور کا تجزیہ کرنے والے بعض مغربی ماہرین کا اندازہ ہے کہ ایم وی ڈی کا نصف اور تعمیراتی بٹالینوں کی اسّی فیصد نفری غیر رُوسی قومیتوں کے افراد پر مشتمل ہے۔ اس صُورتِ حال میں یہ اہم اور چونکا دینے والی حقیقت بھی سامنے آئی کہ مجموعی طور پر رُوسی آبادی میں مسلمان نوجوانوں کی تعداد میں اس حد تک اضافہ ہُوا ہے کہ مسلمان کنسٹرکشن یُونٹوں اور ایم وی ڈی کے علاوہ فوج کے دوسرے شعبوں اور یُونٹوں میں بھی اہم فرائض انجام دے رہے ہیں۔

حالیہ چند برسوں میں سوویت کمونسٹ پارٹی نے اپنے طور پر خود کو یہ یقین دلا لیا ہے کہ مختلف نسلوں کے اختلاف و تضادات رُوسی فوج کی کارکردگی کو متاثر نہیں کر سکتے اور فوج میں مختلف نسلوں کے افراد کی موجودگی قومی یک جہتی اور استحکام کے لیے کارگر اور مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے کمونسٹ پارٹی نے ایک نئی سٹریٹیجی اختیار کی ہے جس کے مطابق رُوسی فوج میں مختلف نسلوں اور قومیتوں کا اجتماع ایک دوسرے کو سمجھنے میں مددگار ہے اور بطورِ خاص مسلمانوں کو رُوسی اور دوسری قومیتوں کا اجتماع قریب لانے میں ممد و معاون ثابت ہُوا ہے؛ چنانچہ اُن سے یہ تقاضا بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے نسلی امتیازات ختم کر ڈالیں۔ اس کے علاوہ فوج میں غیر رُوسی زبانوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس پالیسی کے تحت ایک خاص کیڈر کی تشکیل و ترقی کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے جو بطورِ خاص مسلمان افسروں پر مشتمل ہو گا۔

رُوسی حکومت کی پالیسی میں جو اہم تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں اُن کے بعض پہلو بہت اہم ہیں۔ رُوسی اور سلاف افسروں کو بطورِ خاص یہ ہدایت جاری کی گئی ہے کہ اجتماعی قومی اُمور پر زیادہ توجہ اور قومی سطح کے روابط کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ہینڈ بک آف دی آرمی اینڈ نیوی پروپیگنڈسٹ اینڈ ایجی ٹیٹر کے تازہ ایڈیشنوں کا ذکر اس سلسلے میں ضروری ہے۔ ۱۹۸۳ء کے ایڈیشن میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ اشتراکیت کو قومی اُمور کی روشنی میں دیکھا جائے اور ذاتی اور انفرادی سوچ ترک کر کے قومی سوچ کو 'عوام کی دوستی' کے نظریّے کے مطابق فروغ دیا جائے۔ اس نئے ایڈیشن میں یہ بات بھی درج ہے کہ کمونسٹ پارٹی کی یہ پالیسی ہے کہ تمام رُوسی عوام کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اس میں ملک کی منفرد قومیتیں بھی شامل ہیں۔

رُوسی حکمرانوں نے یہ ہدایت نامہ بھی جاری کیا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کی فتح میں غیر رُوسی قومیتوں نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اُسے بھی نمایاں حیثیت دی جائے اور اُن کی خدمات تسلیم کی جائیں۔ یہ پالیسی بہت معنی خیز ہے، کیونکہ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں کی شکست اور رُوس کی فتح کا جام تجویز کرتے ہوئے سٹالین نے کہا تھا: "یہ فتح رُوسی عوام کی مرہونِ منّت ہے اور یہ رُوسی نسل کا عظیم کارنامہ ہے۔" سٹالین نے اس عظیم فتح کے اعزاز میں غیر رُوسی قومیتوں کی بہادری اور کارناموں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ نئی پالیسی کے تحت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ غیر رُوسی قومیتوں نے بھی دوسری جنگِ عظیم میں رُوس کو فتح سے ہمکنار کرنے

نوٹس

ہرخاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل عمارات تفصیل ذیل کا نیلام عام مورخہ ۸۵-۶-۱۵ بوقت ۰۰-۱۲ بجے دوپہر بمقام دفتر مہتمم صاحب سرگودھا ڈویژن محکمہ انہار کیا جائے گا۔

۱ ملبہ بین ریسٹ ہاؤس جہان آباد تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا۔
۲ ملبہ گگ ہاؤس جہان آباد۔
۳ ملبہ آؤٹ ہاؤسز جہان آباد۔
۴

خواہش مند حضرات عام نیلامی میں مذکورہ بالا مقام پر حاضر ہو کر حصہ لے سکتے ہیں۔

شرائط ذیل لازم تصور ہوں گی۔

۱ عمارت مذکورہ جہاں ہے اور جیسے ہے کی بنیاد پر ایک ہی لاٹ کی صورت میں نیلام کی جائے گی۔
۲ منظوری افیسر مجاز کی تابع ہوگی۔
۳ افسر مجاز بغیر کسی وجہ کے بولی مسترد کر سکتا ہے جو کہ کسی عدالت میں چیلنج نہ ہوگی۔
۴ کامیاب بولی دہندہ کو کل زر کا ایک چوتھائی موقع پر جمع کرانا ہوگا۔
۵ کامیاب بولی دہندہ کو بعد جمع کرانے کل رقم اندر ۳۰ یوم از منظوری نیلام شدہ ملبہ اٹھانا ہوگا۔
۶ مالِ نیلام کے علاوہ کسی املاکِ سرکاری کو نقصان نہ پہنچانا ہوگا۔ بصورت نقصان اس کی تلافی لازم ہوگی۔

مہتمم

سرگودھا ڈویژن لوئر جہلم انہار سرگودھا۔

آئی پی ایل: ۳۵۰۶

میں اہم اور نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ اس سرکاری کتاب کے تازہ ترین ایڈیشن میں ان سطور کا اضافہ کیا گیا ہے کہ زمانہ جنگی کے زمانے اور دوسری جنگِ عظیم میں رُوس کی عظیم فتح کو ممکن بنانے میں اُن غیر رُوسی کسانوں اور مزدوروں کا بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے رُوسی پرولتاریہ کو عملی امداد اور اعانت فراہم کی۔

ان تمام سرکاری کتابوں میں رُوسی فوج کی برتری اور فتوحات کو نمایاں ترین جگہ دی گئی ہے اور ان کا موضوع بھی برتر نسل کی رُوسی فوج کے کارنامے بیان کرنا ہے؛ تاہم پالیسی میں یہ نمایاں تبدیلی آئی ہے کہ اب غیر رُوسی قومیتوں کا ذکر بھی خاصے مناسب اور نمایاں الفاظ میں جگہ پانے لگا ہے۔ سوویت رُوس کے حکمرانوں نے یہ پالیسی بھی اپنائی ہے کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے اُن زبانوں میں مسلمانوں کے کارناموں کو بطورِ خاص بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے جو زبانیں مسلمان بولتے اور پڑھتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک کتاب کا حوالہ بطورِ خاص ضروری ہے۔ یہ کتاب ادبی انداز میں تحریر کی گئی ہے اور اس میں دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کے ایک اُزبک مسلم ہیرو جنرل راوشانوف کے شاندار کارنامے بیان ہوئے ہیں۔ کتاب کا عنوان بھی جنرل راوشانوف ہے۔ اس ناول میں جنرل راوشانوف کو رُوسی فوج کے پہلے اُزبک جرنیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف ابراہیم رحیم بار بار اپنے ہیرو کی دانشمندی، شجاعت اور بے مثل کردار کا ذکر کرتا ہے۔ جنرل راوشانوف اتنا عظیم جرنیل ہے کہ سٹالین جیسا خود پسند آمر فوجی اُمور میں صلاح مشورے کے لیے اسے ماسکو طلب کرتا ہے اور فوجی اور جنگی اُمور میں جنرل راوشانوف کے مشوروں پر عمل کرنے سے ۱۹۴۱ء-۱۹۴۲ء میں ماسکو پر ہونے والے حملے میں دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے جاتے ہیں۔ اس ناول میں مصنف ابراہیم رحیم نے سٹالین کو جنرل راوشانوف کی بے پناہ تعریف کرتے ہُوئے دکھایا ہے۔

ناول میں یہ اہم عنصر بھی شامل ہے کہ اگرچہ دوسری جنگِ عظیم میں رُوس کے دفاع میں اُزبک مسلمانوں نے بڑی جراَت مندی اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری مسلم قومیتوں اور مسلمان سپاہیوں نے بھی شاندار کارنامے انجام دیے۔

یہ ناول جو ایک مسلمان مصنف کی تصنیف ہے اور ایک مسلمان جرنیل کے بارے میں ہے، اس کا مطالعہ اس اعتبار سے بے حد اہم اور فکر انگیز ہے کہ جنرل راوشانوف کی دانشمندی، بہادری اور حربی صلاحیتیں سارے رُوسیوں کے مفاد میں تھیں لیکن جنرل راوشانوف ایک ایسا کردار ہے جو اپنے وطن ـــــ اُزبکستان کی اقدار اور تہذیب کو اپنی جان سے بھی عزیز سمجھتا ہے، کیونکہ یہی اُس کی اصلی شناخت ہے۔

اس ناول میں ایک کردار اور ایک منظر ایسا ہے جس سے مصنف نے جنرل راوشانوف کا تہذیبی کردار اُجاگر کیا ہے۔ وہ کردار خورو بردیخوجیف ہے جو اُزبکستانی مسلمان ہے۔ وہ غدّاری کے الزام میں جنرل راوشانوف کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ خورو بردیخوجیف جنگ میں جرمنوں کے ہتھے چڑھ گیا اور قید کر لیا گیا۔ قید کے زمانے میں وہ جرمن ریڈیو سے اپنے تُرکی زبانیں بولنے والے مسلمان بھائیوں کے نام اپیلیں براڈکاسٹ کرتا رہا کہ وہ سوویت یونین کی حمایت ترک کر دیں اور رُوسی فوجوں کا ساتھ چھوڑ کر جرمن فوجوں کے ساتھ مل جائیں۔ اس ناول کا قاری یہ پڑھتے ہُوئے محسوس کرنے لگتا ہے کہ جنرل راوشانوف اس غدّار ہم وطن کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر رہا جو عام طور پر ایسے غدّاروں سے روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ چند برس پہلے اسی خورو بردیخوجیف نے جنرل راوشانوف کی عدم موجودگی میں جنرل کی والدہ کی موت پر اُس کی تدفین اسلامی رواج کے مطابق کی تھی۔ اس وجہ سے جنرل راوشانوف اسے اپنا محسن سمجھتا تھا۔ جب یہ غدّار اُس کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر شدید کشمکش محسوس کرتا ہے

اور سوچتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ کیا سلوک کرے جس نے ایک طرف وطن سے غداری کی ہے اور دوسری طرف وہ اُس کا مُحسن بھی ہے۔ ناول نگار نے اپنے ہیرو کی اس ذہنی کشمکش اور اُلجھن کا جو حل نکالا ہے، وہ بڑا دلچسپ ہے۔ وہ مجرم اور غدار کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ اُس کی مِلّی، نسلی اور اسلامی روایات کے بھی مطابق ہے اور جس کا تقاضا اُس کا وطن بھی کرتا ہے۔ وہ اس مجرم کے احسان اُتارنے کے لیے اُسے پہلے غسل دلواتا ہے، لباس تبدیل کروانے کے بعد اُسے کھانا پیش کر کے اپنی اقدار اور تہذیبی ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتا ہے۔ اس حُسنِ سلوک کے بعد وطن سے غداری کے ناقابلِ معافی جُرم کی سزا دیتے ہُوئے اُسے گولی سے اُڑوا دیتا ہے۔

اس ناول میں مصنف نے جنرل راوشانوف کا جو کردار پیش کیا ہے، عام قاری اُس کے حوالے سے اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا کہ مصنف کے سامنے ایک اصل جیتا جاگتا انسان تھا۔ یعنی پہلا اُزبک جنرل رحیموف ـــــ اس ناول کے جنرل راوشانوف اور جنرل رحیموف کے کردار میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جنرل رحیموف کو بھی سرکاری سطح پر مناسب مقام اور اعزاز بخشا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں اُس کی زندگی پر ایک دستاویزی کتاب سرکاری فوجی اشاعت گھر ماسکو سے شائع ہُوئی۔ ۱۹۸۴ء میں اسے دوبارہ تاشقند میں شائع کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں جنرل رحیموف کے ایک بلند و بالا مجسّمے کی نقاب کشائی تاشقند میں ہُوئی۔

سوویت یونین کی دوسری مسلم ریاستوں میں بھی اُن کے نامور جنگی قائدین کی یادگاریں مجسّموں کی صُورت میں قائم کی گئیں۔ ۱۹۸۳ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آذربائیجانی ہیرو جنرل آذی آسلانوف کے مجسّمے کی نقاب کشائی ہوئی۔ اس موقع پر آذربائیجان کی کمونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری کے علاوہ ریاست کے اہم سرکاری اور فوجی عہدیداروں نے بھی شرکت کی۔ کمونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری نے جہاں آسلانوف کی حُبّ الوطنی، شجاعت اور کارناموں کا ذکر اپنی تقریر میں کیا؛ وہاں یہ بھی کہا کہ جنرل آسلانوف نے کبھی اپنا دیس آذربائیجان، اس کے لوگ اور اپنی روایات فراموش نہیں کیں۔

ایسے ناول جو سرکاری سطح پر چھپتے اور ایسے یادگاری مجسّمے جو سرکاری ہدایات کے مطابق نصب کیے جاتے ہیں، رُوسی حکومت کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دراصل اس طرح نوجوان مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور اُنھیں یہ باور کرانے کی کوشش ہوتی ہے کہ نسلی وفاداری اور حبّ الوطنی میں کوئی بُعد نہیں۔ رُوس کی کمونسٹ پارٹی اپنا یہ پیغام رُوس کے مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے مختلف انداز اور طریقے اختیار کرتی رہتی ہے۔ اُزبک نوجوانوں کے اشتراکی اخباروں میں اکثر اُزبک فوجیوں کے خطوط شائع ہوتے ہیں جو دُور اُفتادہ علاقوں میں رہتے ہیں یا غیر ملکوں میں۔ ان خطوط میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں اپنے قومی کلچر سے پُوری طرح لُطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ مقامی زبانوں کی کتابوں کے تحفوں، مقامی سازوں اور ملبوسات کے حوالے سے بھی اس پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رُوسی حکمرانوں کو شدّت سے اس امر کا احساس ہے کہ قومی سطح پر جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غیر رُوسی قومیتیں بدستور اپنی زبانوں پر انحصار کرتی ہیں جبکہ ملکی سطح پر اجتماعی رابطے کے لیے رُوسی زبان کو اوّلیت حاصل ہے۔ سوویت یونین کے حکمران اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ غیر رُوسی قومیتیں اور اقلیتیں رُوسی زبان پر عبور حاصل کر لیں۔ ۱۹۷۹ء میں تاشقند کے مقام پر ایک ملکی سطح کی کانفرنس منعقد ہُوئی جس کا مقصد تاشقند کی غیر رُوسی زبانوں والے مدرسوں میں رُوسی زبان کی تعلیم کا آغاز کرنا تھا۔ اب تک رُوسی حکمرانوں نے رُوسی زبان کو غیر رُوسی قومیتوں پر ٹھونسنے اور ٹھونسنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ جا بے جا رُوسی زبان کی

اہمیّت کا پرچار ہوتا رہتا ہے۔ رُوسی زبان کی تعلیم کے لیے سرکاری اور ذاتی وسائل پُوری طرح بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ غیر رُوسی اسکولوں میں رُوسی زبان رائج کی جا رہی ہے یہاں تک کہ نرسری اسکولوں اور کنڈرگارٹنوں میں بھی رُوسی زبان کے اسباق کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری کیا گیا ہے۔

غیر رُوسی طالب علموں کو رُوسی زبان کی تعلیم دینے کے لیے اسکولوں کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ اُزبکستان کے ہر ضلع میں ایک اسکول کھول دیا گیا ہے۔ رُوسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے والے اُن غیر رُوسی طالب علموں کے لیے تمام سہولتیں فراہم کی گئی ہیں جو پہلے اپنی نسلی اور مقامی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ رُوسی زبان کو پھیلانے کے لیے یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ غیر رُوسی زبانوں کے اسکولوں ہی میں رُوسی زبان کی کلاسیں شروع کر دی گئی ہیں۔ بہت سے غیر رُوسی زبان کے اسکولوں میں مہینے میں چند روز رُوسی زبان کی تعلیم کے لیے مخصوص کیے جا چکے ہیں، ان مقررہ ایّام میں تمام کارروائی رُوسی زبان میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ رُوسی زبان سیکھنے کے لیے موسمِ گرما میں تعلیمی کیمپ کھولے گئے ہیں۔ طالب علموں کو یہ تنبیہہ کی جاتی ہے کہ "غیر رُوسیوں کا رُوسی زبان کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا"۔

رُوسی جریدے 'یوش لینن چی' کے شمارہ ۲۴ مئی ۸۴ء میں ایک رُوسی اُستاد کا بیان شائع ہُوا جس میں اُس نے کہا رُوسی زبان کے بغیر جدید فوجی ہتھیاروں اور فوجی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرنا ممکن ہی نہیں۔ ماہرینِ تعلیم، کمونسٹ پارٹی کے عہدے دار اور فوجی افسر مسلسل یہ تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ فوج میں رُوسی زبان ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ رُوسی حکمرانوں نے یہ پالیسی بھی اختیار کی ہے کہ نوجوانوں کو لازمی فوجی بھرتی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی رُوسی زبان پر عبور حاصل ہو جانا چاہیے۔

فوج میں لیے جانے والے زیرِ تربیت جوانوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ فوجی ہُنرمندی کے اُمور، فوج کے ضوابط، تکنیکی اور فنی مہارت اور فوجی تاریخ پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ رُوسی زبان پر بھی پُوری دسترس رکھتے ہوں۔ بعض اسکولوں میں اسی مقصد کے تحت رُوسی زبان میں فوجی اصطلاحات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح چھ ماہ کے خصوصی نصاب تیّار کیے جاتے ہیں جن میں لازمی بھرتی کی عُمر تک پہنچنے سے پہلے جوانوں کو فوجی تربیت اور ٹیکنالوجی کے علاوہ رُوسی زبان میں فوجی اصطلاحات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کمونسٹ پارٹی کے ورکر انفرادی طور پر بھی اُن جوانوں پر توجّہ دیتے ہیں جن کی رُوسی زبان میں شُدبُد ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں یہ حقیقت بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ رُوس کے مسلمان رُوسی زبان کو اپنی نسلی اور قومی زبانوں کے لیے خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ مستند ذرائع سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ رُوسی زبان کسی پر تھوپی جا رہی نہ اُسے دوسری زبانوں کا نعم البدل بنایا جا رہا ہے۔ تمام ذرائعِ اظہار و ابلاغ سرکاری سطح پر مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی منظّم کوشش کر رہے ہیں کہ رُوسی زبان کی وجہ سے مسلمانوں کی زبانوں کی اہمیت کم کی جا رہی ہے نہ اُنھیں پیچھے دھکیلنا مقصود ہے۔ رُوس کے مسلمان تمام تر پروپیگنڈے اور مفادات کے باوجود رُوسی زبان سے مرعوب نہیں ہُوئے۔ وہ اس زبان کی سرکاری، سائنسی اور ہُنرمندانہ افادیت تسلیم کرنے کے باوجود اپنی قومی اور نسلی زبانیں ہی بولتے ہیں، اور انھی میں کتابیں لکھتے ہیں۔ رُوس کے مسلمان دانشور رُوسی زبان کو فقط ایک مددگار زبان کی حیثیت دیتے ہیں۔

رُوسی زبان کی اہمیت، اس کی افادیت اور فوج میں اس کی ضرورت کے حوالے سے مسلمانوں کی توجّہ رُوسی زبان کی طرف راغب کرنے کے لیے جتنا بھی پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے وہ سب اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو رپورٹیں سرکاری جریدوں 'میلوڈوزا آذربائیجان' (۱۲ جولائی ۸۳ء) 'کومولیٹ تاجکستان' (۹ اکتوبر ۸۳ء) وغیرہ میں شائع ہُوئی

ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اب بھی مسلم جوانوں کی ایک بڑی تعداد جب فوج میں آتی ہے تو رُوسی زبان میں بات چیت کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ ترکمانیہ کے چھ مسلم رنگروٹوں میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جو بُری بھلی رُوسی زبان بول سکتا ہے۔ باقی اس سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں ـــــ یہی صورتِ حال دوسری مسلم ریاستوں کی ہے۔

ان حالات کے تحت رُوسی حکمران فوج میں محدود سطح ہی پر سہی، غیر رُوسی زبانوں کو نمائندگی دینے لگے ہیں، کیونکہ ان کے بغیر عملی دشواریوں پر قابو پایا نہیں جا سکا ہے۔

رُوسی زبان کے ساتھ غیر رُوسی زبانوں کے محدود استعمال کی اجازت سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ غیر رُوسی زبان بولنے والے رنگروٹ فوجی ہُنرمندی میں رُوسی بولنے والوں سے کمتر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اب سرکاری فوجی جریدوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہونے لگے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ اگر سپاہی غیر رُوسی زبان استعمال کرتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

"وُائیونی واشنیک" رُوسی زبان کا ایک جریدہ ہے جس کا منشور یہ ہے کہ رُوسی زبان کو بین الاقوامی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس جریدے کی اشاعت نمبر ۲ (۱۹۸۴ء) میں درجِ ذیل الفاظ شائع ہوئے ہیں:

> "اس طرح سے ہم کسی طور پر بھی اُن لوگوں کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتے جو اپنی نسلی اور مقامی زبانوں کی برتری کے لیے کوشاں ہیں۔ فارغ اوقات میں بیشتر سپاہی اپنی مقامی اور نسلی زبانوں ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔"

سرکاری سطح پر اب نسلی اور قومی زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے: تاہم برتری اور فوقیت رُوسی زبان ہی کو حاصل ہے۔ اور اس کو پڑھنے اور سیکھنے کے لیے ہر طرح کی ترغیب سرکاری سطح پر دی جاتی ہے۔

❦

دراصل یہ ایک طویل المیعاد منصوبے کا ایک حصّہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ رُوسی حکمران رُوسی زبان ہی رائج کرنا چاہتے ہیں اور نسلی اور مقامی زبانوں کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ رُوسی زبان کے فروغ اور اُس کو غیر رُوسیوں پر ٹھونسنے کا عمل اگر کامیاب رہا تو اس میں کسی شُبہے کی گنجائش نہیں کہ رُوسی حکمران آنے والے دَور میں غیر رُوسی زبان کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ اس کی زد مسلم قومیّتوں اور اُن کی زبانوں پر سب سے زیادہ پڑے گی۔

اس وقت قومیتوں کے بارے میں رُوسی حکمرانوں کی سٹریٹیجی یہ ہے کہ فوج میں زیادہ سے زیادہ افسر مسلم قومیتوں سے حاصل کیے جائیں۔ یہ پالیسی کسی وجہ سے تبدیل بھی ہو جائے تب بھی مسلمان اکیسویں صدی میں خود بخود اپنے لیے جگہ بنانے پر قادر ہو جائیں گے۔

اس موقع پر یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ غیر سلاف اور غیر رُوسی قومیّتوں کی فوج میں نمائندگی کا تناسب کیا ہے۔ اب تک جو شواہد اور ثبوت حاصل ہوئے ہیں اُن سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ سلاف اور رُوسی افسر فوج پر چھائے ہوئے ہیں۔ مغربی مبصروں کا اندازہ ہے کہ غیر سلاف قومیتوں کے رنگروٹوں کی تعداد رُوسی فوج میں ۳۵ فیصد ہے اس میں دو تہائی حصّہ مسلمانوں پر مشتمل ہے؛ تاہم جُملہ غیر رُوسی قومیتوں کے افسروں کی شرح صرف دس فیصد ہے۔ سی آئی اے ڈائریکٹری آف یو ایس ایس آر منسٹری آف ڈیفنس اینڈ آرمڈ فورسز آفیشلز، مطبوعہ واشنگٹن ۱۹۸۳ء کے مطابق رُوسی فوج کے سینئر افسر جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں، سب کے سب رُوسی اور سلاف نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فوج میں مسلمان افسروں کی تعداد کم ہونے کی بُنیادی وجہ یہ ہے کہ ماسکو کے حکمران مسلمانوں کی سیاسی وفاداری کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور وجوہات بھی ہیں جن میں سے ایک کا ذکر قومیتوں

کے لسانی مسئلے کے حوالے سے اُوپر خاصی تفصیل سے آچکا ہے۔

مسائل کا ایک لمبا سلسلہ ہے جس کے حوالے سے حقائق کا سُراغ مل سکتا ہے۔ ماسکو کے تمام تر وعدوں کے باوجود اقتصادی اور دوسرے مادّی ذرائع مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا معیار بلند کرنے کے لیے کبھی پُوری طرح بروئے کار نہیں لائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج میں مسلمان افسروں کی بدحالی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ مسلمان لڑکوں کو تربیتی اور تعلیمی اداروں میں جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے وہ بے حد ناقص ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق تمام لڑکوں کو ابتدائی فوجی تربیت اور تعلیم دی جاتی ہے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کو تجربہ کار اور تعلیم یافتہ اُستاد فراہم نہیں کیے جاتے۔ یُوں جو ابتدائی فوجی تعلیم دی جاتی ہے وہ ناقص رہ جاتی ہے۔ مسلمان علاقوں کی تربیتی ضرورتیں اور سہولتیں نظر انداز کی جاتی رہی ہیں۔ "یوش لینن چی" شمارہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء اور "ترانیاز ویدا" شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء کے مطابق صرف اُزبکستان کے دو سو پندرہ اسکولوں میں فوجی تربیت دینے والے اُستاد ۱۹۸۳ء کے تعلیمی سال میں سرے سے موجود ہی نہ تھے؛ چنانچہ بیشتر طالب علموں کو حقیر اور معمولی کاموں کی تربیت دی گئی۔

تربیت یافتہ اُستادوں کی فراہمی کے لیے رُوسی حکمرانوں نے نئی منصوبہ بندی کی ہے اور کئی اقدام کیے ہیں۔ اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ چھوٹے قصبوں کے تربیتی اسکولوں میں فوجی تربیت اور تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جائے کیونکہ وہاں ماہر اُستاد بہت کم ہیں۔ ایک تجویز یہ بھی پیشِ نظر ہے کہ فوجی تربیت دینے والے اُستادوں کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح زیادہ تنخواہ کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ لوگ فوجی تربیت کے اُستاد بننے پر آمادہ ہو جائیں۔ "یوش لینن چی" (۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء) کی رپورٹ کے مطابق مسئلہ صرف تربیت یافتہ ماہر فوجی اُستادوں کا نہیں بلکہ اُن چیزوں کا بھی ہے جو فوجی تربیت کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُستاد عملی تربیت دے نہیں سکتے اور محض نظریاتی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ضروری سامان اور اشیا کی اس کمی کے باوجود اُزبکستان میں ۱۹۸۴ء میں ۸۰۰ نئے اسکول کھولنے کا اعلان ہُوا؛ جبکہ پہلے سے موجود آدھے تعلیمی اداروں میں ضروری تربیتی اشیا موجود نہیں۔

فوجی تربیت اور تعلیم کی راہ میں کچھ اہم رکاوٹیں یہ بھی ہیں کہ تکنیکی موضوعات کی نصابی کتب پُوری طرح میسّر نہیں آتیں۔ ساز و سامان کی کمی اپنی جگہ۔ وہ سرکاری ادارہ مثلاً ڈوساف (DOSAAF) جو بری، فضائی اور بحری افواج کے لیے جوانوں کو تیار کرنے اور تکنیکی، فنّی اور نیم فوجی کھیلوں کے امور میں تعاون اور رہنمائی فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس کی کارکردگی محض نمائشی ہے۔ عملی طور پر اس نوع کے ادارے کچھ نہیں کرتے۔

ایک دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ مسلم ریاستوں میں جسمانی کھیلوں کی تربیت کے لیے سہولتوں کا فقدان ہے اور قصباتی علاقوں میں کھیلوں کے لیے جو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں اُن کا معیار گھٹیا اور پست ہوتا ہے۔ فوج میں مسلمان افسروں کی نمائندگی کے سلسلے میں اگرچہ اس مسئلے کا تعلق محسوس نہیں ہوتا لیکن پست قد، کمزور جسمانی حالت مسلمانوں پر بحیثیتِ مجموعی اثر انداز ہوتی ہے۔ کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کے لیے ناکافی سہولتوں کی وجہ سے مسلم علاقوں کے نوجوان فوجی تربیت کے اداروں میں داخلہ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں یا پھر اُنہیں اداروں سے نکال دیا جاتا ہے۔

❦

ان اسباب کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ماسکو کے حکمرانوں نے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں غیر سلاف افسروں پر مشتمل فوجی دستوں کی تشکیل میں اپنے روایتی تساہل کا مظاہرہ کیوں کیا؛ تاہم یہ دکھائی

اساتذہ کی شدید قلت سے بہت نقصان پہنچا۔ ازبکستان میں ۱۹۸۳ء کے آخر تک دو اسکول کھلنے والے تھے۔ ان میں تاخیر ہو گئی۔ تاشقند میں تو وقت پر کام شروع کر دیا لیکن سمرقند میں ایک اسکول کھولنے کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا اُس پر عمل نہ ہو سکا اور جو اسکول تاشقند میں قائم ہُوا اُسے بھی نوجوان کمونسٹ لیگ کے فرسٹ سیکرٹری کے بیان کے مطابق شدید سرکاری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔"

وسطی ایشیا میں غیر رُوسی قومیّتوں کے لیے ابتدائی فوجی تربیتی ادارے قائم کرنے کا تجربہ یُوں تو نیا تھا لیکن یہی تجربہ پہلے بعض دُوسری ریاستوں میں کیا جا چکا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں آذربائیجان میں ایک ایسا ہی ادارہ قائم ہُوا۔ جارجیا میں تین سال بعد ایک تربیتی اسکول کھولا گیا۔ اس سلسلے میں جو مواد ملتا ہے، اُس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں دہائی میں یہاں سے اکادمی کے داخلے کے لیے جو طلبہ تیار ہُوئے وہ تناسب کے اعتبار سے کم تھے۔ جب کمونسٹ پارٹی نے غیر رُوسی قومیّتوں پر مشتمل اداروں میں داخلے کی مُہم کو فعّال بنایا تو بہتر نتائج سامنے آئے۔ آذربائیجان کے ایک اسکول میں داخلے کی ابتدائی جماعت میں ۱۳۰ طلبہ موجود تھے جو دو ہی سال میں بڑھ کر ۲۰۰ ہو گئے۔

یہ سوال اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایسے بورڈنگ اسکول وسطی ایشیا کے مقابلے میں آذربائیجان اور جارجیا میں اتنا پہلے کیوں قائم کیے گئے تھے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ایسے اسکول ماسکو کی تائید کے بغیر کھولے نہیں جا سکتے تھے؛ تاہم اس میں شک نہیں کہ مقامی سیاسی قیادت نے ان کے اجرا میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آذربائیجان میں جو اسکول قائم ہُوا اس میں آذربائیجان کی کمونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری قادر علیف کی کوششوں کا بڑا دخل تھا جو ایسے تربیتی اداروں کے قیام کا پُرجوش حامی تھا۔

اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ آخر آذربائیجان کے فرسٹ سیکرٹری علیف کو یہ خیال کیوں سُوجھا کہ اُس کی قومیّت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو فوجی تربیتی اداروں میں داخلہ لینا چاہیے اور اس کے لیے علاقے میں تربیتی اداروں کا قیام ناگزیر ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ فرسٹ سیکرٹری علیف نے آنے والے دَور کے ساتھ ساتھ آذربائیجان کی موجودہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ آذربائیجان میں اہم بااثر عہدوں پر سلاف اور رُوسی قابض تھے؛ حالانکہ بیشتر عُہدے مقامی آذربائیجانی باشندوں کے لیے مخصوص تھے۔ علیف نے منصوبہ بنایا کہ ان عُہدوں پر آذربائیجانی افراد ہی فائز ہونے چاہییں اور اُنہیں سوویت رُوس کی قومی سطح تک بھی جانا چاہیے؛ چنانچہ اُس نے اس منصوبے کا آغاز کیا اور اُس کی تکمیل کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ خود علیف نے آذربائیجان کے فرسٹ سیکرٹری کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے سوویت یونین کے وزرا کی کونسل میں فرسٹ ڈپٹی وزیرِ اعظم کا عہدہ بھی حاصل کیا جو اُس کی اپنی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

آذربائیجان کو وسطی ایشیا کی ریاستوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ سب سے پہلے آذربائیجانی افراد نے ریاست کے اُن اہم اقتصادی اور تعلیمی عہدوں پر اپنے آپ کو فائز کیا جن پر پہلے سلاف اور رُوسی عہدے داروں کا تسلط تھا۔ آذربائیجان کی مثال سے دوسری مسلم قومیّتوں اور ریاستوں نے بہت کچھ سیکھا اور اُس کی تقلید کی۔

بورڈنگ اسکولوں کے علاوہ کچھ اور دُوسرے ادارے بھی مُتعارف کرائے گئے کہ مسلم نوجوان بہتر کیڈٹ بننے کی تیاری کر سکیں۔ اس نوعیت کا ایک ادارہ نوجوانوں کے لیے فوجی کھیلوں کا اسکول ہے۔ ایسا مُلٹری سپورٹ اسکول تاشقند میں جنرل فورسز کی ہائی کمانڈ اکادمی میں پہلے سے کام کر رہا تھا۔ اس کا مقصد نوجوانوں کو ابتدائی طور پر فوجی ذمّے داریوں کا اندازہ اور تعارف کرانا اور ان کو فوجی زندگی کی ابتدائی اور بنیادی تربیت دینا تھی۔ ایسے اداروں کا ایک جال سا بچھا دیا گیا ہے جنہیں

مستقبل کے افسروں کی تعلیم گاہوں کا نام دیا گیا ہے۔ تاجکستان کے دارالحکومت میں ایسے بیس ادارے ۱۹۸۳ء میں کام کر رہے تھے۔ تین سو سے زیادہ قازق ریاست میں موجود تھے۔ شہروں میں قائم شُدہ اداروں نے فوجی اکادمی میں داخلے کے امتحانوں میں نوجوانوں کو کامیاب کرانے میں نمایاں کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ 'ڈیفنس سرکلز' اور کلبیں قائم کی گئی ہیں تاکہ عام تعلیم کے حصُول کے بعد نوجوان ان اداروں کے ذریعے اپنے آپ کو فوجی تربیت اور فوجی اکادمی میں داخلے کے لیے تیار کر سکیں۔ اسی طرح 'ملٹری سپورٹ اینڈ ہیلتھ' کے نام سے بھی ادارے تشکیل پا رہے ہیں۔ رُوسی حکمرانوں نے اس شعبے میں مزید منصوبے تیار کر رکھے ہیں جن پر ابھی عمل درآمد شروع نہیں ہُوا۔ ان تمام پروگراموں، اداروں اور منصوبوں کا ایک ہی مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ مُسلم قومیّتوں کے نوجوانوں کو فوجی کیریئر کے لیے تیار کیا جا سکے۔ مُسلم قومیّتوں کی ریاستوں میں دُور اُفتادہ دیہات میں بھی ایسے اداروں کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلم قومیّتوں کی مقامی زبانوں کے مقابلے میں رُوسی زبان کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس منصوبے کا محرک کرغیزیا کی کمونسٹ پارٹی کا فرسٹ سیکرٹری اوسوبالیف ہے جس کا خیال ہے کہ ایسے معاون اسکولوں میں تیاری کرنے والے دیہاتی جوانوں کو ریاست کے صدر مقام پر بورڈنگ اسکولوں میں داخلہ دیا جائے گا۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اوسوبالیف کی تجویز پر عمل شروع ہو سکا ہے یا نہیں۔ اُس نے یہ تجویز اگست ۱۹۸۴ء میں پیش کی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرح دُور افتادہ دیہاتوں کے جوانوں کی بڑی تعداد فوجی تربیت حاصل کر سکے گی، کیونکہ اب تک صرف شہروں میں رہنے والے مُسلم نوجوان ہی اس میدان میں آگے آئے ہیں؛ تاہم یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اوسوبالیف کی تجویز پر عملدرآمد شروع ہُوا تو اس راہ میں بہت سی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ نصابی کتب کی کمی، سامان اور آلات اور تربیت یافتہ اُستادوں کے فقدان کی باتیں سامنے آ چکی ہیں۔

ان تمام منصوبوں کی کامیابی کا دارومدار مسلم نوجوانوں پر ہے کہ وہ فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ ماسکو کے حکمران تو اس پیشکش کو پُرکشش بنانے کے لیے کئی طریقے اور حربے آزما رہے ہیں اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں معاشی اعتبار سے زیادہ کامیاب اور خوشحال ہو سکتے ہیں۔ اپنے ہُنر اور مہارت کے مقابلے میں وہ فوجی اکادمیوں میں داخلے اور فوجی ملازمتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے؛ تاہم یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مُسلمان جو فنّی اور تکنیکی مہارت کے ساتھ رُوسی زبان پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں، اچھے فوجی افسر بن کر خاصی کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں لیکن راستے میں بعض دُشواریاں حائل ہیں۔ اسی لیے فوجی اکادمیوں میں داخلہ لینے کے بجائے مسلمان دوسرے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فوجی ملازمت میں مسلمانوں کے لیے اس لیے بھی کوئی کشش نہیں کہ فوجی افسر بن جانے کی صورت میں اُنہیں اپنی زندگیوں کا بیشتر زمانہ گھر سے دُور رُوسی ثقافت اور لسانی ماحول میں بسر کرنا پڑے گا۔ بیشتر مُسلمانوں کا خیال ہے کہ رُوسی اُن کے ساتھ مخلص نہیں بلکہ اپنے مقاصد کے لیے اُن کی سرپرستی کر رہے ہیں؛ حالانکہ وہ اُن کے تمدن اور اُن کے طرزِ حیات کا احترام نہیں کرتے۔ مسلمان یہ جانتے ہیں کہ جو مسلمان رُوسی فوج میں ہیں اُن کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔

ایسے تصوّرات پر قابو پانے کے لیے رُوسی حکومت نے کئی طریقے اختیار کیے ہیں۔ وہ مسلمان کیڈٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اعلیٰ سطح پر اکادمیوں میں زیرِ تربیت مسلم طلبہ کی ملاقاتیں عام مسلم جوانوں اور ابتدائی مراحل میں تربیت اور تعلیم حاصل کرنے والوں سے کرائی جاتی ہیں۔ کیڈٹوں کو اپنے علاقوں اور گھروں میں فوجی زندگی کے مثبت پہلوؤں پر گفتگو

قابلِ مطالعہ مطبوعات

ہمہ یاراں دوزخ ـــــ صدیق سالک ـــــ ۳۶/-
آزادی کے چراغ ـــــ مشکور حسین یاد ـــــ ۱۰/-
ستارے چھپاتے ہیں ـــــ " " ـــــ ۱۶/-
اجنبی اپنے دیس میں ـــــ شوکت علی شاہ ـــــ ۵۵/-
ذکرِ علی گڑھ ـــــ عبدالمجید قریشی ـــــ ۲۵/-
فیصل پاسبانِ حرم ـــــ محمد صدیق قریشی ـــــ ۱۶/-
اولادِ آدم ـــــ پروفیسر محمد منوّر ـــــ ۱۲/-
دیکھ لیا ایران ـــــ افضل علوی ـــــ ۳۰/-
سات سمندر پار ـــــ بیگم اختر ریاض الدین ـــــ ۱۸/-
آنریری خسر ـــــ سیّد ضمیر جعفری ـــــ ۵/-
گستاخی معاف ـــــ مظفر بخاری ـــــ ۱۲/-
تنہا ـــــ سلمیٰ اعوان ـــــ ۲۵/-
لہو کی منڈی ـــــ ابنِ آدم ـــــ ۸/-
امنِ عالم اور اسلام ـــــ سیّد قطب شہید ـــــ ۲۰/-
ڈکٹیٹر کون ـــــ ایس ایم ظفر ـــــ ۱۸/-
اسرائیل اور بھارت کے خفیہ تعلقات ـــــ محمد حامد ـــــ ۱۲/-
جہنّم سے فرار ـــــ مقبول جہانگیر ـــــ ۲۰/-
موت کے خطوط ـــــ " ـــــ ۲۰/-
حیرت انگیز کہانیاں ـــــ ادارہ ـــــ ۱۵/-
دُنیا کی عظیم کتابیں ـــــ " ـــــ ۱۶/-
سمرقند و بخارا کی خونیں سرگزشت ـــــ اعظم ہاشمی ـــــ ۶/۵۰
بارِ سفر ـــــ باقی صدیقی مرحوم ـــــ ۱۲/-
بازارِ صدا ـــــ شباب کیرانوی مرحوم ـــــ ۲۵/-
دبستان ـــــ کوثر حمید ـــــ ۱۵/-

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ
سمن آباد، لاہور ۲۵

کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ خیوہ میں واقع ملٹری اکادمی کے طالب علموں کو اُن کے گھر۔ تاجکستان بھیجا گیا جہاں زیرِ تربیت کیڈٹوں نے ریاست کے اسکولوں میں زیرِ تعلیم طالب علموں کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اُنہیں اکادمی میں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ معیار کے اعتبار سے گھر کے کھانے جیسا ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اُنہیں باقاعدہ جیب خرچ دیا جاتا ہے۔ اُن کو کپڑے مفت ملتے ہیں۔ موسمِ گرما کی تعطیلات میں گھر سرکاری خرچ پر بھیجا جاتا ہے۔ حکومت نے اپنی پروپیگنڈہ مُہم کو مؤثر بنانے کے لیے ایسی فلمیں بھی بنائی ہیں جن میں مقامی لوگوں کو اکادمیوں میں شاندار انداز میں فوجی تربیت حاصل کرتے دکھایا گیا ہے۔

نوجوانوں کی کمونسٹ لیگ 'کوموسول' کے جریدوں میں نوجوان مسلمانوں کو بطورِ خاص فوجی افسر بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اسے شاندار، حبّ الوطنی سے بھرپور' ملازمت قرار دیا جاتا ہے۔ اخبارات میں اداریوں کے ذریعے پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے۔

رُوسی حکمرانوں نے فوجی زندگی کے رُومانوی پہلوؤں سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ رُوسی خانہ جنگی کے نامور ہیرو اور جنگجوؤں کی ملاقاتیں نوجوان مسلم طالب علموں اور کیڈٹوں سے کرائی جاتی ہیں۔ دُوسری جنگِ عظیم کے نامور ہیروز سے بھی اُن کو ملوایا جاتا ہے لیکن نئی نسل کے نوجوانوں نے ان پُرانے ہیروز کے بارے میں اچھا تاثر نہیں لیا، کیونکہ اُنہیں قدامت پسند سمجھتے ہیں؛ بہرحال رُوسی حکومت ہر انداز سے مسلم نوجوانوں کو ترغیب دینے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے اور بعض اوقات وہ مضحکہ خیز غلطیاں بھی کر بیٹھتی ہے۔ یکم جون ۱۹۸۴ء کے 'تاجکستانیہ' اور نوجوانوں کی کمونسٹ لیگ کے کئی جریدوں میں ایک تصویر خاص اہتمام سے شائع کی گئی۔ اس تصویر میں ماسکو ملٹری اکادمی کے دو کیڈٹ دکھائے گئے تھے جو کمر تک ننگے تھے اور وہ اپنے جسموں پر برف مل رہے

تھے۔ اس تصویر کے ساتھ جو سُرخی دی گئی تھی اُس کے الفاظ یہ تھے:

"صبح کے وقت برف سے غسل کرنا بہت اچھا ہوتا ہے۔"

ماسکو کے حکمرانوں کو اس حقیقت کا پُورا شعور حاصل ہے کہ رُوس کی مسلم سوسائٹی میں بچّے اور نوجوان اپنے والدین کا بے حد احترام کرتے ہیں؛ چنانچہ پروپیگنڈے کی ایک ایسی ہی مُہم کا آغاز ہُوا جس کا مقصد والدین اور کنبوں کے سربراہوں کو رام کر لینا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو فوجی اکادمیوں میں داخلے کی ترغیب دیں۔ ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء کے 'پراودا' میں ایک اہم سیاسی لیڈر نے براہِ راست والدین سے اپیل کی:

"اپنے بچّوں کو فوجی افسر بنانے کے لیے بچپن ہی سے اُن کی تربیت کا آغاز کریں۔"

ایسی خبروں اور کہانیوں کی بطورِ خاص پبلسٹی کی جاتی ہے جن میں فوجی افسروں کے شاندار مستقبل کی تصویر کشی اچھے انداز میں کی گئی ہو۔

'کوموسومول اُزبکستانیہ' (۱۰ اگست ۱۹۸۳ء) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک خاندان اپنے بیٹے کے فوجی اکادمی میں داخلے کے معاملے میں ہچکچاہٹ اور سردمہری سے کام لے رہا تھا لیکن بعد میں اُنہیں اپنے اس رویّے پر پشیمانی ہُوئی۔ اخبارات میں عموماً ایسے گھرانوں کے بارے میں فیچر شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے کئی بیٹے بڑی خوشی سے فوجی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

اسکولوں کی انتظامیہ اور اُستادوں کو یہ لازمی ذمّے داری سونپی گئی ہے کہ وہ اکادمی میں داخلے کے لیے مناسب اُمیدوار تلاش کرتے رہیں اور تیاری میں اُن کی رہنمائی کریں۔ غیر رُوسی زبانوں کے اساتذہ پر اس نئی ذمّے داری سے بڑا بوجھ پڑ گیا ہے۔

مسلمانوں کے فوجی اکادمیوں میں داخلے کی مُہم ۱۹۸۴ء

کے نتائج پُوری طرح دستیاب نہیں؛ تاہم اس ضمن میں یہ قوی اُمید تھی کہ ۱۹۸۳ء کے مقابلے میں یہ نتائج بہتر ہوں گے۔

ماسکو کے حکمرانوں کو اس حقیقت کا بھی پُورا علم ہے کہ مسلمان اب تک خالص رُوسی معاشرے کا حصّہ نہیں بن سکے اور اُن کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے اب اُنھیں صرف فوج کی تعمیراتی یُونٹوں ہی میں کھپایا نہیں جا سکتا بلکہ دوسری یُونٹوں میں بھی انہیں اہم فرائض داریاں سونپنا ضروری ہو گیا ہے، دوسری طرف یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ سلاف رُوسی اکثریت کی یُونٹوں میں مسلمانوں کو جلد ہی یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ اقلیت میں ہیں اور فوج میں زیادہ اور بہتر مواقع حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ شعور اور بھی پختہ ہوتا جائے گا۔ رُوسی قیادت کا خیال ہے کہ فوجی افسروں کے باہمی میل جول اور روابط سے سلاف اور مسلمانوں کے نسلی اختلافات میں کمی واقع ہو گی اور سماجی سطح پر اس کے اثرات خوشگوار اور ظہور پذیر ہُوں گے۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد بالشویکوں نے اپنے ابتدائی دَورِ حکومت میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ قومی امتیازات تیزی سے غیر اہم ہوتے جا رہے ہیں اور جلد ہی یہ سب سے معدوم ہو جائیں گے۔ تقریباً ستر برس بعد بھی رُوسی قیادت یہی اصرار کر رہی ہے کہ قومیّتوں کو رُوسی معاشرے اور سماج میں مدغم ہو جانا چاہیے لیکن یہ مرحلہ مستقبل بعید میں بھی شاید نہ آ سکے، اس لیے وہ اب یہ پالیسی اپنانے لگے ہیں کہ مختلف قومیّتوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لایا جائے۔

رُوسی قیادت اپنی موجودہ پالیسی کے تحت مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش میں مصروف ہے کہ وہ اپنی ممتاز نسلی شناخت قائم رکھتے ہُوئے بھی محبِ وطن رُوسی شہری ہو سکتے ہیں۔ آنے والی دہائیوں میں جہاں اس پالیسی میں مزید توسیع کی ضرورت محسوس ہو گی وہاں غیر رُوسی قومیّتوں کے بڑھتے ہُوئے مُمکنہ تقاضے بھی پُورے کرنا ہوں گے اور یہ صُورتِ حال ایک نئے چیلنج کو جنم دے گی۔

مستقل خریدار

توجّہ دیں

- خط کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔
- بدلِ اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔
- تبدیلیٔ پتہ کی اِطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیں۔
- اُردو ڈائجسٹ کا بدل اشتراک کسی ذاتی نام کے بجائے اُردو ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام روانہ کریں۔

(ادارہ)

دفتر ایگزیکٹو انجینئر

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن، خوشاب

شارٹ ٹنڈر نوٹس

زیرِ دستخطی کو مندرجہ ذیل کاموں کے لیے اپنے دفتر واقع خوشاب میں پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ اُن ٹھیکداروں / فرمز سے جو اپنے ناموں کا اندراج / تجدید کرا چکے ہوں اور رواں مالی سال کے لیے مطلوبہ اندراج / تجدیدی فیس بھی جمع کر چکے ہوں۔ سربمہر فیصد / آئٹم ریٹ ٹنڈرز مطلوب ہیں۔

ٹنڈر فارمز ۸۵ - ۶ - ۶ کو ۰۰ - ۱۱ بجے قبل دوپہر وصول کیے اور موجود رہنے کے خواہشمند ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے۔ ٹنڈر دستاویزات دی گئی تاریخوں کو دفتر ہٰذا کے ڈویژنل ہیڈ کلرک سے قواعد کے مطابق فیس ادا کر کے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

زرِ بیعانہ شیڈول بنک کے ڈیپازٹ ایٹ کال بنام ایگزیکٹو انجینئر پی ایچ ای خوشاب، ہر ٹنڈر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ورنہ ٹنڈر پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ٹھیکیدار / فرمز ٹنڈر فارمز کے اجراء کے وقت رواں مالی سال کے لیے اندراج / تجدید کی چھٹی ہمراہ لائیں اور اندراج / تجدیدی فیس داخل کرانے کی اصل سرکاری رسید بھی پیش کریں، ان کے بغیر ٹنڈر کے کاغذات جاری نہیں کیے جائیں گے۔

زیرِ دستخطی کسی ایک یا تمام ٹنڈرز کو بلا اظہارِ وجوہ مسترد کر دینے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

ٹنڈر فارمز صرف اُن ٹھیکیداروں کو جاری کیے جائیں گے جو زیرِ دستخطی کے نام درخواستیں دیں گے اور جن پر سپرنٹنڈنٹ انجینئر، پبلک ہیلتھ انجینئرنگ سرکل سرگودھا غور کر کے انہیں موزوں قرار دیں گے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرِ بیعانہ	میعاد	ٹینڈر کھولنے کی تاریخ
۱	رورل واٹر سپلائی سکیم ڈسٹرکٹ خوشاب ۴" آئی/ڈی کے ۵ء۴ ایم ایم، ایم ایس پائپ فراہم کرنا/بچھانا، جوڑنا، کٹنگ اور ٹیسٹنگ، ۳۰۰۰۰ گیلن گراؤنڈ سٹوریج واٹر ٹینک اور سٹاف کوارٹر کی تعمیر۔	۱،۶۰،۰۰۰/-	۳،۲۰۰/-	۴ ماہ	۵-۶-۸۵
۲	رورل واٹر سپلائی سکیم ڈھوک سانگا I - ۳ عدد گراؤنڈ سٹوریج ٹینکس کی تعمیر۔	۱،۲۰،۰۰۰/-	۲،۴۰۰/-	۴ ماہ	″
	II - ۴" اور ۱/۲ ۲" آئی/ڈی پائپ فراہم کرنا۔ بچھانا، جوڑنا، کٹنگ اور ٹیسٹنگ۔	۳،۱۰،۰۰۰/-	۶،۲۰۰/-	۶ ماہ	″
۳	رورل واٹر سپلائی سکیم پنڈوہیر I ۴ عدد گراؤنڈ سٹوریج ٹینکس کی تعمیر اور جی آئی پائپ ۱/۲ ۱" آئی/ڈی فراہم کرنا/بچھانا۔	۱،۸۰،۰۰۰/-	۳،۶۰۰/-	۶ ماہ	″
	II ۱/۲ ۲" آئی/ڈی، جی آئی پائپ فراہم کرنا/بچھانا۔	۱،۲۵،۰۰۰/-	۲،۵۰۰/-	۴ ماہ	″
۴	رورل واٹر سپلائی سکیم دیول ڈسٹرکٹ خوشاب ۲ عدد گراؤنڈ سٹوریج ٹینکس اور ایک عدد سٹاف کوارٹر کی تعمیر۔	۱،۳۵،۰۰۰/-	۲۷۰۰/-	۴ ماہ	″
۵	رورل واٹر سپلائی سکیم کا دھارکچر گراؤنڈ سٹوریج ٹینکس ۴ عدد کی تعمیر۔	۸۰،۰۰۰/-	۱،۶۰۰/-	۴ ماہ	″

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن۔ خوشاب

آئی پی ایل: ۳۵۹۳

ٹنڈر نوٹس

رواں سال کے لیے تجدید شدہ ہائی ویز ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکیداروں سے مندرجہ ذیل کاموں کے لیے بی - I فارمز پر سربمہر لفافوں میں ٹنڈرز مطلوب ہیں۔

۱۔ سادہ ٹنڈر فارمز زیر دستخطی کے دفتر سے ۲۵ روپے (ناقابلِ واپسی) فی عدد ادا کر کے ۸۵-۶-۱۸ کو دوپہر ۱۲ بجے تک یا اس سے پہلے دفتری اوقات میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ٹنڈر ۱۹۸۵-۶-۱۸ کو دوپہر ۳۰-۱۲ بجے وصول کیے اور اسی دن ۰۰-۱ بجے بعد دوپہر کھولے جائیں گے۔

۲۔ تمام متعلقہ معلومات یعنی ڈرائینگ، تصریحات اور تخمینہ وغیرہ کسی بھی یومِ کار میں دفتری اوقات کے دوران زیر دستخطی کے دفتر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۳۔ کال ڈیپازٹ کے بغیر ٹنڈر جاری کرنے کی درخواست پر کوئی ٹنڈر جاری نہیں کیا جائے گا۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرِ بیعانہ	میعادِ تکمیل
۱	میرپور خاص سندھڑی روڈ میل ۵/۰ تا ۷/۰ کی ری کنڈیشننگ۔	۲۴،۰۰،۰۰۰/-	۴۸،۰۰۰/-	۹ ماہ
۲	کنری جھیل بند روڈ میل ۲/۰ تا ۴/۰ کی تعمیر بشمول میسنری سٹرکچر۔	۲۰،۰۰،۰۰۰/-	۴۰،۰۰۰/-	″
۳	ڈھورو نارو تا عمرکوٹ براستہ جاگیر روڈ میل ۲/۰ تا ۴/۰ سڑک کی تعمیر (بشمول میسنری سٹرکچر)	۲۲،۰۰،۰۰۰/-	۴۴،۰۰۰/-	″
۴	پھلادیون تا پٹھورو براستہ گرھوڑ شریف (گرھوڑ پٹھورو سیکشن) میل ۶/۱۴ تا ۱۲/۰ (بشمول میسنری سٹرکچر) سڑک کی تعمیر۔	۳۰،۰۰،۰۰۰/-	۶۰،۰۰۰/-	″
۵	ایم اینڈ آر، سمارو۔ عمرکوٹ روڈ میل ۰/۰ تا ۱/۰ (ری سرفیسنگ)	۸۰،۰۰۰/-	۱،۶۰۰/-	۱ ماہ
۶	ایم اینڈ آر، میرپور خاص، عمرکوٹ روڈ میل ۱۸/۰ تا ۲۱/۰ (ای/ورک آن برمز)	۱،۰۰،۰۰۰/-	۲،۰۰۰/-	″
۷	″ ″ ″ ″ ″ میل ۳۳/۰ تا ۳۵/۰ ″ ″ ″	۱،۰۰،۰۰۰/-	۲،۰۰۰/-	″
۸	″ ″ ″ ″ ″ میل ۴۰/۰ تا ۴۱/۰ ″ ″ ″	۵۰،۰۰۰/-	۱،۰۰۰/-	″
۹	″ ″ ″ ″ ″ میل ۴۲/۰ تا ۴۳/۰ ″ ″ ″	۵۰،۰۰۰/-	۱،۰۰۰/-	″
۱۰	″ ″ ″ ″ ″ میل ۴۶/۲ تا ۴ (موڑ کو بہتر بنانا)	۸۰،۰۰۰/-	۱،۶۰۰/-	″

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

ہائی وے ڈویژن میرپور خاص

آئی این ایف/کے آر وائی/۲۲۲۸

اشتہار نیلام

برائے حقوق وصولی ٹول ٹیکس از یکم جولائی ۸۵ء تا تیس جون ۸۶ء نیا پل دریا راوی

۱ ۔ مندرجہ بالا ٹھیکے کا نیلام زیر دستخطی کے دفتر واقع میکلوڈ روڈ لاہور میں بوقت ۱۱ بجے قبل از دوپہر ۹ رجون ۱۹۸۵ء کو ہوگا۔

۲ ۔ خواہشمند بولی دینے والوں کے لیے لازم ہے کہ مبلغ ۲ لاکھ اٹھاون ہزار روپے بصورت چالان یا کسی منظور شدہ بنک کی ڈیپازٹ کال زیر دستخطی کے نام جمع شدہ رقم دکھا کر مورخہ ۸ دوران دفتری اوقات ٹنڈر فارم بعوض پانچ صد روپے علحدہ سرکاری رسید پر حاصل کیے جاسکتے ہیں بصورت فرم ٹنڈر حاصل کرنے اور بولی دینے کے لیے نمائندے کے پاس باقاعدہ رجسٹر مختار نامہ اور شراکت کے کاغذات ہونا لازمی ہیں جو کہ بولی سے پیشتر بھی ملاحظہ کے لیے پیش کرنا ہونگے۔ کاغذات کی عدم موجودگی میں نہ تو اس آدمی کو ٹنڈر فروخت کیا جائے گا اور نہ بولی دینے کا مجاز ہوگا۔

۳ ۔ حاصل کیے ٹنڈر فارم مورخہ ۸۵ - ۶ - ۹ کو بولی کے وقت ایک گھنٹہ پیشتر مبلغ چار روپے کے ریونیو کے ٹکٹ لگا کر فارم کے ہر صفحے پر بااختیار بولی دینے والے کو دستخط ثبت کر کے دفتر ہٰذا میں جانچ پڑتال کے لیے جمع کرانا ہوں گے۔ کاغذات کے مکمل نہ کرانے والے اشخاص بولی کے حقدار نہ ہوں گے۔

۴ ۔ مشروط ٹنڈر قبول نہیں ہوگا۔

۵ ۔ جناب چیف انجینئر نارتھ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ لاہور کو حق ہوگا کہ وہ کسی ایک یا تمام ٹنڈروں کو وجہ بتائے بغیر رد کر دیں۔ نیز سب سے زیادہ بولی دینے والے کا نام بھی موصوف کے منظور کرلے پر ٹھیکہ دیا جائے گا۔

۶ ۔ تفصیلی شرائط ٹھیکہ نیلام دفتری اوقات میں زیر دستخطی کے دفتر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

ایگزیکٹو انجینئر

ہائی وے ڈویژن، میکلوڈ روڈ لاہور

آئی پی ایل: ۳۴۵۷

طلبی ٹنڈرز نوٹس

زیر دستخطی کو مندرجہ ذیل کاموں کے لیے بلڈنگز ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ اُن ٹھیکیداروں سے جو سال ۸۵ - ۱۹۸۴ء کے لیے تجدید / اندراج فیس جمع کرا چکے ہوں، یکم جولائی سے مؤثر کمپوزٹ شیڈول آف ریٹس مع سٹینڈنگ ریٹس کمیٹی کی تا تاریخ ترامیم کی بنیاد پر ۸۵ - ۶ - ۹ کو ۰۰ - ۱۱ بجے قبل دوپہر فیصد / آئٹم ریٹ سربمہر ٹنڈرز / پیشکشیں مطلوب ہیں۔ ٹنڈرز مقررہ تاریخ اور وقت پر موجود رہنے کے خواہشمند ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے۔

سادہ ٹنڈر فارمز تمام ایّام کار میں دفتری اوقات کے دوران جاری کیے جائیں گے۔

ہر کام کے لیے علحدہ لفافہ استعمال کیا جائے جس پر کام اور ٹھیکیدار کا نام لکھا ہو۔

زرِبیعانہ کے بغیر ٹنڈر فارمز جاری نہیں کیے جائیں گے۔ زرِبیعانہ لازماً رسید خزانہ یا شیڈول بنک کے ڈیپازٹ ایٹ کال کی شکل میں ہو۔

زیر دستخطی کسی ایک یا تمام ٹنڈرز کو بلا اظہارِ وجوہ مسترد کر دینے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

ٹیلیگرافک / مشروط / مبہم ٹنڈرز پر غور نہیں کیا جائے گا۔

نمبر شمار	کام کا نام	مالیت	زرِبیعانہ	میعاد
۱	سول ہسپتال شاہ پور کو اپ گریڈ کرنا۔ گروپ نمبر III آفیسرز کی رہائش گاہوں کی تعمیر بشمول انٹرنل سروسز (گریڈ ۱۶، ۱۷ اور ۱۸)	۱۳،۹۳،۸۰۰/-	۲۷،۸۷۰/-	۱۲ ماہ
۲	گورنمنٹ احمد حاجی اسماعیل گرلز مڈل سکول ۶۶/ ایس بی کے گرد چار دیواری کی تعمیر۔	۴۱،۶۲۵/-	۸،۳۳۰/-	۲۰ دن
۳	ایس / آر، ڈسٹرکٹ کورٹ سرگودھا۔	۱،۲۰،۸۰۰/-	۲،۴۲۰/-	//
۴	ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال سرگودھا میں ایگزاسٹ فینز کی فراہمی / تنصیب۔	۲۵،۰۰۰/-	۵۰۰/-	//

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

پرونشل بلڈنگز ڈویژن۔ سرگودھا

آئی پی ایل: ۳۵۹۲

پاکستان ریلویز

پیشکشیں مطلوب ہیں

ڈپٹی چیف کنٹرولر آف پرچیز / آر ایم ، کیرج فیکٹری ، پاکستان ریلویز ، ہیڈ کوارٹرز آفس ، لاہور کو مندرجہ ذیل کے ضمن میں ایف او آر کی بنیاد پر پیشکشیں مطلوب ہیں :۔

مُشتہرہ ٹنڈر نمبر : CF / ۴ P / ۶۹۵ / ۸۵
برائے گلیو صمد بانڈ : ۱ آئٹم
تواریخ فروخت : ۱۹۸۵ - ۶ - ۲ تا ۱۹۸۵ - ۶ - ۲۲
ٹنڈر کھلنے کی تاریخ : ۱۹۸۵ - ۶ - ۲۳
ٹنڈر کی قیمت : ۴۰/- روپے (ناقابلِ واپسی)

ٹنڈر فارمز دفتر ڈپٹی چیف کنٹرولر آف پرچیز / آر ایم ، کیرج فیکٹری ، پاکستان ریلویز ، ہیڈ کوارٹرز آفس ، شاہراہِ عبدالحمید بن بادیس ، لاہور کے علاوہ دفتر ڈپٹی چیف کنٹرولر آف سٹورز / انسپکشن / رتّی لائنز ، پاکستان ریلویز ، کراچی کینٹ اور چیف آفیسر / سی ایف ، پاکستان ریلویز ، پاکستان ریلویز اسلام آباد سے تمام ایامِ کار میں حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔

ڈپٹی چیف کنٹرولر آف پرچیز
پاکستان ریلویز
آر/ایم ہیڈ کوارٹرز آفس ، لاہور
(کیرج فیکٹری / پرچیز)

پی آئی ڈی (لاہور) ۵۲۰۴

اَسامیاں خالی ہیں

پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل کے متعدد پراجیکٹس / ریسرچ یونٹوں میں درج ذیل عارضی اسامیوں جن کے غیر معینہ عرصے تک جاری رہنے کا امکان ہے درخواستیں مطلوب ہیں۔

نمبر شمار	اسامیوں کا نام		عمر (سالوں میں)	قابلیت و تجربہ
۱	سینئر سائنٹیفک آفیسر (بی پی ایس ۱۸) ۲۱۰۰ - ۱۵۰ - ۳۶۰۰ (i) اینمل نیوٹریشن (اے ایس آئی) (ii) پلانٹ درد لوجی (iii) ایگرانومی (ڈبلیو بی پی)	اسلام آباد	۴۰ سال	(الف) ایم ایس / ایم ایس سی (آنرز) معہ متعلّقہ شعبے میں فرسٹ ڈویژن معہ تعلیمی کیریئر بشمول ایم ایس سی میں تین (۳) فرسٹ ڈویژن۔ (ب) متعلقہ شعبے میں ۵ سالہ پوسٹ

(باقی اگلے صفحے پر)

(iv) سٹیٹکس سوشیالوجی ڈبلیو بی پی (v) کیمسٹری پی ایل-۴۸۰	اسلام آباد فیصل آباد ٹنڈو جام ترناب کراچی		ایم ایس سی ریسرچ تجربہ معہ بین الاقوامی شہرت کے حامل جریدوں میں تین تحقیقاتی تصانیف۔ یا ایم ایس (غیر ملکی) ایم فل معہ تین سالہ پوسٹ ایم ایس/ایم فل تجربہ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں تین تحقیقاتی تصانیف یا متعلقہ شعبے میں پی ایچ ڈی معہ بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں تحقیقی تصانیف
۲- سینئر سائنٹیفک آفیسر (پاک سوئس پوٹیٹو ڈیویلپمنٹ پراجیکٹ) (بی پی ایس- ۱۸) ۲۱۰۰-۱۵۰-۲۶۰۰ (i) ایس ایس او (پوٹیٹو ڈیویلپمنٹ) پراجیکٹ چلانے میں صوبائی ٹیموں کی رہنمائی اور معاونت کے لیے (ii) ایس ایس او/مارکیٹنگ مارکیٹنگ سٹڈیز (iii) ایگریکلچرل اکنامکس فارمنگ سسٹم ریسرچ۔	اسلام آباد	۴۰ سال	(الف) ایم ایس/ایم ایس سی (آنرز) معہ فصلوں کی (CORP) کی سائنس یا ایگریکلچرل اکنامکس میں فرسٹ ڈویژن معہ تعلیمی کیریئر کے دوران بشمول ایم ایس سی کم از کم دو فرسٹ ڈویژن۔ (ب) ایگریکلچرل ریسرچ ایکسٹنشن اکنامکس یا مارکیٹنگ میں ۵ سالہ پوسٹ ایم ایس سی تجربہ آلو کی پیداوار کا علم رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ یا ایم ایس سی (غیر ملکی) ایم فل معہ پوسٹ ایم ایس/ایم فل ریسرچ ایکسٹنشن یا مارکیٹنگ میں تین سالہ تجربہ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں تین تحقیقاتی تصانیف یا فصلوں کی سائنس میں پی ایچ ڈی معہ بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں تصانیف

(باقی اگلے صفحے پر)

۳ سائنٹیفک آفیسر بی پی ایس ۱۷ (۱۶۰۰ - ۱۲۰ - ۳۰۴۰) پی اے آر سی (مین) (i) ایگرانومی/سٹیٹکس (این ای ڈی) (ii) ایگریکلچرل۔ اکنامکس (پی اے آر سی پلاننگ) (iii) کمپیوٹر سائنس (iv) جنگل بانی (آگی لینڈ وائلڈ لائف/جنگل بانی (v) اینیمل بریڈنگ اور جینٹکس (اے ایس آئی)	اسلام آباد	۳۵ سال	(الف) ایم ایس/ایم ایس سی (آنرز) معہ متعلقہ شعبے میں فرسٹ ڈویژن معہ تعلیمی کیریئر کے دوران بشمول ایم ایس سی دو فرسٹ اور دو سیکنڈ ڈویژن۔ (ب) گزشتہ تحقیقاتی تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔
پراجیکٹ اسامیاں (i) ایگری اکنامکس (اے زیڈ آر آئی کوئٹہ اے ایس آئی) عالمی بنک پراجیکٹ (ii) پلانٹ بریڈنگ اینڈ جینٹکس (فاڈر اینڈ فوریج۔ (iii) ایگرومیٹ (بی اے آر ڈی (iv) پلانٹ درالوجی/پیتھالوجی/ورالوجی) (v) اینیمل نیوٹریشن ورننگ ریسرچ پروگرام این اے آر سی (vi) اینٹومالوجی (پی ایم آر آئی) (vii) بائیوکیمسٹری (عالمی بنک اسلام آباد) (وی پی سی ایل) (viii) کیمسٹری/سائل سائنس، این اے آر سی اسلام آباد، وی پی سی ایس کراچی (ix) ایگرانومی (ایس زیڈ اے آر سی) کراچی۔ اے زیڈ آر آئی کوئٹہ	اسلام آباد کراچی		
۴ سائنٹیفک آفیسر (پراگرس) (بی پی ایس ۱۷) (۱۶۰۰-۱۲۰-۳۰۴۰) اے زیڈ آر آئی کوئٹہ		۳۵ سال	(الف) ایگریکلچرل/بیالوجیکل سائنس میں ایم ایس سی فرسٹ ڈویژن معہ تعلیمی کیریئر میں ۲ فرسٹ ڈویژن اور ۲ سیکنڈ ڈویژن بشمول ایم ایس سی۔ (ب) سابقہ تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔ یا

(باقی اگلے صفحے پر)

اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ایم اے اکنامکس /انگریزی معہ ایگریکلچرل سیکٹر میں پراجیکٹس کی مانیٹرنگ اور تخمینہ کی تیاری، پلاننگ میں ۳ سالہ تجربہ۔

۵ جونیئر سائنٹیفک آفیسر

(بی پی ایس ۱۶) ۱۰۵۰-۸۰-۲۲۵۰)
(ا) بیالوجی (ورالوجی پروگرام)
(ii) فارسٹری، رینج مینجمنٹ وائلڈ لائف
(این آر ڈی)

۴۰ سال — متعلقہ مضمون میں بی ایس سی (کم از کم سیکنڈ کلاس) معہ متعلقہ فیلڈ میں (پانچ سالہ پوسٹ میٹرک کورس) کے لیے کم از کم ۵ سالہ تجربہ اور (چار سالہ پوسٹ میٹرک کورس) کے لیے ۷ سالہ تجربہ۔

۶ ایگزیکٹو انجینئر (سول)

(بی پی ایس ۱۸)
(۲۱۰۰-۱۵۰-۳۶۰۰)

۴۰ سال — الف۔ کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی (انجینئرنگ) یا ایم ایس سی انجینئرنگ یا اس کے مساوی قابلیت معہ تین سالہ تجربہ یا سول انجینئرنگ میں انجینئرنگ کی ڈگری معہ اچھا تعلیمی ریکارڈ نیز کم از کم ۵ سالہ موزوں تجربہ۔ (ب) پاکستان انجینئرنگ کونسل کے ساتھ رجسٹریشن۔

۷۔ اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر (سول)

(بی۔ پی ایس ۱۷)
(۱۶۰۰ - ۱۲۰ - ۳۰۴۰)

۳۵ سال — (الف) سول انجینئرنگ میں انجینئرنگ ڈگری معہ اچھا تعلیمی ریکارڈ یا پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ سے ۳ سالہ ڈپلومہ معہ سول ورکس کی مرمت کا کم از کم ۱۲ سالہ تجربہ۔

۸۔ اسسٹنٹ اسٹور آفیسر

(بی پی ایس ۱۶)
(۱۰۵۰-۸۰-۲۲۵۰)

۳۰ سال — (الف) میٹرک معہ سٹور کیپر / لیبارٹری اسسٹنٹ / سٹاک اسسٹنٹ کی حیثیت سے ۱۵ سالہ تجربہ۔ ایگریکلچرل پراڈکٹس کے سٹور چلانے میں تجربہ رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی یا

(باقی اگلے صفحے پر)

ایف اے معہ متعلقہ فیلڈ میں ۵ سالہ تجربہ (الف میٹرک (ب) سٹور ترجیحاً سائنٹیفک اور ٹیکنیکل ایکوپمنٹ سٹور چلانے کا ۴ سالہ تجربہ۔

۹۔ سٹور کیپر

(بی پی ایس - ۱۰)
(۶۶۰ - ۳۲ - ۱۳۰۰
پی اے آر سی

۲۵ سال — (الف) میٹرک (ب) سٹور ترجیحاً سائنٹیفک اور ٹیکنیکل ایکوپمنٹ سٹور چلانے کا ۴ سالہ تجربہ۔

۱۰۔ سٹینوگرافر (مرد/خواتین)

(بی پی ایس ۱۵)
(۹۰۰ - ۵۵ - ۲۰۰۰)
(پی اے آر سی)

۲۵ سال — الف۔ انٹرمیڈیٹ معہ شارٹ ہینڈ/ٹائپنگ رفتار بالترتیب ۱۰۰/۴۰ الفاظ فی منٹ ہو یا میٹرک معہ بطور سٹینو ٹائپسٹ ۳ سالہ تجربہ معہ شارٹ ہینڈ/ ٹائپنگ رفتار بالترتیب ۱۰۰/۴۰ الفاظ فی منٹ۔

۱۱۔ اسٹینو ٹائپسٹ (بی پی ایس-۱۲)

۷۵۰-۴۰-۱۵۵۰

۲۵ سال — (الف) میٹرک معہ شارٹ ہینڈ /ٹائپنگ بالترتیب ۸۰/۴۰ الفاظ فی منٹ ہو متعلقہ ٹریڈ میں ۴ سال کا مکمل سپشلائزڈ تجربہ۔

۱۲۔ پمپ آپریٹر (بی پی ایس-۵

(۵۲۰ - ۱۸ - ۸۸۰)
فارم مشینری انسٹی ٹیوٹ ترناب، پشاور

۲۵ سال — متعلقہ ٹریڈ میں ۴ سال کا مکمل سپشلائزڈ تجربہ۔

۱۳۔ اسٹور کیپر (بی پی ایس-۱۱

(۷۰۰-۳۵-۱۴۰۰)

۲۵ سال — (الف) بی اے/ بی ایس سی معہ تین سالہ سٹور کا تجربہ یا سائنٹیفک ایکوپمنٹ اور ٹیکنیکل سٹورز کی پروکیورمنٹ کا تجربہ یا سٹور مین کی حیثیت سے ۵ سالہ تجربہ

(باقی ٹنڈر اگلے صفحے پر)

۱۴ ۔ ٹیکنیشن ۔ I (بی پی ایس۔ ۱۱) ۱۴۰۰۔۳۵۔۷۰۰ فارم مشینری انسٹی ٹیوٹ ٹسٹنگ سب سٹیشن کوئٹہ	۲۵ سال	(الف) پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ سے آٹو اور زرعی مشینری میں ڈپلومہ (ترجیحاً فرسٹ کلاس) یا اس کے مساوی یا سپیشلائزڈ ٹریڈ میں (نان ڈپلومہ ہولڈر معہ ٹریڈ میں ۶ سالہ تجربہ)
۱۵ ۔ ٹیکنیشن II (بی پی ایس ۔ ۱۱) ۱۴۰۰ ۔ ۳۵ ۔ ۷۰۰	۲۵ سال	(الف) پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ سے آٹو اور زرعی مشینری میں ڈپلومہ (ترجیحاً فرسٹ کلاس یا اس کے مساوی یا سپیشلائزڈ ٹریڈ میں (نان ڈپلومہ ہولڈر معہ ٹریڈ میں ۶ سالہ تجربہ۔
۱۶ ۔ ٹیکنشن II (بی پی ایس ۔ ۷	۲۵ سال	(الف) میٹرک (ترجیحاً سائنس ہو) معہ سرٹیفکیٹ یا ٹریڈ میں ۲ سالہ ٹریننگ۔
۱۷ ۔ ڈرائیور II ٹریکٹر آپریٹر (بی پی ایس ۔ ۵) (۵۲۰۔۱۸۔۸۸۰)	۲۵ سال	(الف) ہلکی گاڑیاں چلانے کا لائسنس ہولڈر ہو معہ ڈرائیونگ میں کم از کم ایک سال کا تجربہ۔

۲ ۔ براہِ کرم درخواستیں مجوزہ فارموں پر ارسال کریں (صرف بی پی ایس ۔ ۱ اور بالا کے لیے) جو زیرِ دستخطی / ڈائریکٹر آریڈزون ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بریوری روڈ کوئٹہ اور رابطہ آفیسر پی اے آرسی پانچویں منزل ہجیرہ منشن زیب النسا سٹریٹ صدر کراچی سے بعوض کراس پوسٹل آرڈر مالیتی / ۵ روپے دستیاب ہیں۔

۳ ۔ درخواست فارموں کے لیے بذریعہ ڈاک موصول شدہ درخواستیں جن کے ہمراہ کراس پوسٹل آرڈر مالیتی ۵/ روپے بنام ڈائریکٹر (پرسانل ایڈمنسٹریشن)، پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل اسلام آباد اور جوابی لفافہ (۸۰ پیسے صرف) ہوگا زیرِ غور آئیں گی۔

۴ ۔ پہلے سے ملازمت کرنے والے حضرات محکمانہ وساطت سے درخواستیں ارسال کریں۔ ایڈوانس

(باقی ٹنڈر اگلے صفحے پر)

کاپی زیرِ غور نہیں آئے گی۔

۵ ۔ اسامیاں سرکاری ملازمین کے لیے متعلقہ سکیلوں میں دستیاب عمومی الاؤنس کی حامل ہیں۔

۶ ۔ ملازمت کرنے والے اُمیدواران تنخواہ کے سابقہ سکیل میں ملازمت کی مطلوبہ مدت پُوری کر چکے ہوں۔

۷ ۔ علاقائی کوٹہ جیسا کہ وفاقی حکومت کی جانب سے وقتاً فوقتاً جاری کردہ ہدایت کے مطابق ہو گا پیشِ نظر رہے گا۔

۸ ۔ ایک سے زائد اسامی کے لیے درخواستیں دینے کے خواہش مند امیدواران ہر اسامی کے لیے علٰحدہ علٰحدہ درخواستیں ارسال کریں۔

۹ ۔ امیدواران ہر اسامی جس کے لیے وہ درخواست دے رہے ہوں کا نمبر شمار اور نام واضح طور پر لکھیں۔

۱۰ ۔ سٹینو گرافر اور سٹینو ٹائپسٹ کی اسامی کے لیے امیدوار ٹسٹ / انٹرویو کے لیے ذاتی طور پر اپنی درخواستوں / اصل سرٹیفکیٹس وغیرہ کے ہمراہ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء کو پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل ایل ۱۳ المرکز ایف ۷/۲، اسلام آباد میں حاضر ہوں۔ وہ ٹھیک ۹ بجے صبح ڈپٹی ڈائریکٹر (پرسانل ایڈمنسٹریشن پی اے آر سی کے سامنے پیش ہوں۔

۱۱ ۔ درخواستیں جو ہر لحاظ سے مکمل ہوں ۲۰ جون ۸۵ء تک زیرِ دستخطی کے پاس پہنچ جانی چاہییں۔

۱۲ ۔ انٹرویو کے لیے بُلائے گئے امیدواران کو کوئی ٹی اے / ڈی اے نہیں دیا جائے گا۔

۱۳ ۔ امیدوار یا کسی طرف سے کوئی سفارش یا رسائی نا اہلیت تصوّر کی جائے گی اور ایسے امیدواران کو انٹرویو کے لیے نہیں بُلایا جائے گا۔

ڈائریکٹر
(پرسانل ایڈمنسٹریشن)

17/PARC/850

پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل

ایل ۔ ۱۳ ۔ المرکز ایف ۷/۲ پوسٹ بکس ۱۰۳۱ ۔ اسلام آباد

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ

صوبی واشنگ مشین

Soby

ہم ہیں نقیبِ صبحِ نو!

خدائے عزّ وجل کے فضل و کرم سے ہمیں یہ سعادت حاصل ہے کہ ہم پاکستان میں واشنگ مشین کے بانی ہیں اور ربِّ غفور و رحیم نے اب ہمیں یہ عزت بھی بخشی ہے کہ ہم نے جاپان سے درآمد کنندہ آٹومیٹک پلانٹ پر پاکستان کی پہلی واشنگ مشین پلاسٹک پارٹس سے اسمبل کی ہے جو کہ مکمل طور پر شاک پروف ہے اور اس میں حفاظتی اقدامات بین الاقوامی معیار کے مطابق ہیں۔ یہ دیکھنے میں خوبصورت، حجم میں کم، کارکردگی میں پاکستان کی ہر واشنگ مشین سے بہتر اور قیمت میں نہایت ارزاں ہے۔ یہ چار مختلف اور دیدہ زیب رنگوں میں دستیاب ہے۔

بعد از فروخت ایک سال فری سروس

صوبی ہاؤس ہولڈ اپلائنسز لمیٹڈ کالج روڈ ڈسکہ

(فون: ۹۳۳ — ۹۳۴)